قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2019 قیمت 15₹

ماھنامہ

اُردو دُنیَا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

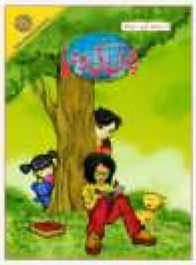

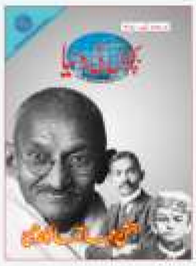

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ہماری بات

قارئینِ اردو دنیا کو یوم جمہوریہ اور نیا سال مبارک!

کلینڈر بدلتا ہے اور ہم نئے سال میں نئے عزائم، نئے جوش، نئی امیدوں اور نئے خوابوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور ہمارے سامنے مستقبل کا ایک لائحہ عمل ہوتا ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ نئے سال میں ماضی کے ادھورے کام نہ صرف پورے کریں بلکہ نئے امکانات اور نئے عنوانات تلاش کرکے اس میں حقیقت کا رنگ بھی بھریں۔ جو نئی تبدیلیاں اور نئے تغیرات ہیں اور جس طرح کے چیلنجز ہیں اس کا مقابلہ کریں۔ ہمارا اگلا پاؤں نئے پانی میں ہو تو اس پانی کی نئی لہروں سے نئی عبارتیں تحریر کریں لیکن ہوتا یہ ہے کہ سال کے آخر تک پہنچتے پہنچتے جب ہم محاسبہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ جس جوش کے ساتھ نئے سال کا سفر شروع کیا تھا اس سفر میں محرومیوں اور اداسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔

دراصل وقت یوں ہی گزر جاتا ہے اور ہم لایعنی مسائل اور مباحث ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور معاشرے کے جو بنیادی مسائل ہیں ان کی طرف ہماری مکمل توجہ نہیں ہو پاتی۔ ہم کوئی نیا مکالمہ نہیں کر پاتے، سماج سے کوئی نیا سمواد نہیں ہو پاتا۔ ہمارے پاس مسائل اور مباحث کی جو پرانی فہرست ہوتی ہے اسی فہرست پر ہم نشانات لگاتے جاتے ہیں۔ ادب اور ثقافت کی نہ نئی فہرست مرتب کی جاتی ہے اور نہ ہی اس تعلق سے کوئی غور و خوض ہوتا ہے۔ زبان کے تعلق سے بھی سرد مہری سی چھائی رہتی ہے۔ ہم وہ علاقے دریافت ہی نہیں کرتے جہاں امکانات کی ایک وسیع تر دنیا ہے، جن علاقوں کو تلاش کرکے ہم اپنی زبان کی جڑیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کرسکتے ہیں، اردو زبان کے نئے قاری پیدا کرسکتے ہیں، اردو زبان کا عالمی زبانوں سے ایک مضبوط رشتہ قائم کرسکتے ہیں، علاقائی زبانوں میں ہم اپنا ادب اور اپنی زبان کے شاہکار پیش کرکے اپنا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرسکتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہم ایک خاص دائرے میں قید ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایک ذہنی حصار ہے جس سے باہر نکلنا ہمیں منظور نہیں جبکہ اردو زبان و ادب کے تعلق سے حالات میں بہت حد تک تبدیلی آئی ہے کہ زبانوں کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں، فاصلے کم ہو رہے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ اردو رسم الخط سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اس سے جڑ رہا ہے اور اردو زبان کی شاعری سے نہ صرف عشق کر رہا ہے بلکہ شعر و شاعری کی وجہ سے اردو زبان سے بھی اپنا تعلق قائم کر رہا ہے۔ یہ اردو کے لیے بہت خوش آئند بات ہے کہ اب نئی نسل اردو زبان کے جادو کو سمجھ رہی ہے، محسوس کر رہی ہے کہ اردو صرف زبان نہیں ایک تہذیب ہے اور یہ ہندوستان کی مٹی کی شناخت ہے۔ اس زبان میں بڑی جاذبیت اور چاشنی ہے۔ اب وہ پرانا تصور رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ وقت اور حالات نے اب اس تصور کو مسترد کردیا ہے۔ ہندوستان کے نوجوانوں کی اکثریت اردو کے کلاسیکی شاعروں میر و غالب کو نہ صرف ہندی رسم الخط میں تلاش کرکے پڑھ رہی ہے بلکہ عصر حاضر کے بہت سے معروف و مقبول شعرا کے کلام کو بھی تلاش کر رہی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اردو زبان و ادب میں بڑی طاقت اور تاثیر ہے اور یہ انسانی جذبات اور ذہن کو اپیل کرنے کی پوری قوت رکھتی ہے۔

نئے سال میں ہمیں فروغ اردو کے نئے امکانات پر غور کرنا ہے، نئے دریچے کھولنے ہیں، نئے علاقوں کی تلاش کرنی ہے اور نئی نسل کو اس زبان سے جوڑنا ہے۔ اسی عزم کے ساتھ اگر ہم نے نئے سال میں سنجیدگی کے ساتھ اردو زبان کی ترقی کے لیے کام کیا تو یقیناً ہمیں کامیابی ملے گی کیونکہ اب راستے میں اتنی دشواریاں نہیں ہیں جتنی ہم سمجھا کرتے تھے۔ بہت سے موانع اور مشکلات دور ہوچکے ہیں اور اردو زبان کے تعلق سے بہت حد تک اس نسل کا ذہن بھی صاف ہوچکا ہے جو براہِ راست اردو زبان سے جڑی ہوئی نہیں ہے اس لیے ہمارے لیے بہتر ہوگا کہ اس نسل کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں اور اردو کا جو پیغامِ محبت، امن و اتحادِ یکجہتی ہے اسے دور دور تک پہنچائیں اور اردو میں حب الوطنی، سیکولرازم و یکجہتی کا جو بیش قیمت سرمایہ ہے اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کریں اور یہ بتائیں کہ اردو ایک جمہوریت پسند سیکولر زبان ہے اور اس نے پورے ہندوستان کو جوڑنے کا ایک بہتر کام کیا ہے اور یہ بھی کہ ہندوستانی سماج کی تعمیر و تشکیل میں اس زبان کا ناقابل فراموش کردار رہا ہے۔

شیخ عقیل احمد

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21، شمارہ:01، جنوری 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

اردو زبان اور مولوی عبدالحق انور ادیب 8

اردو کا ارتقا اور اردو، ہندی کا رشتہ احمد علی جوہر 10

نقد و نگاہ

داغ کی شاعری میں خوف کی جمالیات قمر جمالی 14

فیض یافتگان دیوبند کی تخلیقات میں امن و یکجہتی کے عناصر فاروق اعظم قاسمی 17

اردو کی نئی بستیوں کے کچھ نمائندہ افسانہ نگار محمد رکن الدین 22

سائنسی علوم کے ترجمے اور دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی نگہت امین 27

بچوں کی نظموں میں جدید موضوعات عائشہ ماہین 32

جانے والوں کی یاد آتی ہے

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورتوں کے مسائل محمد اکبر 36

شخصیات

پروفیسر عبدالمغنی منظور احمد 39

اردو طنز و ظرافت کا یوسف گم گشتہ رفیق اشفاق 41

مجری ادب، برطانیہ اور حبیب حیدرآبادی عزیز سہیل 44

ماجد الہ آبادی: شخصیت اور شاعری ندیم احمد 47

نگر نگر اردو

دبستان مرشدآباد سیدہ جعفر رضوی 49

خراج عقیدت

وقار الحسن صدیقی پرویز اشرفی 52

نیا آسمان نئے ستارے

سارا شگفتہ ترنم جبیں 54

ماحولیات

پرندوں کی تعداد پر ماڈی ترقی کے منفی اثرات سعد بن ضیا 56

سماجیات

غیر منظم خوردہ فروش ادارے میں مسلمان خواتین کے مسائل محمد نذر الہدیٰ 58

عالمی ادبیات

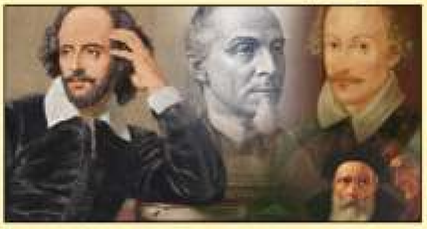

انگریزی ادب کے شاہکار فن پارے ذاکر انعامدار 61

کمپیوٹر

ایم ایس آفس 65

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 69

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ ادارہ 77

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 79

آپ کی بات

'اردو دنیا' نومبر 2018 نظر نواز ہوا۔ اس میں از اوّل تا آخر نئی کروٹ کے آثار ہویدا ہیں۔ اغراض و مقاصد وہی ہیں لیکن ان میں منتخب اہداف کے لیے نئے ترکش اب مستعد ہیں۔ دیکھیں کن کن نشانوں پر یہ تیر پیوست ہوتے ہیں۔ اُردو زبان و اقلیتوں کے لیے وضع کردہ اسکیمات سے متعلقہ عوام کو متعارف کرانا اور بے معنی مباحثوں سے اجتناب خوش آئند مقاصد ہیں۔ مشمولات پر نظر مبذول کی جائے تو ڈاکٹر قطب سرشار سے لیے گئے انٹرویو (ص 7 تا ص 11) میں چند احساسات قابل توجہ ہیں۔ خصوصاً یہ کہ ''.... ترجمہ بھی ایک وجدانی عمل ہے۔ ترجمہ نگار کو تخلیق کار کے انفعال میں خود کو جذب کر لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ ترجمہ ایک سپاٹ بیانیہ سے زیادہ نہیں رہ جاتا۔'' (ص 11) اس کے علاوہ ''شاعری ہو کہ کوئی بھی فن پارہ نہ قدیم ہوتا ہے اور نہ جدید۔'' (ص ایضاً) مضمون 'سوال کی اہمیت......' (ص 12 اور 13) کسی نصابی مضمون کے حوالہ سے پیش کیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ مضمون 'اردو زبان ...اور ...... نیشنل یونیورسٹی' (ص 14 تا ص 17) گو کہ ایک سوونیئر ٹائپ لگتا ہے، پر اس میں اردو زبان اور اردو یونیورسٹی کی کارکردگی کی تفاصیل دی گئی ہیں جن کا مطالعہ داخلہ سے قبل مفید ہو سکتا ہے۔ سری واستو رِند نے 'لالہ مادھو رام جوہر' (ص 18 اور 19) پر بڑا دلنواز مضمون تحریر کیا ہے۔ ان سے شکایت ہے کہ مضمون کی طوالت میں انھوں نے از حد کفایت سے کام لے کر اسے نہایت محدود بنا دیا ہے۔ ان کی پیش کش اتنی دلنشین ہے کہ جی چاہتا ہے کہ پڑھتے ہی چلے جائیں، چنانچہ مضمون کے اختتام پر کئی بار پھر ابتدا کرنی پڑی۔ درحقیقت جوہر صاحب کے اشعار خصوصاً ثانی مصرعے زبان زد خاص و عام ہیں۔ لالہ مادھو رام جوہر کے یہی اشعار اور اُن کی زندگی کے مزید کچھ اور حالات خلیق الزماں نصرت کی کتاب بعنوان 'برمحل اشعار اور ان کے مآخذ' (طباعت سوم 2012) کے ص 143 پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں 'اب جگر تھام کے بیٹھو'، 'تاڑنے والے....'، 'وہ دن ہوا ہوئے.....'، 'بن بلائے خدا کے گھر....' وغیرہ وغیرہ کیا لاجواب کلام ہے۔ دل و دماغ جھوم جاتے ہیں۔ ص 20 تا 22 تک 'ذولسانی ہندو شعرا پر ایک نظر' ڈالی گئی اور خوب ڈالی گئی۔ ص 23 تا

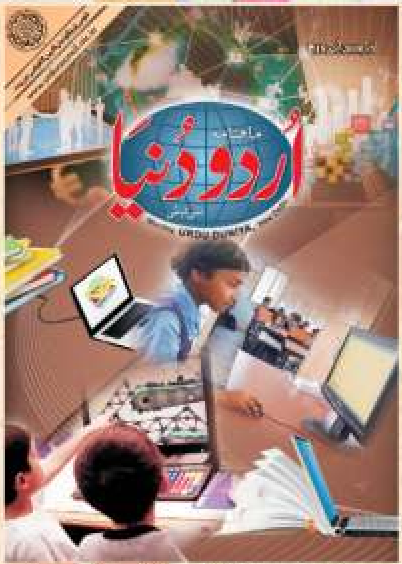

ص 25 تک 'جاں نثار اختر کی طویل نظمیں' کی ابتدا ایک طویل تمہید سے کی گئی ہے۔ آپ جانیں یہ آپ کے لیے کہاں تک اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس مقالہ میں بہرحال یہ خوبی ضرور ہے کہ ہر موضوع کی نظم کے مناسب جز کی مدد سے بخوبی تفہیم کی گئی ہے۔ یا یوں کہیے کہ مصنف نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ صفی لکھنوی (ص 26 تا ص 29) کا ذکر آتے ہی ذہن میں یہ شعر گردش کرنے لگتا ہے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

لائق مصنف نے صفی لکھنوی کے حیات و کارناموں کا ذکر بلحاظ زمانہ بڑے ہی تسلسل اور عمدگی سے کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر متن میں صفی کے منتخب کلام کو مناسبت سے سمو دیا جاتا مگر اس کو آخر میں نمونتاً شامل کیا گیا ہے۔ خیر جیسی توفیق ہو۔ ص 30 تا ص 32 میں 'ڈپٹی نذیر احمد کے مکتب میں سائنس کی تعلیم' پر مضمون شامل ہے۔ ادبی انداز میں سائنس کا بیان گویا لوہے کے چنے چبانا ہے لیکن فاضل مصنف نے مضمون کی شروعات اس عمدگی اور چابکدستی سے کی ہے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ کب سائنس کی ادق اصطلاحات کو ملائم کر کے بیان بھی کر دیا۔ قاری از اوّل تا آخر دلجمعی سے مضمون میں کھویا رہتا ہے اور اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ مقالہ کب شروع ہوا اور کب کا ختم بھی ہو گیا۔ ص 33 تا ص 35 نیّر مسعود کی افسانہ نگاری کا بیان ہے۔ ص 36 اور 37 پر اکبر الہ آبادی کی شاعری کا لطف اٹھائیے۔ ص 38 39 پر اسماعیل میرٹھی کی نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' کو نئے تناظر اور نئی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ص 40 اور 41 پر کرشن چندر کے ادب اطفال پر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ص 42 اور 43 پر مولانا ابوالکلام آزاد کی ہندو۔مسلم اتحاد کے لیے انتھک کوششوں کا متاثر کن تذکرہ ہے جبکہ ص 44 اور 45 پر اقبال کے نثری اسلوب کا بیان ہے کہ وہ سنجیدہ موضوعات کو بھی پرلطف انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ص 46 اور 47 پر یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ ملا واحدی نے علامہ شبلی سے ملاقات کی تھی اور ان سے متاثر بھی تھے۔ ص 48 تا 50 پر منیر شریف کی درگاہوں کی تاریخی اہمیت جتائی گئی ہے۔ ویسے ہی ص 51 تا 54 تک اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے صوفیائے کرام کی حیات و تعلیمات کا مفصل بیان ہے۔ ص 55 تا ص 59 میں گمنام ادبی شخصیتوں کا ذکر ہے۔ ص 60 تا ص 62 پر کیٹس کی نظم 'اوڈ ٹو اے نائٹ انگیل' (Ode to a nightingale) پر توصیفی بحث کی گئی ہے لیکن اس پر مجاز کے حوالہ سے کسی شاعر کا یہ ریمارک کہ ''اردو شاعری میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیے اُٹھا لے گئے'' (ص 60) ناشائستہ لگا۔ کسی پر تنقید کے دوران بھی ادب و تہذیب کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ نہ جانے کیوں مقالہ نگار نے اس شاعر کا نام ظاہر نہیں کیا۔ خیر موسم کی تبدیلی کا لطف آپ ص 63 تا ص 66 تک تفصیل سے اُٹھا سکتے ہیں۔ ص 67 اور 68 پر فلمی نغموں کے حوالے سے ہندوستانی موسیقی پر اچھا مضمون لکھا گیا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں یہ لوگ عظیم موسیقار روشن کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ص 69 اور 70 پر پختون رہنما خان غازی کابلی کے شاعرانہ اور صحافتی اوصاف کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی کا پروقار بیان ہے۔ حسب سابق ص 71 اور 72 پر ایم-ایس آفس کی وضاحت کی گئی ہے، جو ایک قابل قدر مضمون ہے۔ تبصرہ اور تعارف کے ذیل میں کل گیارہ کتابوں پر اچھے تبصرے درج ہیں۔ ص 82 پر عالمی اردو نامہ جبکہ ص 83 سے اخیر تک خبریں ہی خبریں دی گئی ہیں۔ ان میں پہلی خبر قومی اردو کونسل کے نئے ڈائرکٹر کا اس اہم عہدے پر فائز ہونا ،ان کی تعلیمی لیاقت و کارکردگی کا ذکر اور عزم مصمم سے

بھری ان کی تقریر اہم ترین اور نہایت خوشگوار خبر ہے۔ اس طرح یہ شمارہ علم کا خزینہ اور نادر معلومات کا نکہت بھرا تروتازہ گلدستہ ہے کہ معطر فضا میں لطف اُٹھایا جائے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری: روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ڈائرکٹر بنائے جانے پر مبارک باد۔ آپ کی ادارت سے مزین اردو دنیا (نومبر 2018) ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے 'ہماری بات' نے صرف کانوں ہی نہیں بلکہ دل و دماغ سے بھی سرگوشیاں کیں۔ آپ نے بجا طور پر اعتراف کیا کہ کرنے کے لیے بہت سے کام باقی ہیں۔ عالی جناب بحیثیت صحافی یا افسانہ نگار نہیں بلکہ ایک محبِ اردو کی حیثیت سے آپ کو بتاتا چلوں کہ گھٹا ٹوپ اندھیروں کے مقابلہ نئی شمعیں تو آپ کو روشن کرنی ہی ہیں مگر جو شمعیں پہلے سے کونسل نے روشن کر رکھی ہیں ان کی حالت کیا ہے؟ ان میں کیا واقعی اتنی مقدار میں تیل ڈالا جاتا ہے جس کی وہ مستحق ہیں یا اس ایندھن سے اپنے گھروں کو بھی منور کیا جا رہا ہے؟ جناب والا کونسل کی مالی اعانت سے جو سمینار ملک بھر میں منعقد کیے جاتے ہیں کیا واقعی ان سے اردو کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا 'چند اردو والوں کی ترقی ہو رہی ہے؟' ان سوالات پر نہ صرف غور کیا جانا چاہیے بلکہ ایک منظم لائحہ عمل بھی تیار کیا جانا چاہیے کہ 60 ہزار یا ایک لاکھ روپے کی رقم اگر ایک سمینار کے لیے دی گئی تو واقعی اس پر خرچ کتنا کیا گیا؟ جہاں تک ہمیں محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بیشتر ادارے ایسے پروگراموں پر 25 فی صد سے بھی کم رقم خرچ کرتے ہیں۔ جس کی گواہی سمینار کے شرکا کی تعداد دیتی ہے۔ بعض اوقات تو جتنے افراد اسٹیج پر ہوتے ہیں اس سے کچھ کم ہی سامنے نظر آتے ہیں۔ اب آپ آئے ہیں تو توقع ہے کہ منظر نامہ تبدیل ہوگا۔ آپ سے یہ بھی التماس ہے کہ سمینار میں پڑھے جا رہے مقالوں کی بھی جانچ ہو کہ واقعی پڑھا گیا طویل مضمون مقالہ ہے یا 'نقالہ'۔ سمینار کے مقالہ نگاران میں بڑی تعداد اردو کے ڈاکٹر حضرات کی ہوتی ہے جو مختلف کالجوں میں 'خدمات' انجام دے رہے ہیں یا دے چکے ہیں۔ ان میں سے چند مخلص اور معتبر پروفیسروں کو چھوڑ دیجیے تو باقی اردو کے ڈاکٹرس دراصل آج بھی 'مریض' ہی نظر آتے ہیں۔ کیا ان کی تحریر، کیا ان کا تلفظ اور انداز پیشکش۔ ایک دوسرے کی پیٹھ تھپتھپانا اور 'پیوندکاری' کی مہارت ہی ان کی اہم خصوصیت ہوتی ہے۔

آپ کی ایک بات دل کو چھو گئی کہ اردو کو ان علاقوں تک پہنچائیں گے جہاں اردو کا گزر کم کم ہی ہے۔ ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ اس کے لیے ان علاقوں میں بسنے والے اردو کے مخلص سپوتوں کو تلاش کرنا ہوگا اور انھیں استعمال میں لانا ہوگا۔ ویسے یہ مشورے تو سرسری ہیں آپ کے ذہن میں تو یقین ہے کہ ایک پورا خاکہ ہوگا۔ آپ نے اردو کی ترقی کی بات کی ہے جو سیدھے دل میں اترتی ہے مگر کیا یہ کام اتنا آسان ہے؟ ہم نے اکثر سرکاری پروگراموں میں اردو والوں کو مرغ مسلم کھاتے اور اردو کو روکھی سوکھی پر اکتفا کرتے دیکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کو چاہنے والوں میں ایسے سیکڑوں افراد شامل ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے وہ اردو کے لیے بہت کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں مگر اس لیے کر نہیں پاتے کہ اردو والوں کا گروپ ازم اور انفرادی لالچ انھیں محتاط کر دیتی ہے۔ یہاں گزشتہ پانچ برسوں سے جلگاؤں چھوٹے چھوٹے قصبات کی چھٹیوں میں ہم بشمول ڈاکٹر عبد الکریم سالار، رشید قاسمی، قیوم اثر و دیگر خاک چھانتے ہیں۔ مطالعہ بیداری مہم کے تحت بچوں کو بچوں کی دنیا، گل بوٹے، گلشن اطفال اور تعلیمی انقلاب وغیرہ پرچے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ مہاراشٹر کو اب اردو کا خطہ کہا جانے لگا ہے مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے ہزاروں دیہاتوں کے بچے اردو پرچوں کے دیدار سے ہنوز محروم ہیں اور وہ پرچہ ہاتھوں میں ملتے ہی اسے سینے سے لگا لیتے ہیں، چوم لیتے ہیں۔ یہ منظر ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے اور وہ اشکبار بھی ہوئی ہیں۔ بات طویل ہوتی جا رہی ہے اس لیے سمیٹ رہا ہوں۔ اسے اپنی تعریف نہ سمجھیے گا۔ آپ کی تحریر میں موجود اسپارک نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ آخر میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ اردو کے فروغ کے لیے دلالوں کی نہیں بلکہ جیالوں کی ضرورت ہے۔

مشتاق کریمی: 342، شنی پیٹھ، جلگاؤں مہاراشٹر

نومبر کا ماہنامہ 'اردو دنیا' بھر نواز ہوا۔ معنوی اور صوری طور پر یہ ہندوستان کا اعلیٰ ترین رسالہ ہے۔ آپ کے ڈائرکٹر بننے کے بعد آپ کا پہلا اداریہ نہایت فکرانگیز اور وسیع الاطراف ہے۔ اردو کے فروغ اور ترویج و اشاعت پر آپ کے آنے والے اقدامات کا علم ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مشن کو کامیاب کرے۔

اداریہ میں انٹرویوز کے بارے میں آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ انٹرویو میں اردو کے فروغ اور تعلیم کے امکانات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے شہر حیدرآباد کی ایک مشہور و ممتاز شخصیت جناب زاہد علی خاں مدیر اعلیٰ روزنامہ 'سیاست' کی ہے جو نہ صرف مجاہد اردو ہیں بلکہ روزنامہ کے تحت کئی ادارے چلا رہے ہیں۔ روزنامہ 'سیاست' ایک بہت بڑی آرگنائزیشن ہے۔ اس کے زیر اہتمام اب تک ہزاروں مسلم و غیر مسلم لڑکے لڑکیاں اردو دانی امتحانات سے اردو لکھنے پڑھنے میں ماہر ہو چکے ہیں اور کئی کوچنگ سنٹر ہیں جن میں ڈگری کورسس کے علاوہ I.A.S کی بھی کوچنگ دی جاتی ہے اور 'سیاست' کے توسط سے شادیوں کے لیے دوبدو پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں جس میں 70 فیصد رشتے طے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ روزنامہ 'سیاست' کے زیر اہتمام اب تک ہزاروں مسلم لاوارث لاشوں کی تدفین عمل میں لائی جا چکی ہے۔ بہرحال زاہد علی خاں صاحب کی اردو زبان، صحافت کے علاوہ سماجی و ملی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ یہ اگر شمال میں ہوتے تو دس سال پہلے ہی حکومت انھیں پدما بھوشن اعزاز سے نواز چکی ہوتی۔ وہ زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے ذہن میں اردو کے فروغ و ترویج کے لیے کئی اسکیمات ہیں۔ ماہنامہ اردو دنیا کے لیے آپ ان کا انٹرویو لے سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ڈاکٹر م ق سلیم ہیں جن کی کتاب 'آؤ اردو سیکھیں' کے دس گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور انھوں نے راست سو سے زائد لوگوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ آپ نے انعامات پر بھی لکھا ہے کہ حاشیہ پر جو ہیں انھیں نہیں ملتے۔ پیشہ تدریس سے تعلق رکھنے والے ہی انعامات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علیم صبا نویدی کی ادبی سرگرمیاں، ان کی تصنیف و تالیف کردہ کئی کتابیں ہیں انھوں نے چینائی میں اردو کا علم سربلند کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی محقق و ادیب فاروق ارگلی، اردو بک ریویو کے عارف اقبال کولکاتہ اور ف۔س۔ اعجاز وغیرہ ہیں جنھیں اب تک نہ اقبال سمان ملا نہ غالب ایوارڈ نہ کسی اردو اکیڈمی سے بڑا انعام۔

مسعود فاروقی: 22-7-553، پتھر بازار حیدرآباد، تلنگانہ

نومبر 2018 کا شمارہ ہدست ہوا۔ مدیر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اداریے میں اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اردو کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کیا جائے اور اردو کو عوام سے جوڑا جائے اور دیہات کے ادیب و شاعر کی وقعت ہونی چاہیے۔ اردو کا بنیادی کام ٹھوس انداز سے ہونا چاہیے اور مضبوط ہو اردو کو نئی نسل میں عام کیا جائے خاص کر اردو والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو تعطیلات میں 20-15 دن میں اردو سکھائیں آپ کا ایسا عمل اردو کے حق میں بہتر ہوگا یہی نسل اردو کو آئندہ صدیوں میں لے جائے گی۔ نسل نو میں اردو کو عام کرنا چاہیے۔ قطب سرشار کے انٹرویو میں ادبی بصیرت ہے اور ادب

سے متعلق ان کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ سوال کی اہمیت اہم مضمون ہے۔ سوال علم کی کنجی ہے۔ سوال سے نالج اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انجم پروین نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعارف، تاریخ اور شعبوں کی تفصیلات دی ہیں لیکن وہاں کے طلبا کے معیار کے بارے میں بھی لکھنا چاہیے تھا۔ لالہ مادھورام جوہر کے مقبول اور مشہور اشعار جو زبان زد خاص و عام ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صدیقی محی الدین نے جاں نثار اختر کی نظموں کا تجزیہ و تبصرہ پیش کیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے کتب میں سائنس کی تعلیم سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے سائنس کا شعور اجاگر کرنے میں اپنے ناولوں کا سہارا لیا بہت کم لوگوں نے اُس دور میں سائنسی شعور کو تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ انھیں پہلا سائنسی شعور والا ادیب کہہ سکتے ہیں۔ ناموران نومبر کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد پر مضمون ہے ان کے کارناموں اور فکر کو پیش کیا گیا ہے۔

اکتوبر 2018 کا 'اردو دنیا' کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق بھی معنویت سے بھرپور ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کی تصویر شائع ہوئی۔ گاندھی 2 اکتوبر 1869 کو پوربندر میں پیدا ہوئے۔ گاندھی کے عدم تشدد، فلسفہ سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔

ظہیر صدیقی نے سچ کہا ہے کہ انعامات صلاحیت سے نہیں سیاسی سفارشات سے ملتے ہیں۔ اب تک ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ سفارشات سے مستحق کا حق مارا جاتا ہے۔ ریاض احمد نے ادب اطفال کے درسی مسائل پر اچھا مضمون لکھا ہے۔ بچوں کے ادیب بھی کم ہوتے جارہے ہیں۔ سرسید کے پنجاب کے پانچ سفر نئی بات ہے۔ سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور وہاں سے کیا اثر قبول کیا نہیں معلوم۔ نیلوفر حفیظ نے گاندھی کا تصور امن و آشتی پر روشنی ڈالی ہے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

خوشی ہوتی ہے کہ آپ نے 'اردو دنیا' کا معیار برقرار رکھا ہے۔ اتنے اچھے مضامین اور دیدہ زیب تصویریں آپ کے رسالے کی جان ہیں۔ ستمبر کے شمارے میں ورق پر اٹل بہاری واجپئی کی تصویر اور سیاہ ٹائٹل کور اور مختصر عنوان سے گہرا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جنتا سرکار کے دور میں وزیرخارجہ کی حیثیت بین الاقوامی شہرت کے مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے اپنا بلند مقام بنالیا تھا اور جواہر لال نہرو اور اندر کمار گجرال کی صف میں آگئے تھے۔ این ڈی اے سرکار (پہلی) کے دوسرے یوم آزادی پر لال قلعے سے پہلے ساز پر جن گن من اور اس

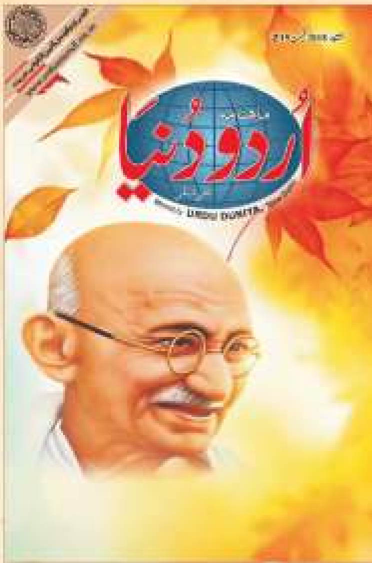

کے بعد سارے جہاں سے اچھا کی دھن بجائی گئی تھی اور اس کے بعد باجپائی جی نے اپنی تقریر شروع کی تھی۔ یوم جمہوریت کی تقریبات کے بعد بی جے پی کا پالیسی ترانہ بڑے جوش و خروش سے گایا گیا۔ 'اسکول چلے ہم' ترانے میں تمام طبقات کی ان کے معاشرتی لباس میں دینی مدارس کی بچیاں فرغل میں خوشی سے اس کو گارہی تھیں اور ایک کشمیرن کشمیر میں اردو اسکرپٹ میں لکھا 'صبح کا ترانہ' پڑھا رہی تھی۔ سچ پوچھو تو محسوس ہوتا تھا کہ ایک نئے عہد کی شروعات ہورہی ہے۔ آپ نے مختصر مگر پرتاثیر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ ابھی پوری طرح پڑھا نہیں ہے۔ مشمولات میں شامل ایک سرخی 'سماجی علوم کی تعلیم و تدریس میں مشاہداتی زاویہ فکر کی اہمیت' از سید اطہر رضا بلگرامی پر نظر ٹھہر گئی اور 'ثانوی درجات کی درسی کتب کا جائزہ' از رضوانہ بیگم۔ دونوں اہم مضامین کا مطالعہ کروں گا اور نتیجہ فکر میں آپ کو شریک کرلوں گا۔

❖ **اخلاق اثر**: بھوپال

ماہ ستمبر کا شمارہ میں نے دیر سے دیکھا۔ اس سے قبل میں بتادوں کہ اپنی ڈیوٹی کے دوران مجھے ملک کے مختلف علاقوں میں جانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ بعض علاقوں میں اردو کی حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کئی رسالوں کا معیار بھی گرتا دیکھ رہا ہوں۔ ایسے میں آپ اردو کی خدمت کررہے ہیں یہ قابل تعریف ہے۔ آپ کا رسالہ ریاستوں کی درسی کتابوں پر نظر رکھے ہوئے ہے یہ ایک اہم بات ہے۔ میں بات کررہا ہوں آپ کے رسالے میں شائع محترمہ رضوانہ بیگم کا مضمون 'ثانوی درجات کی درسی کتب کا جائزہ' کی۔ ان کی اس بہترین کوشش کے لیے میری طرف سے انھیں مبارکباد!

❖ **فیروز علی**: ڈپٹی کمانڈینٹ، II بٹالین، سی آر پی ایف

'اردو دنیا' ستمبر 2018 'ہماری بات' سے متعلق صرف اتنا کہوں گا، اس غزل کے کون سے شعر پر بات کروں، غزل کا صرف ایک شعر نہیں، سرتاپا غزل شاہکار ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے چند مثالیں پیش نہ کروں گا، لفظوں کے مناسب برتنے میں کوتاہی ہوگی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(1) جو زبانیں اپنی داخلی قوت کی بنیاد پر ارتقائی سفر طے کرتی ہیں، وہ کسی ملک اور سرحد کی قید میں نہیں رہتیں۔

(2) اردو زبان کی خوش بختی یہ ہے کہ یہ بھی کسی خاص مقام یا علاقے تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں اردو زبان کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔

(3) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے نہیں بلکہ فنی، فکری اور لسانی قوت کی بنیاد پر بھی پوری دنیا میں الگ پہچان رکھتی ہے۔

محترم مشتاق کریمی کے قاضی مشتاق احمد سے انٹرویو میں مکرمی قاضی مشتاق صاحب کا جواب بہت خوب اور صدفی صد درست ہے۔ (کم از کم میری نظر میں)

''فرانسیسی ادیب ژاں پال سارتر کا قول ہے انعام تو فنکار کے تابوت میں ایک کیل گاڑ دیتا ہے۔ جس وقت اسے نوبل انعام ملنے کا اعلان ہوا وہ ایک ریسٹورنٹ میں ابلا ہوا آلو کھا رہا تھا۔ اس نے اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''اس وقت میری نظر میں اُس آلو کی اہمیت زیادہ ہے جو میں کھا رہا ہوں۔'' بعد میں اس نے یہ انعام لینے سے انکار کردیا۔ اس قول کی روشنی میں ژاں پال کی شخصیت اپنے فن سے انصاف کرنے والے ادیب کی علامت ہے۔ بقول مرزا غالب

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ

محترم جمال اختر کے ذریعے مقالے میں ڈاکٹر گوپال داس نیرج کے درج ذیل اشعار پسند آئے۔

ہم تو مست فقیر ہمارا کوئی نہیں ٹھکانا رے
جیسا اپنا آنا پیارے ویسا اپنا جانا رے
بس یہی اپرادھ میں ہر بار کرتا ہوں
آدمی ہوں آدمی سے پیار کرتا ہوں

مجھے یہ جان کر تعجب ہوا غالب کا تعلق کچھ دنوں کے لیے اترپردیش کے مشہور شہر، سرزمین 'باندہ' سے بھی تھا۔

شمع اختر کاظمی کے مقالے میں، ایک جملہ بے حد پیارا ہے، ہمارے ایک بزرگ نے کہا '' لکھنے کا ہنر اور قلم خدا سب کو عطا نہیں کرتا۔'' بلاشبہ...

❖ **اشفاق کارنجوی**: جی۔ این آزاد اردو ہائی اسکول، مہاراشٹر

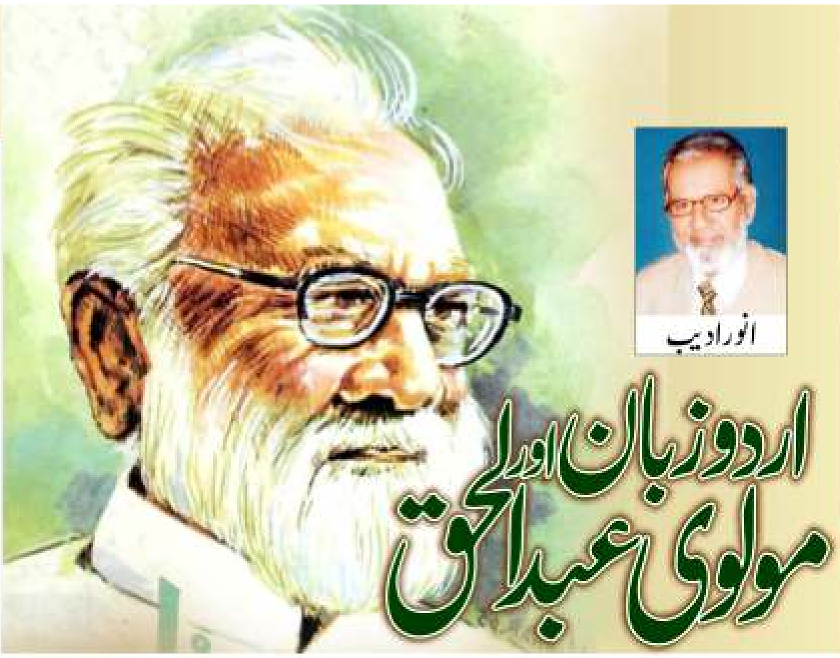

اردو زبان اور مولوی عبدالحق

انور ادیب

اردو کے محسن اعظم مولوی عبدالحق کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ان کے کارناموں کے ذکر سے پہلے ان کی زندگی پر ایک نظر۔

مولوی عبدالحق نے 20/اگست 1870 میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ان کے والد ایک سرکاری ملازم تھے۔ رشوت کی گرم بازاری میں بھی وہ نہایت دیانت دار تھے۔ ان کی والدہ بہت نیک اور عبادت گزار تھیں۔ مولوی عبدالحق کی تعلیم وتربیت پر ان کے والدین کا گہرا اثر تھا۔

مولوی عبدالحق 18/سال کی عمر میں بغرض حصول تعلیم علی گڑھ آئے اور 1895 میں بی۔اے کیا۔ یہاں ان کا قیام تقریباً چھ سال رہا جس میں انھیں سرسید کے علاوہ حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، وحید الدین سلیم جیسے بزرگوں سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ وہ سرسید کے اخلاق وکردار سے بے حد متاثر تھے۔ ان پر سرسید کے طریق کار کا گہرا اثر تھا۔ سرسید جس لگن اور محنت سے اپنا کام کرتے تھے اس سے مولوی عبدالحق جیسے شخص کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری زندگی سرسید کے طریقے پر گزارنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری زندگی جہد مسلسل کی ایک سبق آموز داستان ہے۔ وہ ہمیشہ نامساعد حالات سے نبرد آزما رہے لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ان کے عزم محکم سے رکاوٹیں دور ہوئیں کیونکہ عزم کی آنچ سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں۔ انھوں نے کام کرنے کی لگن اور دھن سرسید سے حاصل کی تھی وہ کبھی مشکل حالات میں گھبرائے نہیں۔ اردو کی ترقی کے سلسلے میں انھیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اردو کی خدمت سے پیچھے نہیں ہٹے۔ ساری زندگی اردو ان کی بھر پور توجہ کا مرکز رہی۔ انھیں اردو سے عشق تھا۔ اردو کے سلسلے میں ان کا عمل محبان اردو کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

مولوی صاحب کو بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ علی گڑھ کے علمی ماحول اور سرسید کی صحبت نے اسے جلا بخشی۔ لیکن ان کے نزدیک کتابوں کا انتخاب ضروری تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مطالعے کا ایک مقصد ہونا چاہیے۔ بے مقصد مطالعہ انسان کو بامعنی مطالعہ سے دور کر دیتا ہے۔ انتخاب کتب کے موضوع پر ان کا ایک مضمون دعوت فکر دیتا ہے۔

مولوی صاحب مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے زبردست حامی تھے۔ ان کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ اردو میں درسی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہی انھوں نے دارالترجمہ کے قیام پر زور دیا۔ اس کے زیر اہتمام بہت سی کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں۔ انگریزی اردو لغت ان کا قابل قدر کارنامہ ہے اس میں مولانا عبداللہ عمادی، سید ہاشم فرید آبادی، مرزا محمد ہادی رسوا، چودھری برکت علی قاضی محمد حسین کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو زبان کی قواعد کا بنیادی کام بھی انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ وضع اصطلاحات کے سلسلے میں قابل تحسین کام ہوا۔ علمی اور تکنیکی اصطلاحات کے لیے مولوی وحید الدین سلیم جو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے سربراہ تھے، نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو دارالترجمہ کی خدمات بے مثال ہیں۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا جو خواب مولوی صاحب نے دیکھا تھا، وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا اگر ان کے رفقاء نے ترجمہ وتالیف کا کام جانفشانی اور عرق ریزی سے انجام نہیں دیا ہوتا۔ اہل اردو ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

مولوی صاحب کو یقین تھا کہ جب تک سارے علوم ابتدائی جماعتوں سے اعلیٰ درجوں تک مادری زبان میں نہ پڑھائے جائیں تعلیم کی کماحقہٗ ترقی نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے جس لگن اور محنت سے کام کیا وہ نہ صرف قابل تحسین بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

مولوی صاحب کے نزدیک اردو کی ترقی کے لیے اردو یونیورسٹی بھی ضروری تھی۔ چنانچہ اس کے قیام کے لیے انھوں نے ایک اسکیم تیار کی۔ اس کے لیے انھوں نے بہت سی یونیورسٹیوں کے قواعد وضوابط اور نصابات حاصل کیے۔ کالج کے لیے انھوں نے ماہرین فن اصحاب کی خدمات حاصل کیں۔ فلسفے کے لیے خلیفہ عبدالحکیم، تاریخ کے لیے ہارون خاں شیروانی، ریاضی کے لیے محمد حسین رہنگر اور اردو کے لیے مولوی وحید الدین سلیم کی خدمات حاصل کی گئیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کو اردو سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بخوبی ہوتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر انصاری کو لکھا تھا۔ یہاں طوالت کے خوف سے ان کے اس خط کا صرف ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے۔ ’’میری زندگی کا مقصد دنیا میں صرف ایک ہی ہے کہ اردو کو ترقی ہو اور وہ ایک علمی زبان بن جائے۔‘‘

اردو کی ترقی وترویج کے لیے انھوں نے انجمن ترقی اردو کو بے حد فعال بنا دیا۔ گرچہ انجمن کا قیام 1903 میں عمل میں آ گیا تھا لیکن اس وقت اس کی حیثیت سرسید کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کی تھی۔ یہ تنظیم سرسید نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے 1890 میں قائم کی تھی (یہ پہلے مسلم ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے جانی جاتی تھی جس کا قیام 1886 میں عمل میں آیا تھا) 1911 میں مولوی عبدالحق اس کے سکریٹری ہوئے۔ اس انجمن کے ذریعہ انھوں نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس کے اعتراف میں قوم نے انھیں ’بابائے اردو‘ کے لقب سے نوازا۔

انجمن کی سرگرمیوں کو بڑھانے اور اردو کی جدو جہد کو تیز کرنے کے لیے مولوی صاحب نے انجمن کو دہلی منتقل کرنا چاہا۔ 1936 میں انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں انجمن کے صدر دفتر کو دہلی منتقل کرنے کی تجویز منظور کر لی گئی۔ چنانچہ 1938 میں دفتر دہلی منتقل ہو گیا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے آئے تاکہ یہاں رہ کر اردو کی خدمات بہتر طور پر کی جاسکے۔ وہ زور وشور سے انجمن کے کام کو فروغ دینے میں لگ گئے لیکن بدقسمتی سے ملک کا فرقہ وارانہ ماحول بگڑنا شروع ہو گیا۔ اردو کی مخالفت میں شدت پیدا ہونے لگی فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ دلی میں انجمن کا دفتر تباہ کر دیا گیا۔ جس میں قیمتی کتابیں اور کاغذات ضائع ہو گئے۔

1947 میں تقسیم ملک کے بعد مولوی صاحب

پاکستان چلے گئے۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں وہ فکر مند تھے۔ کراچی میں انھوں نے اردو کالج قائم کیا۔ اس سلسلے میں انھیں بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں محسوس ہوا کہ پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین نہیں ہے۔ اردو کی ترقی کے سلسلے میں انھیں اپنا سپنہ بکھرتا نظر آیا۔ حکومت پاکستان کا رویہ بھی معاون نہیں تھا۔ انھیں بے حد گھٹن محسوس ہونے لگی لیکن مرنے سے پہلے وہ اردو کے مستقبل کو تابناک دیکھنا چاہتے تھے۔ اردو سے ان کے جذباتی لگاؤ کا اندازہ ان کی اس بات سے ہوتا ہے جس کا ذکر انہوں نے نوے سال کی عمر میں کیا تھا۔

''میں مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک اردو یونیورسٹی قائم نہ کرلوں۔''

لیکن موت کس کا انتظار کرتی ہے۔ 16/اگست 1961 میں 92 سال کی عمر میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے ساتھ اردو کا ایک سنہرا دور ختم ہوگیا۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اردو کے اس عاشق کی چند خوبیوں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ان کے اخلاق و کردار کی عکاسی ہو سکے۔

''لگن اور محنت سے کام عبادت بن جاتا ہے۔''

مولوی صاحب کا یہ قول ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کی طویل زندگی ان کی محنت، لگن اور جوشِ عمل کی سبق آموز داستان ہے۔ وہ نہ خود ہمیشہ مصروف عمل رہے بلکہ دوسروں کو بھی جدوجہد پر ابھارتے رہے۔ ان کا کہنا تھا:

''ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے' نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔''

مولوی صاحب وقت کے بے حد پابند تھے۔ ان کی زندگی میں نظم وضبط (ڈسپلن) کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ وہ دوسروں سے بھی پابندیِ وقت اور نظم وضبط کی امید رکھتے تھے۔ درج ذیل واقعہ سے ان کے اس مزاج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولوی صاحب نے ایک پروگرام میں ریاست حیدرآباد کے صدر اعظم سر اکبر حیدری کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا۔ کسی وجہ سے موصوف وقت مقررہ پر پہنچ نہیں سکے۔ مولوی صاحب نے ان کا انتظار نہیں کیا اور وقت مقررہ پر کھانے کا اعلان کر دیا۔ کچھ دیر بعد حیدری صاحب تشریف لائے اور تاخیر کے لیے معذرت کی۔ یہ تھی مولوی صاحب کی اصول پسندی۔ اس میں کسی قسم کی رعایت کے وہ خلاف تھے۔ اس معاملے میں وہ کسی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

مولوی صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ جس میں مصلحت اندیشی اور ریاکاری کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان کی مہمان نوازی مشہور تھی۔ دوستوں اور شاگردوں کی خاطر تواضع کر کے انھیں بے حد خوشی ہوتی تھی۔ شاگردوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ طالب علموں کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ دوسروں کی مدد کرنا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ اس میں وہ کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے تھے۔ مدد کا طالب کسی بھی مذہب وملت کا ہو، کسی بھی طبقہ سے ہو اس کا تعلق ہو مدد سے محروم نہیں رہتا تھا۔ یہ تھی ان کی فراخ دلی۔ انھیں جب اپنی زندگی کے بیمہ کی خطیر رقم ملی تو انھوں نے اسے انجمن ترقی اردو کے کاموں پر صرف کردی۔ یہ تھی ان کی بے نیازی انھوں نے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بہت سے دورے اور سفر کیے۔ اس سلسلے کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔ بھلا ایسا شخص اردو کے کسی جلسے میں شرکت پر نذرانہ لے سکتا ہے؟ وہ ایسے نذرانے لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ اردو کی ترقی ان کی زندگی کا ایک مشن تھا جس کے لیے انھوں نے بے لوث خدمت کی اور اس سلسلے میں ایثار وقربانی کی زبردست مثال قائم کی۔

مولوی صاحب بے حد خود دار تھے۔ چاپلوسی اور خوشامد سے انھیں نفرت تھی۔ وہ سرسید کے تربیت یافتہ تھے۔ ذیل کا واقعہ ان کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

محکمۂ تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ مولوی صاحب اسکول کے دورے پر تھے۔ افسر موصوف نے طالب علموں کے سامنے ایک استاد کو ڈانٹ دیا۔ مولوی صاحب نے استاد کے عزت نفس (Self respect) کو اپنی آنکھوں کے سامنے مجروح ہوتے دیکھا تو اس قدر خفا ہوئے کہ دورے سے لوٹ آئے۔ اس طرح افسر موصوف کو انھوں نے خودداری کی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

مولوی صاحب انصاف پسند تھے۔ ظلم و زیادتی انھیں سخت ناپسند تھی۔ کسی پر ظلم دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتے تھے۔ مظلوم کی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ان کی دادرسی کے متعدد واقعات مشہور ہیں۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسکول کے چپراسی کو جوتے سے مارا۔ اس نے مولوی صاحب سے ہیڈ ماسٹر کی شکایت کی جس پر انھوں نے ہیڈ ماسٹر کا تبادلہ کر دیا۔

مولوی صاحب ایک عالی ظرف انسان تھے۔ انھوں نے اپنے مفاد کے لیے کبھی دوسرے کا برا نہیں چاہا۔ 1911 کی بات ہے۔ وہ محکمہ تعلیم سے منسلک تھے۔ گووندراؤ کالے محکمۂ تعلیمات میں مہتمم تھے۔ کسی الزام میں انھیں معطل کردیا گیا۔ ان کی جگہ پر مولوی صاحب کا عارضی طور پر تقرر ہوا مولوی صاحب نے اسے مستقل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کالے صاحب پر لگائے گئے الزامات کو بے بنیاد ہونے کا ذکر کرتے رہے۔ ان کی کوشش سے کالے صاحب پھر بحال ہوگئے۔ یہ تھی ان کی عالی ظرفی۔

مولوی صاحب زبردست قوت برداشت کے مالک تھے۔ وہ اپنے غم اور تکلیف میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ہاں اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کر کے خوش ہوتے تھے۔ ان کی زندگی میں کئی واقعات ایسے پیش آئے جس سے ان کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ان کو دوستوں سے جو تکلیفیں ہوئیں اسے انھوں نے خاموشی سے برداشت کیا اور حرف شکایت زبان پر نہیں لائے ہاں اردو کے مفاد کو متاثر ہوتا دیکھ کر وہ خاموش نہیں رہتے تھے۔ اس سے اردو سے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں قیام کے دوران ان کی زندگی کے آخری ایام بہت تکلیف دہ تھے۔ انھیں زبردست ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا۔ وہ تمام مصائب خاموشی سے جھیل گئے اور اُف تک نہ کی۔

مولوی صاحب انسانی فطرت شناس تھے۔ وہ کم گو تھے۔ وہ دوسروں کو بولنے کا زیادہ موقع دیتے تھے۔ ان کی بات غور سے سنتے اور مفید مشورے دیتے۔ اپنی گفتگو سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ وہ بے حد شیریں زباں تھے۔

یہاں مولوی صاحب کی تصنیفی خدمات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ 'چند ہم عصر' ان کے اٹھارہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کو ان کے ایک لائق شاگرد شیخ چاند نے 'چند ہم عصر' کے نام سے یکجا کر دیا۔ تنقید نگاروں میں مولوی صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ تحقیق و تفتیش ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ 'اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات' اور 'مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

زبان وادب کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں ایل ایل ڈی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریوں سے نوازا۔

مولوی عبدالحق صاحب کی اردو سے بے پناہ و بے مثال محبت اور اس کی ترقی وترویج کے لیے ان کی جہدِ مسلسل امید ہے محبان اردو کو اردو کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس اور دعوت فکر و عمل دے گی۔

■

Dr. Anwar Adeeb
Ibrahim Manzil, Mosaddi Mohalla, Railpar
Asansol-713302 (West Bengal)
E-mail - anwaradeeb1943@gmail.com

اردو کا ارتقا اور اردو، ہندی کا رشتہ

احمد علی جوہر

اردو ہمارے ملک کی ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ یہ زبان کسی ایک ریاست یا کسی ایک علاقہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے اثرات اور اس کے بولنے والے ہمارے ملک کی تقریباً تمام ریاستوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہندوستان میں آج بھی اس زبان کو 'لنگوا فرینکا' یعنی 'رابطے کی زبان' کی حیثیت حاصل ہے۔ اس زبان نے ہمارے ملک میں چند تاریخی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی عوامل کی بنیاد پر مختصر عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان اپنی ایک مضبوط روایت اور روشن تاریخ رکھتی ہے جس سے واقف ہوئے بغیر ہم اس زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

اردو تقریباً آٹھ سو سال پرانی زبان ہے۔ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ اس سلسلے میں مختلف ادبا اور محققین کے مختلف نظریات ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے مطابق اُردو کی جائے پیدائش سندھ ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی کا خیال ہے کہ اُردو سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہاں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی۔ وہ اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں رقم طراز ہیں:

''اُردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔''[1]

اردو کے آغاز کے سلسلے میں اسی طرح کے خیال کا اظہار شیر علی سرخوش، ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ٹی۔ گراہم بیلی نے بھی کیا ہے۔

محمد حسین آزاد برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔''[2]

اُردو کے برج سے ماخوذ ہونے کے نظریے کو سب سے پہلے ہند آریائی لسانیات کے ایک بڑے ماہر روڈولف ہیورنلے نے پیش کیا تھا۔ ہیورنلے اور محمد حسین آزاد کے علاوہ میر امّن، سرسیّد احمد خاں، امام بخش صہبائی اور سیّد شمس اللہ قادری نے بھی برج کو اردو کا ماخذ بتایا ہے۔

اردو کے آغاز کے سلسلے میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ دکن میں پیدا ہوئی۔ نصیرالدین ہاشمی اسی خیال کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ اُردو کے آغاز کے سلسلے میں ان مختلف نظریات کے درمیان سب سے مستند و معتبر نظریہ پروفیسر مسعود حسین خاں کا تحقیقی نظریہ ہے۔ ان کے مطابق اُردو زبان بارھویں صدی کے اواخر میں دہلی و نواح دہلی میں پیدا ہوئی اور دہلی اور نواح دہلی کی بولیاں اُردو کا 'اصل منبع اور سرچشمہ' ہیں اور 'حضرت دہلی' اس کا صحیح 'مولد و منشا'۔ مسعود حسین خاں کا یہ نظریہ جدید تحقیق کی رو سے سائنٹفک بھی ہے اور سب سے زیادہ مقبول بھی۔

اُردو کا شمار جدید ہند آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ 1500 (ق م) میں آریوں کی ہندوستان آمد سے اس کے آغاز کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ آریوں کے ہندوستان میں آنے کے سبب سب سے پہلے جس زبان کی نشوونما عمل میں آئی اسے 'سنسکرت' کہا جاتا ہے۔ اس کی قدیم شکل 'ویدک سنسکرت' کے نام سے جانی گئی جس کے قدیم ترین نمونے 'رگ وید' میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی شستہ و شائستہ اور منضبط زبان تھی۔ اس کے بعد کی شکل 'کلاسیکی سنسکرت' کہلائی جو ادبی لحاظ سے بیحد متمول زبان تھی۔ سنسکرت زبان ادبی لحاظ سے بھلے ہی ثروت مند رہی ہو مگر یہ عام لوگوں کی زبان نہ بن سکی۔ یہ خاص طبقے کی زبان تھی اور اسے عام بولیوں سے پاک و صاف کرنے کے لیے قواعد کے اصولوں میں جکڑ کر جامد بنا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان محدود ہوتی گئی اور 500 ق م تک پہنچتے پہنچتے اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی جگہ عوام نے فطری زبان اختیار کی جسے 'پراکرت' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 'پراکرت' یعنی فطری زبان بھی مختلف طرح کی تھیں۔ ان مختلف پراکرتوں کی کوکھ سے 500 سنہ عیسوی کے لگ بھگ اپ بھرنشوں یعنی بگڑی ہوئی زبانوں کا جنم ہوا جو 1000 تک پھلتی پھولتی رہی۔ اس کے بعد اس کے ارتقا کی رفتار رک گئی اور مختلف اپ بھرنشوں سے مختلف جدید ہند آریائی زبانیں پیدا ہوئیں۔ اردو کی پیدائش کا زمانہ بھی یہی ہے۔ اُردو کی اصل شورسینی اپ بھرنش کو مانا جاتا ہے

جو شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔ شورسینی اپ بھرنش 1000 سنہ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے ختم ہونے لگتی ہے اور اس کے بطن سے دہلی و نواحِ دہلی میں متعدد بولیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی۔ نواحِ دہلی کی ان ہی بولیوں کے الفاظ کے خمیر سے اُردو کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے، خصوصاً کھڑی بولی کو اُردو کی بنیاد مانا گیا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق کھڑی بولی ہی کی معیاری اور ترقی یافتہ شکل اُردو ہے۔ یعنی اُردو کا ارتقا کھڑی بولی سے ہی ہوا۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اُردو کا نام اُردو بعد میں پڑا۔ ابتدا میں اسے 'ہندی'، 'ہندوی'، 'ریختہ'، 'دہلوی'، 'دکنی' اور 'گجری' کے نام سے پکارا گیا۔

اردو کے آغاز و ارتقا کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی سکونت پذیری سے جوڑ کر دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر اُردو اور مسلمانوں کا اتنا ہی قریبی رشتہ ہوتا کہ جہاں جہاں مسلمان جاتے، وہاں اردو جنم لیتی تو آج ان ممالک کی زبان بھی اردو ہی ہوتی جہاں مسلمان فاتح کی حیثیت سے گئے اور جہاں ان کی اکثریت ہے۔ ہند آریائی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ اگر مسلمان شمالی ہندوستان میں نہ وارد ہوتے تب بھی جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش عمل میں آتی، لیکن ان کے ادبی آغاز و ارتقا میں ضرور تاخیر ہو جاتی۔[3]

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے مطابق مسلمانوں کی آمد کے بغیر بھی اردو کا آغاز ہوتا۔ ہاں اس کی شکل تھوڑی دوسری ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی آمد خصوصاً 1193 میں ان کی فتح دہلی نے اردو زبان کی تعمیر و تشکیل میں ایک خاص رول ادا کیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے زیر اثر اور مقامی لوگوں سے ان کے میل جول کی وجہ سے اردو میں مقامی اور دوسری بولیوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل ہوئے۔

اُردو کے آغاز کا سلسلہ بارہویں صدی کے اواخر سے ہوا۔ اس کے ابتدائی نمونے نامدیو، کبیر، گرونانک کی شاعری، بدھ سدھوں، ناتھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب مذہبی تخلیقات میں ملتے ہیں۔ مسلمانوں میں مسعود سعد سلمان پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عربی، فارسی کے علاوہ 'ہندوی' یعنی اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ قدیم اردو کے سب سے پہلے اور اہم مصنف فارسی کے مشہور شاعر امیر خسرو تسلیم کیے گئے ہیں جنھوں نے 'ہندوی' میں بھی شاعری کی ہے۔ 'ہندوی' میں ان سے منسوب کہہ مکرنیاں، گیت اور دوہے اردو کے اہم ابتدائی نمونے ہیں۔ امیر خسرو سے منسوب یہ ریختہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

قدیم اردو کے ضمن میں امیر خسرو کے کلام کے علاوہ صوفیائے کرام کے اقوال و ملفوظات اور کلام بھی خاصے اہم ہیں۔ شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ حمیدالدین ناگوری، شیخ بہاء الدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ہمارے ان بزرگوں میں ہیں جن کے نام اردو کی ابتدائی نشو و نما کے سلسلے میں ہمیشہ لیے جاتے رہیں گے۔ قدیم اردو کی نشو و نما اور اس کے ارتقا کے ضمن میں محمد افضل کی مثنوی 'بکٹ کہانی' بڑی اہمیت کی حامل ہے جسے مسعود حسین خاں

اردو کے آغاز و ارتقا کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی سکونت پذیری سے جوڑ کر دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر اُردو اور مسلمانوں کا اتنا ہی قریبی رشتہ ہوتا کہ جہاں جہاں مسلمان جاتے، وہاں اردو جنم لیتی تو آج ان ممالک کی زبان بھی اردو ہی ہوتی جہاں مسلمان فاتح کی حیثیت سے گئے اور جہاں ان کی اکثریت ہے۔ ہند آریائی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ اگر مسلمان شمالی ہندوستان میں نہ وارد ہوتے تب بھی جدید ہندآریائی زبانوں کی پیدائش عمل میں آتی، لیکن ان کے ادبی آغاز و ارتقا میں ضرور تاخیر ہوجاتی۔

نے اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی شمالی ہند میں قدیم اردو کے نمونے شعر و شاعری کی شکل میں ملتے ہیں۔ قدیم اردو کے نمونے مغل بادشاہوں بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور غیر مسلم شعرا برہمن وغیرہ کے شعری کلام میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اردو شمالی ہندوستان دہلی و نواحِ دہلی کے علاقوں میں ضرور پیدا ہوئی مگر بعض وجوہات کی بنیاد پر اس کی ترقی، شمال سے پہلے دکن میں بہمنی سلطنت کے زیر اثر ہوئی۔ اردو کی سب سے پہلی ادبی تصنیف مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' از فخر دیں نظامی اسی دور میں لکھی گئی۔ اس عہد میں صوفیائے کرام جیسے شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، مخدوم شاہ حسینی، شاہ میراں جی شمس العشاق، سید شاہ اشرف بیابانی اور سید عبداللہ حسینی کے درسِ اخلاق اور تبلیغ دین کی وجہ سے بھی دکن میں اردو کے فروغ میں کافی مدد ملی۔ دھیرے دھیرے جب بہمنی سلطنت کمزور ہو کر ختم ہوگئی اور دکن کے مختلف علاقوں میں 'بریدشاہی'، 'عمادشاہی'، 'نظام شاہی'، 'عادل شاہی' اور 'قطب شاہی' کے نام سے پانچ خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زیر اثر اردو کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ عادل شاہی سلطنت کا ایک بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی اردو کا ایک قادرالکلام شاعر گذرا ہے۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ 'نورس' آج بھی ایک قابل قدر ادبی و علمی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ عادل شاہی دور کے اہم شعراء میں نصرتی، ہاشمی، رستمی، علی عادل شاہ ثانی اور سید میراں ہاشمی وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ عبدل، ملک خوشنود، حسن شوقی، صنعتی اور مقیمی بھی اسی دور کے شعراء ہیں۔ دکنی اردو کے فروغ میں ان سب کا اہم رول رہا ہے۔ دکن میں اردو کے فروغ میں گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلطنت کا پانچواں مشہور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ کلیات شاعر ہے جس نے کثیر تعداد میں غزلیں، نظمیں، گیت، قصیدے، مرثیے اور مثنویاں کہی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے بعد تین اور بادشاہ محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ اچھے شاعر تھے۔ قطب شاہی دور کے مشہور شعرا میں وجہی، ابن نشاطی اور غواصی قابل ذکر ہیں۔ ملا وجہی شاعر کے ساتھ بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب 'سب رس' اردو میں ادبی نثر کا پہلا نمونہ قرار دی گئی ہے۔ قطب شاہی سلطنت کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں میں فیروز، محمود، ملا خیالی، جنیدی، میراں یعقوب، سید بلاقی وغیرہ بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد دکن کی خود مختار سلطنتوں کا انضمام مغلیہ سلطنت میں ہوگیا مگر شعر و ادب کی محفلیں قائم رہیں اور کئی باکمال شعراء سامنے آئے جن میں ولی، سراج، بحری، وجدی، ذوقی، فراقی، عاجز، امین، طالب وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب 1700 میں شمالی ہندوستان میں ولی کی آمد سے اردو کی ادبی تاریخ پر گہرا نقش مرتب ہوا۔ اردو کی ابتدا شمالی ہندوستان میں تو ہوئی مگر حکومت کی زبان فارسی ہونے کی وجہ سے یہاں اسے خاطر خواہ ترقی حاصل نہیں ہوئی۔ یہاں ابتدائی دور میں اردو کو ریختہ یعنی گری پڑی زبان کہا گیا جس کی طرف شعراء ادباء نے بہت زیادہ توجہ نہیں دی مگر ولی جب شمالی ہندوستان آئے اور سعداللہ گلشن سے ملاقات اور مشورے کے بعد انھوں نے جب فارسی مضامین کو ریختہ میں کہنا شروع کیا تو ریختہ یعنی اردو کی طرف شعراء و ادباء نے للچائی نظروں سے دیکھا۔ پھر کیا تھا دیکھتے دیکھتے شمالی ہند کے شعرا اس گری پڑی زبان

کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے اپنے شعری اظہار کا ذریعہ بنایا۔ کچھ شعرا نے تفنن طبع کے لیے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ جیسے جعفرزٹلی، میر عبدالجلیل زٹلی وغیرہ۔ کچھ شعرا نے منھ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو میں سخن طرازیاں کیں۔ جیسے سراج الدین علی خاں آرزو، قزلباش خاں امید، اسدیار خاں انشا، مرزا عبدالقادر بیدل، اشرف علی خاں پیام، مرزا معزز فطرت موسوی وغیرہ۔ شمالی ہند میں جن لوگوں نے اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا، ان میں شرف الدین مضمون، شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ ظہورالدین قائم، شاکر ناجی، شاہ حاتم، فائز دہلوی، انعام اللہ خاں یقین وغیرہ کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عہد یعنی اٹھارویں صدی میں اردو شاعری نے خوب ترقی کی۔ مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد دہلوی جیسے شعراء اسی عہد میں پیدا ہوئے۔ اردو کے عظیم شاعر خدائے سخن میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا جیسے بے پناہ قادرالکلام شاعر اسی دور میں سامنے آئے جنھوں نے اردو شعروادب کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اردو کے مشہور عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کا بھی یہی زمانہ ہے جنھوں نے اردو شاعری کو عوام میں مقبول بنایا اور ترقی دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کو اردو شاعری کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں دہلی میں اردو شعروادب کو بے پناہ ترقی تو حاصل ہوئی مگر نادر شاہی اور دیگر حملوں کی وجہ سے دہلی اور اس کی ادبی فضا اُجڑ گئی۔ اب لکھنؤ میں شعروادب کی محفل قائم ہوئی۔ لکھنؤ میں جن شعرا نے شاعری کو ترقی دی، ان میں انشا، جرأت، رنگین، مصحفی، خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ وغیرہ کا نام بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ دہلی میں میر وسودا کے بعد ایک طویل عرصہ تک شعروسخن کی محفل ضرور مدھم رہی مگر پھر وہاں دوبارہ شعروسخن کی محفل سجی سنوری۔ اب اسے سنوارنے والوں میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب، ذوق اور مومن تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی میں شعروادب کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ اس عہد کے دوسرے شاعروں میں بہادر شاہ ظفر، صدرالدین آزردہ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، داغ دہلوی اور حکیم ثناء اللہ فراقؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس عہد یعنی انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھنؤ میں ایک طرف میر انیس اور میرزا دبیر نے اردو مرثیے کو اپنی قادرالکلامی سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا تو دوسری طرف پنڈت دیاشنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی نے اپنی مہارت سے اردو مثنوی کو فنی عروج بخشا۔ اسی عہد میں میر حسن دہلوی نے بھی 'سحرالبیان' کے نام سے معرکتہ الآرا مثنوی لکھی۔

شمالی ہند میں اب دھیرے دھیرے اردو نثر نے بھی ترقی کرنا شروع کیا۔ اس کے ابتدائی نمونے شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن، صوفیا کرام کے ملفوظات واقوال وغیرہ ہیں۔ ادبی نثر کا آغاز اٹھارہویں صدی میں فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' اور 'نوطرز مرصع' سے ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں اردو نثر کی ترقی میں انیسویں صدی کے نصف اول میں فورٹ ولیم کالج نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اردو کی مشہور داستان 'باغ و بہار' میر امن نے اسی کالج میں لکھی۔ میر امن کے علاوہ اس کالج میں جن اردو مصنفین نے اردو نثر کو فروغ دینے میں حصہ لیا، ان میں حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی، نہال چند لاہوری، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، للولال جی، بینی نرائن جہاں اور خلیل علی خاں اشک وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان ادباء نے فورٹ ولیم کالج میں اردو داستانوں کے ترجمے سلیس اور آسان اردو میں کیے۔ اس عہد میں کالج سے باہر بھی کئی مشہور اردو داستانیں لکھی گئیں۔ جیسے رجب علی بیگ سرور کی 'فسانۂ عجائب' اور انشاء اللہ خاں انشا کی 'رانی کیتکی کی کہانی'۔ اردو کی ان مختلف داستانوں کے ذریعے اردو نثر کے مختلف نمونے سامنے آئے جس سے اردو نثر کے ارتقا میں خاصی مدد ملی۔ ان داستانوں کے بعد اردو نثر کو فروغ دینے میں جن تحریروں نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا، وہ 'خطوط غالب' ہے جس میں جدید نثر کے انداز واسالیب، معیار ووقار، چاشنی ودلکشی سب کچھ موجود ہے۔ یہیں سے اردو نثر اور شاعری دونوں ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے اور انقلاب 1857 کی وجہ سے اس میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہوتی ہیں۔ 1857 کے سماجی وسیاسی انقلاب نے لوگوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز بدل دیا اور اردو ادب پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ اردو ادب نے اب مغربی ادب کا اثر قبول کرنا شروع کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کی کوششوں سے شعری دنیا میں یہ انقلاب آیا کہ اب جدید موضوعات پر نظمیں کہی جانے لگیں اور روایتی شاعری کا چلن کم ہونے لگا۔ اب نظمیں اور غزلیں جدید انداز اور نئے نئے موضوعات جیسے حب الوطنی، قوم کے لیے ایثار وقربانی، حال کی وردنا کی اور انقلابی جذبوں وغیرہ پر کہی جانے لگیں۔ اس عہد کے اہم نظم نگاروں میں اسمٰعیل میرٹھی، مولانا حالی اور عظمت اللہ خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ عہد ہے جب سرسید کی علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔ اردو ادب خصوصاً اردو نثر پر اس تحریک نے ہمہ گیر اثر ڈالا۔ اس تحریک کے زیر اثر اردو میں روشن خیالی، وسعت نظری اور عقلیت پسندی کی روش عام ہوئی۔ اب تک اردو نثر صرف داستان تک محدود تھی۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو میں جدید نثری اصناف جیسے ناول، افسانہ، سوانح، خاکہ، انشائیہ وغیرہ کا آغاز ہوا اور ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا وغیرہ نے اردو ناول کے میدان میں حیرت انگیز خدمات انجام دیں۔ اردو تنقید کا آغاز بھی حالی کی تصنیف 'مقدمہ شعروشاعری' کے ذریعے اسی دور میں ہوا۔ اسی عہد میں شبلی جیسے جید عالم نے تنقید، سیرت وسوانح اور مضامین ومقالات کے ذریعے اردو ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اسی دور میں 'اودھ پنچ' نے اردو نثر خصوصاً طنز وظرافت کو عروج بخشا۔ اکبرالہ آبادی جیسے اہم شاعر نے اسی دور میں ظریفانہ شاعری کو بلندی پر پہنچایا اور اختر شیرانی نے رومانی شاعری کو ایک معیاری لب ولہجہ عطا کیا۔ اسی عہد میں مہدی افادی، نیاز فتح پوری وغیرہ نے رومانی انداز میں نثر لکھی اور اسے ایک نئے لب ولہجہ سے روشناس کرایا۔

سرسید تحریک کے ساتھ ہی اردو شعروادب بیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں جہاں علامہ اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور یگانہ چنگیزی جیسے شاعروں نے اردو غزل کو ترقی دی، وہیں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری جیسے رومانی افسانہ نگاروں اور پریم چند، علی عباس حسینی، اعظم کریوی جیسے حقیقت پسند افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے اور اس کے ارتقا میں حصہ لیا۔ بیسویں صدی میں اردو ادب میں کئی تحریکات ورجحانات نمودار ہوئے جن میں سب سے اہم تحریک 'ترقی پسند تحریک' ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر سب سے زیادہ اردو افسانہ کا ارتقا ہوا۔ یہی وجہ ہے ترقی پسند تحریک کے دور کو اردو افسانہ کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس دور کے وہ قدآور افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اردو افسانہ کو فن کی بلندیوں پر پہنچایا۔ ان کے علاوہ خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری وغیرہ کا شمار بھی اس دور کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو افسانہ اور ناول کو ویسے تو پریم چند نے ہی بلندی پر پہنچا دیا تھا مگر اردو ناول کا اصل ارتقا ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہوا۔ اس دور کے اہم ناول نگاروں میں عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری اور بیدی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ اس عہد میں اردو نظم کو حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ فیض احمد فیض، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی،

غلام ربانی تاباں، اسرار الحق مجاز، جگن ناتھ آزاد، روش صدیقی، معین احسن جذبی، وغیرہ نے بلند پایہ نظمیں کہیں اور اس کے ارتقا میں دل کھول کر حصہ لیا۔ ان شعراء نے خوبصورت غزلیں بھی کہیں اور اسے اس کے کھوئے وقار کو واپس دلایا۔ اس عہد میں غزل کو سب سے زیادہ معیار ووقار مجروح سلطان پوری نے عطا کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ، ناول، نظم اور غزل کے علاوہ ڈرامہ، انشائیہ، سیرت وسوانح، رپورتاژ وغیرہ کا بھی نمایاں ارتقا ہوا۔

اردو میں حلقہ ارباب ذوق کی تحریک اور جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر بھی اردو شعروادب کا خوب فروغ ہوا۔ میراجی، ن۔م۔راشد حلقہ ارباب ذوق کے اہم شعراء میں ہیں جنھوں نے اردو نظم کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ترقی پسند تحریک کے بعد اردو میں چند ایسے بھی ادباء نمودار ہوئے جنھیں عالمی ادباء کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے جیسے قرۃ العین حیدر، انتظار حسین وغیرہ جنھوں نے فکشن یعنی اردو افسانہ وناول کو فنی عروج بخشا۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی کہ تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا۔ اس سے کچھ دنوں کے لیے ہندوستان میں اردو زبان وادب پر برا وقت آیا مگر پھر جلد ہی اردو کے لیے بہتر فضا نمودار ہوئی۔ اس کے بعد اردو میں جدیدیت کے رجحان کو تقویت ملی۔ بلاشبہ اس رجحان کے زیر اثر زبان و بیان، ہیئت واسلوب کی سطح پر ادب میں اچھے تجربے بھی ہوئے مگر زیادہ تر ناکام تجربے ہوئے جس سے اردو افسانہ، ناول کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس دور میں شاعری کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ جدیدیت کا رجحان اردو کے لیے بہت زیادہ سازگار ثابت نہیں ہوا اس لیے جلد ہی اس رجحان کا خاتمہ ہوا۔ ویسے کہنے کو تو اردو میں مابعد جدیدیت کا رجحان بھی سامنے آیا مگر ان سے قطع نظر 1980 کے بعد اردو افسانہ اور ناول کے لیے بہتر فضا سازگار ہوئی۔ 1980 کے بعد اردو کی تمام ادبی اصناف اور اردو زبان و ادب کے میدان میں خوب ترقی ہوئی خصوصا افسانہ اور ناول کے میدان میں۔ بیسویں صدی کے بعد اردو اکیسویں صدی میں داخل ہوئی اور آج اردو نہ صرف ہند و پاک میں بلکہ بیرون ممالک میں بھی ترقی کر رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ادبی اور فنی اعتبار سے اردو میں تھوڑا زوال آیا ہے مگر عوامی بول چال کی سطح پر اردو خوب ترقی کر رہی ہے۔ اس کا سہرا خصوصا فلمی دنیا اور مختلف علاقوں میں ہونے والے مشاعروں پر جاتا ہے۔ آج بھی اردو زبان عوام کے دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہے اور ترقی کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں بے پناہ چاشنی، شیرینی، دلکشی، نغمگی، انسانیت و رواداری کا جذبہ اور جاذبیت

> **جتنا گہرا رشتہ اردو اور ہندی میں ہے شاید دنیا کی کسی دوزبانوں میں نہیں۔ دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں۔ یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آگئیں۔ اگرچہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے جس کی وجہ سے لفظیات میں خاصا فرق ہے۔ تاہم نسبتی اعتبار سے سگی بہنیں ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔**

ہے۔ اردو کے ترقی کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی لچکدار زبان ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کر کے اسے اپنے مطابق ڈھالنے کی جو صلاحیت اردو میں ہے، اس کی مثال دوسری زبانوں میں ناپید ہے۔ اردو کے ترقی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ عوام کے مزاج کے موافق ہے اور ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی، سماجی، سیاسی اور معاملاتی زندگی سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔

اردو اور ہندی کا رشتہ

اردو زبان کو لے کر ایک سوال برابر کیا جاتا رہا ہے کہ ہندی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ اس ضمن میں عرض کرتا چلوں کہ اردو ملک ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کا ماخذ ایک ہے یعنی کھڑی بولی۔ یہ دونوں زبانیں سگی بہن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک عام اندازے کے مطابق اردو میں ستر (70) فیصدی الفاظ ہندی ہیں۔ صرف بیس یا تیس فی صدی الفاظ اردو میں عربی اور فارسی کے ہیں۔ اردو نے عربی اور فارسی کے بیشتر الفاظ کو اپنے مطابق ڈھالا ہے یعنی اس کی تارید کی ہے اسے ہندی کے مطابق ڈھال کر استعمال کیا ہے۔ اردو اور ہندی کی لفظیات، صرفیات اور نحویات میں جتنا اشتراک پایا جاتا ہے، دنیا کی کسی دو زبانوں میں ایسا اشتراک نظر نہیں آتا۔ آپ کوئی جملہ اردو اور ہندی میں بولیے، لفظوں کا فرق ہوسکتا ہے مگر جملے میں لفظوں کی ترتیب بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ اردو کی تقریبا چالیس آوازیں ہیں۔ ان میں سے صرف چھ آوازیں ایسی ہیں جو فارسی وعربی سے لی گئی ہیں، باقی سب کی سب اردو اور ہندی میں مشترک ہیں۔ خصوصاً ہکار (Aspirated) آوازیں پھ، بھ، تھ، دھ، چھ، کھ، گھ اپنے سادہ روپ میں پورے سٹ کی حیثیت سے اردو اور ہندی میں موجود ہیں۔ اسی طرح معکوسی (Retroflex) آوازیں ٹ، ڈ، ڑ اور ان کی ہکاری شکل ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی اردو اور ہندی میں مشترک ہیں۔ یہ چودہ آوازیں اردو کا رشتہ پراکرتوں سے جوڑتی ہیں کیوں کہ یہ آوازیں نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ اس طرح گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اور ہندی کے مصمتوں (Consonants) کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں (Vowels) میں تو اردو، ہندی میں یکسانیت اس سے بھی زیادہ ہے یعنی صوتی ہم آہنگی تقریباً سوفی صدی ہے۔ اردو فعل کا سارا سرمایہ ہندی سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ محاوروں، کہاوتوں، تلمیحوں، ضرب الامثال اور فقروں میں بھی دونوں زبانوں میں گہرا اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں زبانوں میں جو گہرا لسانی اشتراک ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اردو کے معروف محقق و ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''جتنا گہرا رشتہ اردو اور ہندی میں ہے شاید دنیا کی کسی دوزبانوں میں نہیں۔ دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں۔ یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آگئیں۔ اگرچہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے جس کی وجہ سے لفظیات میں خاصا فرق ہے، تاہم نسبتی اعتبار سے سگی بہنیں ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔''[4]

اردو زبان وادب کے اس جائزہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اردو زبان وادب کی متمول اور توانا روایت اور روشن تاریخ ہے، اردو نے آٹھ سو سال کے عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور آج بھی کر رہی ہے اور ہندوستان کی تہذیبی، سماجی، سیاسی سے اس کا گہرا لگاؤ اور ہندی سے اس کا اٹوٹ اور گہرا رشتہ ہے۔

حواشی

1۔ حافظ محمود خاں شیرانی، 'پنجاب میں اُردو' نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1970، ص19

2۔ محمد حسین آزاد، آب حیات، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ، 1967، ص13

3۔ سنیتی کمار چٹرجی، Indo-Aryan and Hindi (1960)، ص104

4۔ گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، رام پور رضا لائبریری، یوپی، 2006، ص42

■

Ahmad Ali Jauher
Room No: 236-E Dr Brahmaputra Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob:9968347899/9711542962.
Email: ahmad211jnu@gmail.com

داغ کی شاعری میں خوف کی جمالیات

قمر جمالی

'خوف'

اس لفظ میں بڑی پراسراریت ہے۔

خوف سے خوف زدہ ہوجانا ایک عام سی بات ہے۔ مزید برآں کہ اس کی رمزیت کی تلاش تشویش کن ہے۔ اس لیے عام صورت حال میں اتنا ہی کافی ہے بجائے اس کی گرہیں کھول کر مزید خوف زدہ ہوں اسے جوں کا توں قبول کرلیا جائے اور اس سے حظ اٹھایا جائے۔

کیونکہ خوف کی بھی جمالیات ہوتی ہے خوف ایک ایسا جذبہ ہے جو اگر شدید ہو تو انسانی وجود کو تہس نہس کرسکتا ہے۔

مگر اس کا دوسرا رخ خوبصورت ہے جسے ہم 'خوف کی جمالیات' یعنی 'The Aesthetics of Apprehension' سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس جذبے میں گرمی تو ہے ہی نرمی کے ساتھ ہراسانی، پریشانی، اندیشہ، وسوسہ، اپنا کچھ کھونے یا اس میں تصرف کا خدشہ بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جذبے سے ایک حساس انسان، ایک فنکار، ایک شاعر، ادیب یا پھر— ایک عاشق بار بار نبرد آزما ہوتا ہے۔ 'خوف' جبر و قدر کے درمیان ایک میزان بھی ہے جو ایمان کی استقامت کی ضامن ہے۔ حدیث ہے:

اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْجَبْرِ وَالْقَدْر

''ایمان جبر اور قدر کے درمیان ہے۔''

'خوف' تہذیب کا حصہ بھی ہے۔ بالخصوص ہندوستانی تہذیب کا بہت اہم حصہ۔ اگر ہم ہندوستانی تہذیبوں کے ارتقائی سفر کا مطالعہ کریں تو واضح ہوگا کہ ہندوستانی تہذیب دنیا کی دیگر تہذیبوں سے کئی معنوں میں ماورا ہے۔ ہماری تہذیب میں چاہت اور محبت میں خودسپردگی کا جذبہ غالب رہتا ہے جس کی کوکھ سے خوف جنم لیتا ہے۔ اس جذبے کی شدت کو ہم اورنگ آباد کے ان غاروں میں جہاں پتھر بولتے ہیں اور اڑیسہ کے سورج دیوتا کے 'کونارک' مندر کی مورتیوں سے ہمکلام ہوتے ہوئے محسوس کرسکتے ہیں۔ کسی کو پانے یا کھونے کا خوف، کسی کے ہوجانے پھر بچھڑنے کا خوف، محبوب کی خوشنودی یا ناراضگی کا خوف، عشقِ مجازی کی سلامتی، استقامت اور ٹوٹنے بکھرنے کا خوف یا پھر—

عشقِ حقیقی میں اپنے رب کو ناراض کرنے کا خوف۔

ان سب پر قابو پانے کے لیے ہم جس حسنِ ظن سے کام لیتے ہیں وہی دراصل خوف کی جمالیات، The Aesthetics of Apprehension' ہے۔

لغوی طور پر:

1. فیروز اللغات (اردو جامع) نیا ایڈیشن، مرتبہ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سیریز (لاہور، راولپنڈی) کے مطابق— ڈر، دہشت، ہراس اور ہول ہے۔
2. فرہنگِ آصفیہ جلد اوّل (جملہ جلدیں تین) مولفہ خان صاحب مولوی سید احمد دلوی ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ سلسلہ مطبوعات نمبر 553 کے مطابق — ڈر، اندیشہ، ہول، بھٹے، دہشت، ہراس اور ہیبت ہے۔
3. دی آرین پور پروگریسو انگلش- پرشین ڈکشنری، مرتبہ منوچہر آرین پور۔ (The Aryanpur Progressive English-Persean Dictionary, Edited by: Manoochaher Aryanpur) کے مطابق دستگیری، دریابی، بیم، تشویش اور واہمہ۔
4. انگریزی کی آکسفورڈ ڈکشنری، مرتبہ Archie Hobson کے مطابق Something bad sr. unpleasant will happen

ان تمام معنوں پر غور کریں تو یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ خوف ایک ایسا جذبہ ہے جس میں کچھ کھونے پانے، ٹوٹنے بکھرنے، کسی کے چھوٹ جانے کا اندیشہ کسی کی ناراضگی کا خدشہ یعنی امید و بیم کے درمیان احساس کا ایسا حصہ جس میں غم و غصے اور مایوسی کے ساتھ محبت بھی شامل ہے۔

غالب جب امراؤ بیگم کو دالانڈے میں نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر اپنی جوتیاں بغل میں داب کر یہ کہتے ہوئے نکل جاتے ہیں—

''سارے گھر کو مسجد بنا رکھا ہے۔''

تو غالب کے اس احساسِ خوف میں ایک نرم جذبہ بھی مضمر ہے کہ کہیں وہ امراؤ بیگم کی نماز میں مخل نہ ہوں۔ اس جذبے میں غالب کا نماز کے تئیں احترام، امراؤ بیگم سے محبت اور ان کے روٹھنے کا خدشہ بھی شامل ہے۔

یہی اندیشہ 'خوف کی جمالیات' ہے۔

دراصل یہی میرے موضوع کا نفسِ مضمون ہے—

جمالیات کیا ہے—؟

ہماری نظر میں کسی بھی چیز، خواہ مرئی ہو یا غیر مرئی ہو، میں حسن کی تلاش۔ کیونکہ، کائنات کی ہر شے اور انسانی احساسات کے ہر پہلو میں حسن مضمر ہے۔ بس ضرورت ہے تو نگاہِ بصیرت کی۔

شہنشاہِ جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب نے اپنے تشکیلیاتی اسلوب سے 'جمالیات' کو نہ صرف ایک نیا پیراہن عطا کیا بلکہ تحقیق و تنقید کے لیے ایک مستقل موضوع وضع کیا۔ شکیل الرحمٰن صاحب نے ہر ازم کی جمالیات دریافت کی اور اس کی گرہیں کھول کر قارئین کے دماغوں کو روشن کیا۔ مثلاً: مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، امیر خسرو کی جمالیات، قلی قطب شاہ کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، مولانا رومی کی جمالیات، غالب کی جمالیات، ہندوستانی جمالیات، فیض احمد فیض: المیہ کی جمالیات،

اقبال: روشنی کی جمالیات، جمالیاتِ حافظ شیرازی، اور 'ہند اسلامی جمالیات' وغیرہ وغیرہ۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کی نظر میں کائنات کی ہر شے میں جمالیاتی حس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں محض جمالیاتی فکر و بصیرت کی وجہ سے ہی کائنات کا حسن برقرار ہے۔

اردو شاعری کا دامن اتنا وسیع ہے کہ ہمارے لیے صرف میر و غالب، اقبال، فیض، فراق تک پہنچنا ہی مشکل ہے کیونکہ ان کے یہاں جمالیاتی تجربے کا جہان آباد ہے جو اردو ادب کا عظیم سرمایہ ہے۔ اس لیے یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ اردو ادب یا اردو شاعری میں جمالیاتی تصور پر بات کرنا مجھ جیسے ہیچمدان کے لیے جسارتِ کوہکن کے مترادف ہے۔

اس مضمون کے ذریعے صرف نواب مرزا داغ دہلوی کی شاعری میں خوف کی جمالیات تک پہنچنے کی سعی کی جارہی ہے۔

کسی بھی فن پارے میں جمالیاتی حس کی دریافت کرنی ہوتو پہلے اس فن پارے میں وجدانی کیفیت کو محسوس کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ جمالیاتی تصور دراصل وجدان پر ہی منحصر ہوتا ہے۔

داغ کی شاعری میں وجدانی نبض کو ٹٹولنے کے لیے ان حالات کا جاننا بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے داغ کی شاعری پر عشقیہ شاعری کا ٹھپہ لگا ہوا ہے جو اپنی نزاکتوں یا کثافتوں کی باعث قابلِ تعریف رہی ہے تو قابلِ مذمت بھی رہی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون 'کیا داغ محض عشقیہ شاعر ہیں؟' میں کئی سوالات قائم کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''آج اجتماعی تہذیب اور متنوع شاعری کے دور میں داغ کی انفرادی نوعیت کی شاعری ہمیں متوجہ نہیں کرتی بلکہ سوالات قائم کرتی ہے اور ہم انھیں محض چونچلے اور بوالہوسی کی شاعری کہہ کر الگ کردیتے ہیں۔ اس لیے کیا یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ...

1. جن جذبات کا اظہار شعر میں ہوا ہے وہ کس قدر مصنوعی ہیں اور کس قدر حقیقی؟
2. کیا یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ ان کیفیات کے درپردہ ایسے عناصر پوشیدہ ہیں جو داغ کی سنجیدگی، رنجیدگی اور افسردگی کو ظاہر کرتے ہیں؟''

اور آخر میں خود ہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''بہت سارے سماجی خیالات، عمرانی تصورات، عیش کی راہ سے گزرتے ہوئے کائنات پر چھا جاتے ہیں۔ عمدہ اور معیاری، عشقیہ شاعری اسے ہی سمجھی گئی جو اسرارِ حیات اور آزارِ کائنات کو سمجھنے میں مدد کرے اور ہماری زندگی کو بھرپور بنادے۔ دعوتِ عشق دے تو دعوتِ عمل بھی دے۔ داغ کی شاعری بالکل ایسی تو نہ تھی لیکن ان کے سرمایے میں اس نوعیت کی اچھی خاصی شاعری بھی ہے جو محض عشقیہ شاعری نہیں ہے۔''

(ماہنامہ آجکل، مئی 2016، ص 8)

داغ اس روایتِ شاعری کی آخری کڑی ہیں جو ولی دکنی سے شروع ہوکر امیر مینائی اور خود داغ پر ختم ہوتی ہے۔ گوکہ داغ کی شاعری کو جسم و جان کی شاعری یا جنسی شاعری کا نام دیا گیا ہے، یہاں تک کہ مولانا حسرت موہانی نے اسے 'فاسقانہ شاعری' اور حالی نے 'غیر اخلاقی' شاعری کا نام دیا ہے، داغ نے اپنے فصیح و بلیغ اندازِ بیاں، نزاکتِ احساس اور محاوراتی اظہار سے شاعری میں نہ صرف اپنے عصر کو زندہ جاوید کیا بلکہ رہتی دنیا تک عمدہ اور معیاری شاعروں میں اپنا نام درج کیا ہے۔

داغ معجز بیاں ہے کیا کہنا
طرز سب سے جدا نکالی ہے

داغ دراصل دلی کی دم توڑتی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان حالات اور معاشرت اور تہذیبی ورثے، سمجھنا ضروری ہے جو اس وقت مروج تھے کیونکہ کوئی بھی شاعر، ادیب یا فکشن لکھنے والا اپنے عصر کا نقیب ہوتا ہے۔

نواب مرزا خان دہلوی 25 مئی 1831 کو دلی کے محلے چاندنی چوک میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام تذکروں کے مطابق نواب شمس الدین احمد خان درج ہے کیونکہ داغ کی والدہ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم جو محمد یوسف کشمیری کی چھوٹی، حسین و جمیل بیٹی اور نواب شمس الدین احمد خان، والیِ فیروز پور و جھرکہ کی داشتہ تھیں۔ 'سخنِ شعرا' میں داغ کا تعارف 'داغ تخلص نواب مرمائے دہلوی ولد چھوٹی بیگم' درج ہے۔

دولت ہندوستان عرف نواب فخرو 1844 میں مرزا محمد سلطان غلام فخر الدین فتح الملک بہادر ولی عہد سوم کی منکوحہ بنیں اور قلعہ معلی آئیں تو انھوں نے نواب مرزا داغ کو بھی قلعہ معلی اپنے پاس بلالیا۔ نواب فخرو کو بھی شعر و شاعری سے شغف تھا۔ انھوں نے جب داغ سے ان کے اشعار سنے تو اپنے والد بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوق دہلوی کی شاگردی میں دے دیا۔ نواب مرزا کا تخلص داغ بھی نواب فخرو کا دیا ہوا ہے۔ تلمذ کا یہ سلسلہ وفاتِ ذوق 1856 تک جاری رہا۔

اس ساری حکایت عیش و طرب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ محاورتاً چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں مگر نواب مرزا داغ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے۔ پیدائش سے چار سال تک نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و لوہارو کے محل میں رہے۔ درمیان میں کچھ سال اپنی خالہ عمدہ بیگم کے ساتھ نواب محمد سعید خان والیِ رامپور کے محل میں رہے۔ چودہ سال کی عمر میں لال قلعہ منتقل ہوئے تو شہزادوں کی سی زندگی جی۔

مگر عنفوانِ شباب کی کچی عمر میں انھوں نے ایک کے بعد ایک کئی مردوں کو عارضی باپ کی صورت ماں کی خواب گاہ میں آتے جاتے دیکھا تو اسی ماحول میں خود کو رنگ لیا۔ غیر مردوں کو ماں کے ساتھ دیکھ کر ان کی حمیت کو کوئی دھکا نہ لگا۔ الٹا انھوں نے اس اندازِ زندگانی کو منفعت بخش محسوس کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

جب چودہ سال کی عمر میں لال قلعہ منتقل ہوئے تو اٹھتی ہوئی جوانی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انھیں ماحول سازگار ملا اور وہ زندگی انھیں خوب راس آئی۔

لال قلعہ میں ان کی تربیت شہزادوں کے بیچ انھیں کی طرح ہوئی۔ ان کے معمولات بھی وہی ہوگئے جو اور شہزادوں کے تھے۔ چاروں طرف نوجوان لڑکیاں، شہزادیاں، خواص، مغلانیاں اور دل بہلانے والی طوائفیں۔ اس وقت قلعہ معلی کا ماحول عیش و نشاط میں ڈوبا ہوا تھا۔ داغ اُس ماحول میں شیر و شکر ہوگئے۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا عملاً اس کے عادی ہوگئے۔

دوسرے شہزادوں کی طرح داغ نے بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی تربیت لی مگر شاعری ان کا پہلا عشق اور اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ ظاہر ہے اپنے اشعار میں داغ نے وہی کچھ پیش کیا جس کا انھیں عملی تجربہ تھا۔ زندگی ان کے لیے عیش و نشاط کا مرکز بن گئی۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

تارِ نگاہ و سوزنِ مژگاں سے حشر میں
منہ سی دیا نہ تم نے کسی داد خواہ کا

جھلکتی ہے خطِ عارض پہ اس کے روشنی کیسی
نرالا حسن ہے سائے میں نور ایسا نہیں ہوتا

شبِ ہجراں سے موت بہتر ہے
خوب آرام سے تو آئے گا

یوں نہ آئے گا ہاتھ گروہ صنم
ترکِ اسلام سے تو آئے گا

کمبخت یہ بھی دے نہ سکا رات بھر کا ساتھ
میں جاگتا رہا شبِ غم بخت سوگیا

کسی حسیں کو اگر دیکھتے تو مرجاتے
جنابِ خضرؑ کی پھر عمرِ جاوداں کیسی

ہستی میں ہیں عدم کے مزے عاشقوں کو داغ
قالب میں جان آتے ہی پہلو سے دل گیا

اے محتسب اک دم سے تری کتنی جفائیں
شیشہ کا منہ بند صراحی کا گلا بند

داغ زندگی کو بھرپور جینا چاہتے تھے اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ جنس کی تسکین تھا۔ عیش میں بسر کرنا ہی ان کا مقصدِ حیات تھا۔

نہیں مرنے کا اپنے غم، یہ غم ہے
کہ پھر آنا نہ ہوگا اس جہاں میں

داغ کی نفسیات پر ماں کا اتنا اثر رہا کہ عورت ہمیشہ ان کے اعصاب پر چھائی رہی۔

عورت محض کھیلنے کی چیز تھی جیسے ان کی ماں اور خالہ۔ فطرتِ داغ میں سچے عاشق کو ڈھونڈنا تلاش عبث تھی۔ بہ الفاظ دیگر داغ ایک ہرجائی عاشق تھے۔ اس بات کا اظہار ان اشعار میں دیکھیے:

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں
تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا
کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں
دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں
پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر
اک نئے آدمی سے ملنا تھا

1856 میں ولی عہد فخرو مرزا کا اچانک بیٹھے میں انتقال ہوا تو نواب مرزا داغ کو اپنی والدہ وزیر بیگم کے ہمراہ قلعہ معلی سے نکلنا پڑا۔ 1857 کی قیامت خیز تباہی نے قلعہ معلی کی عظمت کو تہس نہس کردیا مگر داغ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ وہ ایک سال قبل قلعہ چھوڑ چکے تھے اور اپنی خالہ عمدہ بیگم کی سفارش پر رام پور کے محل میں پورے کروفر سے رہ رہے تھے۔ بغاوت ختم ہوئی تو داغ دوبارہ دلی پہنچے مگر دلی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

سرورِ عیش و نشاط کیسی، بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے، وہ آنکھ سے انقلاب دیکھا

1889 میں بحالتِ مجبوری قسمت آزمائی کے لیے حیدرآباد جو اُس وقت مغلیہ تہذیب ہی کا نشان تھا وارد ہوئے۔ پہلی بار مایوسی ہوئی۔ دوسری بار 1890 میں انھیں دربار میں رسائی مل گئی اور نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے استاد مقرر ہوئے۔ ایک بار پھر وہ امیرانہ ٹھاٹ باٹ لوٹ آئے۔ 1894 میں نظام دکن نے انھیں 'بلبلِ ہندوستان، جہان استاد دبیر الملک ناظم جنگ بہادر' کا خطاب اور ایک ہزار روپے مشاہرہ مقرر کیا۔ ساتھ ہی پچھلا بقایا ساٹھ ہزار روپے بھی ادا کیا۔ اب داغ کے لیے بس چاندنی ہی چاندنی تھی۔

داغ کی شاعری میں خوف، ہراس، ناامیدی، افسردگی، یاس وحسرت، کچھ کھونے، کسی کے چھوٹنے کا غم ناپید ہے۔ کیونکہ عشق مجازی کے تو وہ خود ہیرو تھے۔ اسی لیے طوائف مرکزِ حیات تھی جسے انھوں نے اس کی صفتی کمزوریوں کے ساتھ چاہا۔ انھیں اپنی معشوق کا ہرجائی ہونا گراں نہیں گزرتا تھا بلکہ وہ اپنی معشوق کی اس ادا سے حظ اٹھاتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

لڑی جاتی ہے غیر سے آنکھیں
مجھ سے بھی بات کرتے جاتے ہیں
دو دن بھی برابر وہ کسی سے نہیں ملتا
یہ اور قیامت ہے کہ مل کر نہیں ملتا
کیا رہیں ہم کہ تیرا چال چلن
پاس رہ کر نہیں دیکھا جاتا

تو یہ ہے کہ انھیں اپنی معشوق کے روٹھنے کا بھی کوئی افسوس نہ تھا، منانے کی بات تو درگزر

کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو
خوب رویوں سے جہاں خالی نہیں

یہ وہ دور تھا جب بادشاہ وقت سلطنت کے نظم ونسق سے بے نیاز تھا۔ ظاہر عوام پر فرار کی صورت دو ہی راہیں کھلی تھیں۔ ایک نفس پرستی کی تو دوسری خدا پرستی کی۔ مذہب محض دکھاوا یا رسوم کی پابندی کا معاملہ بن گیا تھا۔ صوفیا اور مرشدین گنڈے تعویز کے ذریعے رقم بٹور رہے تھے۔ لال قلعہ تو اس علت میں بری طرح ڈوبا ہوا تھا۔ دافع بلّیات کے لیے خدا کے حضور جھکنے، گڑگڑانے کی جگہ تعویذ فلیتوں میں پناہ ڈھونڈی جاتی۔ نذر و نیاز چڑھائی جاتی کہ نہ کرنے سے کہیں کوئی آفت نہ ٹوٹے۔ داغ اپنے عصر کے نہایت ہی دیانت دار پیروکار تھے۔

ظاہر ہے داغ کے ہاں خوفِ خدا کا عنصر بھی ڈھونڈنے سے ہی مل پائے! گناہوں سے شرمسار ہونے کا خوف، حلال وحرام کے بیچ فرق مفقود نظر آتا ہے۔ ایسے میں خوفِ خدا کے زیر اثر موزوں ہوئے اشعار میں خوف کی جمالیات کی تلاش مشکل تو ہے کیونکہ داغ خوف کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے بلکہ اس سے حظ اٹھاتے ہیں۔

اس پر تو کرتا عمل تو دیکھتا
قطرۂ مے زاہدا تسبیح کا دانہ نہ تھا
لو اے بتو! سنو کہ وہ داغ بت پرست
مسجد میں جا کے آج مسلمان ہوگیا
کی ترکِ مے تو قائل پندار ہوگیا
میں توبہ کرکے اور گنہگار ہوگیا
مے تو حلال ہے جو پیے ڈھب سے بادہ کش
میں توبہ کرکے اور پریشان ہوگیا

بقول جمیل جالبی:

''درد وکرب میں مبتلا ہونا داغ کے مزاج اور ان کی فطرت نہیں ہے۔ وہ اسی ماحول میں رہ کر خلد بریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے 'فنا' ان کے تخلیقی دائرے میں شامل نہیں ہے اور وہ خود بھی اس کے علاوہ کسی اور پہلو پر غور نہیں کرتے۔ عشق کی ناکامی بھی ان کا مسئلہ نہیں ہے اور وہ اس لیے کہ ان کا معشوق طوائف ہے جو انھیں حاصل ہے یا حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی معشوق کے حسن و جمال سے کھیلنا، اس عشق کے نئے نئے تجربوں اور معاملات سے لطف اندوز ہونا ان کی زندگی کا بہترین مشغلہ ہے جس پر آخر عمر تک عمل پیرا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد چہارم از جمیل جالبی، فصل چہارم، ص 1493)

بہار بن کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے

کے مصداق داغ نے کسی بھی خوف کو اپنے دامن میں جگہ نہیں دی۔ ان تمام باتوں کے باوجود بحیثیت انسان داغ کی شاعری میں ایسے اشعار کا فقدان ضرور ہے جن میں خوف، پریشانی، پشیمانی اور پچھتاوے کا اظہار ہے مگر ناپید نہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

تاثیر بچ کے سنگِ حوادث سے آئے کیا
میری دعا بھی ٹھوکریں کھاتی ہے راہ میں
ڈر ہے منہ پھیرے وقت ذبح نہ خنجر اس کا
پڑھ کے ہم سورۂ اخلاص کو دم کرتے ہیں
کرتا ہے رقیب ان کی شکایت مرے آگے
ڈرتا ہوں کہ مل کر نہ کہیں مجھ کو دعا دیں
بے اثر ٹھہری دعائیں سب کی سب
عمر بھر کی وہ وفائیں سب کی سب
ستیاناس ہو ترا اے دل
تو ہمارے نہ کام کا نکلا
نہیں اس کے خوگر ہم اے آسماں
نہ دے ہم کو تکلیف راحت کے بعد
مجھ کو دھڑکا ہے کہیں قطع تعلق نہ کریں
اب جو ہر بات پہ تکرار وہ کم کرتے ہیں
یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی
مداوا ترے کشتگانِ ستم کا
خدا جانے عقبیٰ میں کیا ہورہا ہے

تحقیق کبھی حرفِ تمام نہیں ہوتی بلکہ فکر کی راہ ہموار کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مضمون قارئین کو تشنہ لگے۔ پھر بھی ان خطوط پر سوچ کو مہمیز کرسکے کافی ہے۔

■

Qamar Jamali
'Rahat Kadah' H.No: 4-5
Himagiri Nagar Colony
Gandamguda
Hyderabad - 500091 (Telangana)

فیض یافتگان دیوبند کی تخلیقات میں امن و یکجہتی کے عناصر

فاروق اعظم قاسمی

اعتدال دیوبند کا مزاج اور شناخت رہا ہے۔ اس کے پیش نظر قرآن کا وہ ضابطہ بھی ہمیشہ رہا ہے جس میں انسان کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے نقطۂ اشتراک پر جمع ہو کر کام کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اپنے دین پر مکمل کاربند اور ثابت قدم رہتے ہوئے وطن کی دوسری اقوام کے ساتھ دیوبند کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ دیوبند اسکول کے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن جنھیں مالٹا کی سخت قید و بند سے رہائی کے بعد اہل وطن نے شیخ الہند کے خطاب سے نوازا۔ آزادی ملک کی ان کی عظیم تحریک 'تحریک شیخ الہند' سے ملک کا ذرہ ذرہ باخبر اور ہر انصاف پسند ہندوستانی واقف ہے۔ شیخ الہند نے دیوبند میں جب خفیہ طور پر اس تحریک کی بنیاد ڈالی تو اس کے ممبر غیر مسلم طلبہ بھی تھے۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں سید محبوب رضوی مرحوم نے لکھا ہے کہ ابتدا میں دارالعلوم میں فارسی و ریاضی کے درجات میں بہت سے ہندو طلبہ پڑھا کرتے تھے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن جب انگریزوں نے ملازمت کے لیے سرکاری تعلیم اور سرکاری سند کو لازمی قرار دے دیا تو پھر شدہ شدہ یہ پوری ٹولی بکھر گئی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند (1992) جلد 1، ص: 194)

1866 میں دارالعلوم دیوبند جب قائم ہوا تو طلبہ کے لیے اسے کتاب کی ضرورت پڑی۔ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم قاری محمد طیبؒ قاسمی اپنے ایک پیغام میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ جناب منشی نول کشور صاحب انسانی ہمدردی اور علم دوستی میں یکتا تھے۔ ان کی علم دوستی اور علما نوازی کا نتیجہ تھا کہ 1866 میں جب دارالعلوم قائم ہوا تو اس کے پاس طلبہ کو دینے کے لیے درسی کتابیں موجود نہیں تھیں... اہل ملک سے اپیل کی گئی۔ چناں چہ اس اپیل کا ملک میں خاطر خواہ اثر ہوا۔ اہل مطابع نے اس موقع پر اپنی مطبوعات بڑی فراخ دلی سے دارالعلوم کو پیش کیں، حتیٰ کہ بعض ہندو مالکان مطابع نے بھی بفراخ دلی کتابوں سے دارالعلوم کی اعانت کی۔''

آگے 1294 ھ کی روداد کے حوالے سے قاری صاحب لکھتے ہیں:

''جناب منشی نول کشور مالک 'اودھ اخبار' لکھنؤ اور جناب راؤ سنگھ صاحب مالک اخبار 'سفیر بڈھانہ' کا بالخصوص شکریہ کہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود ہیں مگر آفرین صد ہزار آفرین ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں۔'' (ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ نول کشور نمبر، نومبر و دسمبر 1980)

اس مشن کی تکمیل کے لیے جب حضرت شیخ الہند نے اپنے انتہائی چہیتے اور رازدار شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان کے محاذ پر روانہ کیا اور انھوں نے وہاں ایک عبوری حکومت قائم کی تو اس وقت بھی اس حکومت کی مسند صدارت پر راجہ مہندر پرتاپ کو بٹھایا۔ اس لیے کہ حضرت شیخ الہند نے کابل میں موجود اپنے شاگردوں کو یہ ہدایات بھیجیں تھیں کہ ''وہ ہر طرح اپنی تحریک میں غیر مسلموں کو بھی شامل کریں اور انھیں ذمہ دار مناصب پر فائز کریں اور انھیں بطور خاص یہ یقین دلائیں کہ اس تحریک کا مقصد پھر سے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ صرف ملک کی آزادی کا حصول ہے''۔ (معماران جامعہ، ظفر احمد نظامی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی (2011) ص: 26)

یوں تو فضلائے دیوبند نے کئی حوالے سے امن و یکجہتی کے فروغ میں عملی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن اسی کے ساتھ ان کے ذخیرۂ شعر و ادب میں ایسے بے شمار نمونے دیکھے جا سکتے ہیں جن سے امن و یکجہتی کا نور پھیلا اور پھیل کر نفرت کی سیاہیوں کو مٹانے کا کام کیا۔ سردست میری گفتگو کا موضوع 'امن و یکجہتی کے فروغ میں دیوبند کا کردار، نظم و نثر کی روشنی میں' ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ ایک وسیع موضوع ہے جسے سمیٹنے کے لیے دفتر درکار ہے۔ تاہم وسعت بھر کوشش کی جائے گی اور فضلائے دیوبند کی نثری و شعری تخلیقات کے وہ عناصر ذیل میں پیش کیے جائیں گے جن سے قومی یکجہتی کو فروغ ملا ہے۔

قومی یکجہتی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اپنی اپنی مذہبی اور تہذیبی آزادی کے ساتھ ملک میں بسنے والی ہر قوم مل جل کر پیار و محبت سے رہے اسی کا نام قومی یکجہتی ہے۔ قومی یکجہتی کی تعریف کی وضاحت اور اس کے حدود و قیود متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی قاسمی لکھتے ہیں:

''قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کیا ہے؟ یہاں پر قومی یکجہتی کے تصور اور حقیقی خد و خال کو واضح کرنا ضروری ہے تاکہ کسی غلط فہمی اور غلط مبحث کا اندیشہ نہ رہے۔ قومیت اور یکجہتی دونوں مل کر ہندوستان کی تہذیبی، لسانی، تاریخی اور رنگی و نسلی رنگارنگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زبان و ادب، رہن سہن، تصورات اور رسم و رواج میں اشتراک و یگانگت اور تہذیبی و ثقافتی مظاہر میں مماثلت قومی یکجہتی کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ سیاسی اور قومی وحدت کا مفہوم انھی مماثلتوں سے برآمد ہوتا ہے اور پھر ہندوستان کی مخصوص پہچان اور علامت، کثرت میں وحدت کا چہرہ ظہور پذیر ہوتا ہے... یہاں کی مٹی میں اجتماعی مزاج کی خوشبو رچی بسی ہے۔ یہاں کثرت میں وحدت کے فلسفے

پر ہی عمل کیا جاسکتا ہے۔قومی یکجہتی کے اسی تصور کو فروغ دے کر ملک کی سالمیت، اس کے اتحادی ڈھانچے اور اس کی سرحدوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔''

(ہفت روزہ 'الجمعیۃ' نئی دہلی (جمہوریت نمبر) مشمولہ 'قومی یکجہتی میں علمائے دیوبند کا کردار' 27 تا 2 فروری 2017)

شیخ الہند کے ایک دوسرے شاگردِ رشید شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے بھی جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے ملک میں امن و یکجہتی کی روایت کو مزید مستحکم کیا اور آج بھی عملاً یہ سلسلہ جاری ہے۔حضرت مدنی نے اپنی خودنوشت سوانح 'نقش حیات' میں مغل عہد کی رواداری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''آپس میں رشتہ داریاں اور بیاہ شادی جاری کرلی تھی، ہر قسم کے عہدے، وزارتِ عظمٰی اور سپہ سالاری سے لے کر ادنیٰ انتظامی اور فوجی عہدوں تک بلا لحاظ نسل و رنگت اور مذہب و وطنیت حسب قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے رہتے تھے۔انھوں نے ہندوؤں کو مہاراجہ، راجہ، تعلق دار بنایا، بڑی بڑی ریاستیں دیں ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنج ہزاری اور نیچے کے تمام منصب عطا کیے۔''

(نقش حیات جلد اول، دارالاشاعت کراچی (سنہ ندارد) ص: 156)

علامہ سید مناظر احسن گیلانی بھی شیخ الہند کے ایک شاگرد ہیں۔ بہار اسٹیٹ ٹیکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ پٹنہ (1967) کی تیار کردہ کتاب 'انتخاب اردو' (برائے امتحان سکنڈری اسکول، بہار) میں علامہ سید مناظر احسن گیلانی کا ایک مضمون 'بہار اور اس کے علمی تہذیبی اور تمدنی کارنامے' بھی شامل ہے۔ علامہ ہندوستان کے صوبے بہار میں علمی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں فکری و نظری ہل چل بودھ مت یا جین دھرم کے ذریعے سے ہوئی۔کون نہیں جانتا کہ ان دونوں تحریکوں کا استھان یا مرکز بہار ہی تھا۔بہار ہی میں بودھ مت کے ماننے والے نے مشہور تاریخی یونیورسٹی نالندہ قائم کی۔سنسکرت ادبیات میں آئینی و قانونی دستور جو چانکیہ کی طرف منسوب ہے اس کا واضع بھی پاٹلی پترا ہی کا رہنے والا تھا اور ہندوستان کا سرمایہ ناز کارنامہ 'کلیلہ و دمنہ' جس کا ترجمہ تقریباً ہر علمی زبان میں کیا گیا ہے، اس کا مصنف بھی بہار ہی کا رہنے والا تھا۔'' (انتخاب اردو، ص: 122)

اس کے علاوہ بھی علامہ گیلانی نے اس موضوع پر کئی مضامین تحریر کیے ہیں۔ مثلاً: 'اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات'، 'مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام' اور 'ہماری قدیم قومی و وطنی تہذیب' وغیرہ۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اپنے تن من دھن کو لٹانے والے علامہ تاجور نجیب آبادی کو بابائے اردو ثانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔تاجور نے 'اردو مرکز' لاہور (1925) میں قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام 36 جلدوں میں اردو نظم و نثر کا ایک بے مثال انتخاب شائع کیا۔انھوں نے پنجاب میں اردو کی ترویج کے لیے غیر مسلم نوجوانوں پر زیادہ زور صرف کیا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے جن میں ن م راشد، اختر شیرانی، تلوک چند محروم، احسان دانش، موہن سنگھ دیوانہ، شورش کاشمیری، جگن ناتھ آزاد، کرپال سنگھ بیدار وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو زبان کو 'جمہوری' بنانا ہے۔زندگی بھر علامہ تاجور ہندو مسلم اتحاد کے لیے قلمی جہاد کرتے رہے۔اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے امن و امان، ہندوستان کی ترقی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد سے زیادہ ضروری چیز اور کوئی نہیں... ہر فرقے کے اخبارات، اپنی قوم کے غنڈوں کی عیب پوشی بلکہ عیب ستائی پر ایک زبان ہوجاتے ہیں اور اس غلط حمایت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فساد انگیز اور بے کیرکٹر لوگ بڑھ کر 'مولانا' اور 'شریمان' کے خطابوں کی بارش میں لیڈری سنبھال لیتے ہیں۔''

(شاہکار لاہور، اپریل 1935 بحوالہ دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، ص: 140، 141) ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''ہم جو پروگرام پیش کررہے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کو ایسے ہندوستانی قالب میں ڈھالا جائے کہ اس کے چہرے سے ہندوستانیت ٹپکے''۔ (ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور، فروری مارچ 1932 بحوالہ سابق ص: 142، 143)

مولانا حامد الانصاری غازی تقریباً دو دہائیوں تک 'مدینہ' بجنور جیسے انگریزوں کے خلاف صورِ جنگ پھونکنے والے اخبار کے مولانا غازی مدیر رہے۔ ان کے والد مولانا منصور انصاری ملک کی آزادی کی خاطر 33 سال تک جلاوطن رہے اور غریب الدیاری ہی میں کابل میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ یقیناً کردار کے ساتھ ساتھ صحافت کے بھی غازی رہے۔ پوری زندگی ہندو مسلم اتحاد کے لیے عملاً و قلماً جدو جہد کرتے رہے۔ اپنے ایک مضمون 'ہم سب ہندوستانی ہیں' میں لکھتے:

''ہندوستان ہمارا وطن ہے اور ہم سب ہندوستانی ہیں۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ روح کا حقیقی تقاضا ہے۔ تاریخ کے سینے میں بہت سے زخم ہیں مگر ان زخموں کو کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہزار اختلاف ہوسکتے ہیں مگر آج ہم سب اس بات پر متحد ہیں کہ ہم سب ایک ہیں اور ہمارا یہ ایکا وطن کی سرحدوں سے قائم ہے۔ ہندوستان ہماری زندگی کا قلعہ ہے اور یہ قلعہ قومی اتحاد کے فولاد سے تیار ہوا ہے۔'' (بحوالہ اردو صحافت اور علما، سہیل انجم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، (2016) ص: 129)

مولانا سید انظر شاہ کشمیری ایک بے مثال خطیب اور منجھے ہوئے مدرس و محدث کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک عمدہ نثر نگار بھی تھے، یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقعے پر دیوبند میں امن و یکجہتی اور علما کی عظیم قربانیوں پر پر مغز تقریر فرماتے۔انھوں نے مختلف علما، ادبا، شعرا اور سیاستدانوں پر خوبصورت خاکے بھی لکھے ہیں، ان خاکوں میں رام منوہر لوہیا، پنڈت نہرو اور گاندھی جی بھی شامل ہیں۔

شاہ صاحب اپنے ایک صدارتی خطبے میں فرماتے ہیں:

''ضرورت ہے کہ امت کا داعیانہ جذبہ کروٹ لے اور ملت اخلاق و کردار کے زیور سے مرصع ہو۔ کیا آپ نے کبھی بھوکے ہمسایہ ہندو کا پیٹ بھرا؟ پیاسے کی پیاس بجھائی؟ بیمار کی دوا دارو کا بندوبست کیا؟ مرجانے

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اپنے تن من دھن کو لٹانے والے علامہ تاجور نجیب آبادی کو بابائے اردو ثانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔تاجور نے 'اردو مرکز' لاہور (1925) میں قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام 36 جلدوں میں اردو نظم و نثر کا ایک بے مثال انتخاب شائع کیا۔ انھوں نے پنجاب میں اردو کی ترویج کے لیے غیر مسلم نوجوانوں پر زیادہ زور صرف کیا۔

والے ہندو کے پسماندگان سے تعزیت کی؟ ان کے دکھ سکھ کے ساتھی بنے... برادرانِ وطن کے ساتھ رواداری، فراخ دلی، اعلیٰ ظرفی، ہم آہنگی، باہمی میل جول اور امن و شانتی کے ساتھ رہنے سہنے، زندگی گزارنے کی عادت ڈالیے۔'' (گزارشات بر حقائق و واقعات بموقع دو روزہ کانفرنس مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کان پور، مولانا انظر شاہ کشمیری، ص: 14، 15)

دیوبند کے ادبی منظر نامہ پر ایک چمکتا اور خوب صورت نام حقانی القاسمی کا بھی ہے۔ ادبی صحافت کا بھی طویل تجربہ انھیں حاصل ہے۔ ان کی ہر کتاب اور ہر تحریر ادب کا ایک نیا جزیہ ہوتا ہے۔ادب کی جمہوری قدروں کا استحکام ان کا وظیفہ روز و شب ہے۔ کتاب 'لاتخف' میں شامل اپنے ایک مضمون: 'ادب، امن اور احتجاج' میں ادب اور امن کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے حقانی القاسمی رقم طراز ہیں:

''امن، کائنات کا تجملی عنصر ہے۔ انسانی وجود کا اساسی معروض امن ہے۔ دنیا کے بیشتر مذاہب کا ارتکاز ہیومنزم، عدم تشدد، اہنسا، امن پر رہا ہے۔امن کائنات کی انرجی، توانائی ہے۔اس کے بغیر کائنات ایک خرابہ ہے۔

گوتم سے گاندھی تک، دنیا کے تمام دانشوروں نے انسانیت، اخوت، مفاہمت، تکریم پر ہی زور دیا ہے کہ ایک غیر منقسم کُل کی تشکیل اس کے بغیر ممکن نہیں۔

امن، مفاہمت سے ہی ایک جمیل وجلیل کائنات کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ فاتحین عالم بھی امن کی قوت سے آگاہ رہے ہیں اور انھوں نے امن عالم کے لیے جنگ وجدل کا طریق ترک کرکے مفاہمت کی راہ چنی۔ اشوکا نے بے شمار جنگیں لڑیں مگر کالنگا کی لڑائی میں انسانی وجود کے لہو نے اس کی آنکھیں نم کر دیں اور بالآخر اس نے اس جنگ کا کفارہ یوں ادا کیا کہ جنگ بندی کی پالیسی کا اپنی مملکت میں نفاذ کیا اور جنگ کی نفسیاتی جڑوں کی تلاش کرتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ مذاہب اور عقائد کے مابین برتری اور بالادستی کا جذبہ ہی جنگ کا سبب ہے۔ اشوکا نے پر امن اشتراک اور بین مذاہب مفاہمت پر زور دیا ہے اور مختلف ثقافتی، مذہبی تناظرات کو تجربوں کے تنوع اور تکثیریت سے تعبیر کیا۔ یہی تکثیریت تصادم کی وجہ تھی مگر بنیادی طور پر اس تکثیریت میں انسانی وحدت کا رمز بھی مضمر ہے اور کائنات کی تابانی، درخشانی کا انحصار اسی تکثیری وحدت پر ہے۔''

آگے حقانی القاسمی انصاف پسند ادیبوں کے قلمی جہاد کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبدوں سے احتجاج بھی آج کے سفاک، بے حس دور میں کسی جہاد سے کم نہیں ہے۔ یہ احتجاج جاری ہے اور شاید ابد تک جاری رہے یا اس وقت تک جب تک کائنات میں ایک بھی باضمیر انسان زندہ ہے۔''

(لاتخف، 'ادب، امن اور احتجاج'...(...)ص:17 تا 19)

معروف صحافی و ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر ماہنامہ 'طیب' دیوبند کے ایک اداریے میں جمہوریت، جس کی بنیاد دراصل قومی یکجہتی ہی پر منحصر ہے، کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''صحیح جمہوریت یہ ہے کہ ہم اس کا عہد کریں کہ کسی کی دل آزاری نہیں ہوگی، کسی کا حق غصب نہیں ہوگا، کسی کو اس کے حقوق سے محروم نہیں کریں گے اور اس ہندوستان کو ایک ایسا مثالی ملک بنائیں گے جس میں واقعی اور حقیقی معنی میں تمام تہذیبوں، تمام فرقوں، تمام مذاہب کے ماننے والوں کو زندہ رہنے اور اپنے تشخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے مواقع اور حقوق حاصل ہوں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب اور جس دن ہر ہندوستانی نے اس تصور کو اپنی عملی زندگی میں جاری کر لیا اسی دن یہ جمہوریت اور زیادہ طاقتور ہوکر اور زیادہ پرکشش اور دلکش ہوکر ہمارے سامنے آئے گی اور اس وقت ہمیں اندازہ ہوگا کہ جمہوریت کا صحیح لطف کیا ہے۔''

(ہفت روزہ 'دیوبند ٹائمز' دیوبند، یکم فروری 1987)

ایک اچھے صحافی کے بطور اعجاز ارشد قاسمی کی پہچان رہی ہے اور اس وقت سے انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا جب علما کا اس طرف رجحان آج کے مقابلے میں کم تھا۔ حالیہ دنوں میں ان کی ایک نئی کتاب 'علمائے دیوبند کی اردو شاعری' منظر عام پر آئی ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی قومی یکجہتی کے عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون 'قومی یکجہتی ماضی اور حال کے تناظر میں' میں انھوں نے لکھا:

''یہ گلشن ہند ہمیشہ سے پیار، محبت، امن و سلامتی، مروت و بھائی چارگی، اتحاد و اخوت اور رواداری کی زندہ مثال رہا ہے۔ تاریخ کی جب ہم ورق گردانی کرتے ہیں تو بجا طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ فخر صرف اسی سرزمین کو حاصل ہے کہ یہاں مختلف مذاہب اور کلچر و ثقافت کے لوگ شیر و شکر کی طرح گھل مل کر رہے ہیں۔ آخر یہی تو وجہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبال نے مادر وطن کی محبت کے حسین جذبے سے سرشار ہوکر 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کہا ہے جو محض ایک حسین تخیل ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی روایت کی تصدیق بھی ہے''۔

(ماہنامہ 'یوجنا' نئی دہلی، دسمبر 1999)

نثری جائزے کے بعد اب دیوبند کی شعری تخلیقات میں قومی یکجہتی کے عناصر کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ قبل اس سے کہ اس نکتے پر گفتگو کی جائے، دیوبند کی اردو شاعری کے رنگ، ڈھنگ اور مزاج و منہاج کا پتہ لگایا جانا ضروری ہے۔ دیوبند کبھی بھی شاعری برائے شاعری کا قائل نہیں رہا۔ اس نے زیادہ تر مقصدی اور تعمیری شاعری کی ہے، مقصدی سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس نے فن شاعری اور اس کے اصول وضابطے سے روگردانی کی ہے۔ دیوبند کا اپنا ایک مستقل لسانی اور ثقافتی نظام ہے جو کم و بیش ہر مقام پر شعر و نثر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بقول حقانی القاسمی ''دیوبند کا اپنا ایک الگ ثقافتی اور لسانی نظام ہے۔ یہ عربی فارسی کا ممزوجہ ہے۔ کلاسیکی شعریات سے دیوبند کا رشتہ گہرا ہے، مگر جدید شعریات سے منحرف بھی نہیں۔ دیوبند کی تخلیق کا رنگ و نور بالکل الگ ہے اور ان کے الفاظ کی جدلیاتی منطق بھی جداگانہ ہے۔ دیوبند کے ثقافتی لسانی اور شعری نظام کی تفہیم کے بغیر دیوبند کی تخلیقی حسیت کا ادراک یا اس کی تعیین قدر ممکن نہیں ہے۔''

(دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ،
حقانی القاسمی، آل انڈیا تنظیم
علمائے حق نئی دہلی
(2006)ص:50)

دیوبند کی شاعری کا حاوی حصہ نظموں پر مشتمل ہے تاہم غزلیہ شاعری کی مقدار بھی کچھ کم نہیں۔ یہاں کے خوشہ چینوں نے شعر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، نظم، قطعہ، رباعی اور نعت ومنقبت ہر ایک کے گیسو کو سنوارنے کا کام کیا ہے۔ یہاں کی شاعری کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا رشتہ عوام سے گہرا ہے۔ دیوبند ادب میں کسی خاص اسکول کا قائل نہیں ہے تاہم کہیں سے مفید و تعمیری عنصر لینے اور استفادے سے اسے عار بھی نہیں۔ سماجی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس کا ڈانڈا ترقی پسندی سے ضرور ملتا ہے لیکن اسے تقلید کی بجائے توارد کا نام دینا زیادہ صحیح ہے۔ ویسے بھی دیوبند تحریک کا جنم ترقی پسند تحریک سے ستر سال پہلے ہو چکا تھا۔ دیوبند کے اسی رنگِ شاعری کو بتاتے ہوئے حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

''دیوبند کی پوری شاعری، عوام اساس ہے اور شعری مزاج ترقی پسندوں سے ملتا جلتا کہ دیوبند کی تخلیق میں نو آبادیاتی ذہن، استحصالی قوت جبر و جارحیت کے خلاف ردِّعمل ملتا ہے۔...دیوبند کی تخلیق میں ترقی پسندانہ دانش نمایاں ہے اور ان کی تخلیق میں ضبط و تمکین بھی ہے۔''

(دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، حقانی القاسمی، ص: 51)

لطف کی بات یہ ہے دیوبند کے بانی سے لے کر آج تک اس کے جتنے بھی ممتاز اور نمایاں اور مختلف میدانوں کے ماہر علماء وفضلاء گزرے ہیں یا موجود ہیں، سب کے اندر شعری ذوق پایا جاتا تھا اور پایا جاتا ہے۔ میری محدود معلومات کے مطابق فضلائے دیوبند میں چالیس ایسے شعراء ہیں جو یا تو صاحب دیوان یا صاحب مجموعہ ہیں۔ ان میں بھی ایک درجن شعراء ایسے بھی ہیں جنھیں استاذ شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ ناطق گلاؤٹھوی، تاجور نجیب آبادی، زبیر راہی قاسمی، فرحت قادری، کاشف الہاشمی، ریاست علی ظفر، صادق علی بستوی، ظفر جنک پوری اور شاہین جمالی وغیرہ کے نام انتہائی نمایاں اور روشن ہیں۔ جن شعراء تک راقم کی رسائی ممکن ہو سکی ان کے کلام میں قومی یکجہتی کی روشنی ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کی جا رہی ہے۔

قاری احسان محسن ایک نابینا نعت گو شاعر ہیں، انھوں نے غزل، حمد و مناجات، قطعات و رباعیات اور قصیدہ و مرثیے بھی کہے ہیں اور خوب کہے ہیں لیکن ان کی شعری شناخت نعت گوئی ہے اور وہ بھی سوز و گداز اور درد بھرے ترنم کے ساتھ۔ ایک نظم 'نغمۂ وطن' میں وہ اپنے جذبۂ وطنیت کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

ہمارا ملک ہمیں جان و تن سے پیارا ہے
ہر ایک گوشہ وطن کا، جگر کا پارا ہے
کوئی ہو مسلم و ہندو کہ سکھ کہ عیسائی
ہیں بھائی بھائی یہی قومیت کا دھارا ہے
ہمالیہ ہے یہاں اور رودِ گنگ و جمن
کہیں پہ تاج محل ہے، کہیں منارا ہے
یہاں پہ مسجد و مندر، کلیسا اور گرجا
ہر اک مقام سے وحدت ہی آشکارا ہے

(نقوشِ محسن، احسان محسن قاسمی، مسعود پبلشنگ ہاؤس دیوبند (2004) طبع چہارم، ص: 191)

ان اشعار میں حب وطن بھی ہے، قومی یکجہتی بھی، بھائی چارہ اور ہندوستانی تہذیب کا خوبصورت نظارہ بھی۔

مولانا احمد سجاد ساجد قاسمی پیشے سے ٹیچر ہیں اور شعر وادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'غبارِ شوق' زیرِ طبع ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے متعلق ایک نظم سے چند اشعار پیش ہیں:

یہ امن و اماں کا گہوارا، پھیلی ہے فضا میں بوئے وفا
یہ دیس ہے چشتی گاندھی کا، یہ دیس ہے صوفی سنتوں کا
ہے صبح بنارس، شامِ اودھ، فردوسِ نظر کشمیر یہاں
نانک کا وطن، تلسی کی زمیں، پیدا ہوئے غالب میر یہاں
مندر، مسجد، گرجے، اس کے، کیا خوب حسیں شہ پارے ہیں
ہر دھرم یہاں، تہذیب یہاں، ہر سمت یہاں گردوارے ہیں

دیوبند کی پوری شاعری، عوام اساس ہے اور شعری مزاج ترقی پسندوں سے ملتا جلتا کہ دیوبند کی تخلیق میں نو آبادیاتی ذہن، استحصالی قوت جبر و جارحیت کے خلاف ردِّ عمل ملتا ہے۔ ... دیوبند کی تخلیق میں ترقی پسندانہ دانش نمایاں ہے اور ان کی تخلیق میں ضبط و تمکین بھی ہے۔

ان اشعار میں ساجد قاسمی کے جذبۂ قوم و وطن کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

علامہ قمر عثمانی کا ایک مختصر سا مجموعہ 'جاوداں' ہے لیکن انتہائی مضبوط شاعری کا نمونہ ہے۔ زیادہ تر غزلیں ہیں اور کچھ نظمیں۔ نغمۂ وطن سے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

تہذیب کا مسکن ہے، اہنسا کا پجاری
اک حسن ہے کشمیر سے تا راس کماری
اک ایک ادا اس کی دل و جان سے پیاری
الفت کا چمن زار ہے گہوارۂ فن ہے
یہ میرا وطن، میرا وطن، میرا وطن ہے

(جاوداں، علامہ قمر عثمانی، مکتبہ الجامعہ دیوبند، 'نغمۂ وطن' (2013) ص: 97-98)

علامہ ظفر جنک پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن حمد و نعت اور نظم میں بھی ان کی کوشش قابل ذکر ہے۔ ان کے مجموعے 'صدائے دل' کے حصۂ منظومات میں بیشتر کا موضوع حب وطن، بھائی چارہ اور قومی یکجہتی ہے۔ ان کے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر دل سے مٹا دیجیے، اب گردِ کدورت کو
ہر دل میں محبت کی اک شمع جلا دیجیے

(صدائے دل، علامہ ظفر جنک پوری، ادارہ عزیز العلوم تحفیظ القرآن نئی دہلی (2010) ص: 152)

شعارِ زیست ہے، شیرازہ بندی
مکمل ہے یہی ساماں ہمارا
مٹیں گے ہم ظفر قوم و وطن پہ
ہے قومی ایکتا عنواں ہمارا
یہاں جینے کا حق ہے ہر بشر کو
ہو عیسائی کہ سکھ، ہندو مسلماں
سکوں سب کو میسر ہو وطن میں
وطن سب کے لیے ہو خلد ارماں

(صدائے دل: قومی یکجہتی، ص: 169)

عامر عثمانی کے چھوٹے بھائی عمر فاروق عاصم عثمانی کا بھی اردو شاعری سے رشتہ استوار تھا اور اچھی شاعری کی۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں تاہم حمد وقطعات اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ ایک نظم 'تاریخ کے جھروکوں سے' کے چند اشعار پیش ہیں:

سو ظلم سہے، جان بھی دی مال بھی چھوڑا
پر نعرہ ''جے ہند' لگاتے رہے ہم لوگ
آزادی کا ہر دیپ بجھاتا رہا دشمن
ہر دیپ سے اک دیپ جلاتے رہے ہم لوگ
دل جس سے تڑپ جاتا ہے، بھر آتی ہیں آنکھیں
وہ درد بھرے گیت بھی گاتے رہے ہم لوگ

(میرے بعد، تاریخ کے جھروکوں سے، عظیم بک ڈپو دیوبند (2009) ص 302)

دیوبند کے استاذ شاعروں میں مولانا کاشف الہاشمی کا نام انتہائی ممتاز ہے۔ وہ اقبال کے ہم دوش تو نہیں تھے تاہم انھوں نے اقبال کی لفظیات کے ساتھ ساتھ اقبال کی فکری روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی جس قدر سعی کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی: ''مولانا کے ان اشعار میں اقبال کے کلام کی روح نظر آتی ہے''۔ (کلیات کاشف، ص: 59) کاشف الہاشمی نے حمد ونعت، منقبت، مرثیہ اور رباعیات کے ساتھ نظم اور غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے تاہم وہ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی ایک رباعی چشم بصیرت کی نذر کی جاتی ہے:

آزادیٔ انساں کے مددگار بنو
صحت کے لیے فکر کے بیمار بنو
مظلوم کی امداد کو، بھولو نہ کبھی
بھارت کے سپوتو ذرا ہشیار بنو

(کلیاتِ کاشف، مکتبہ مجلس قاسم المعارف دیوبند، (2016) ص: 291)

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی ایک جید عالمِ دین اور فقیہ، ہونے کے ساتھ ایک خوبصورت لب و لہجے کے غزل گو شاعر بھی تھے۔ انھوں نے کئی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزلوں ہی سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ ان کی نظم 'یوم جمہوریہ کا پیغام' سے چندہ اشعار پیش ہیں۔

ہندو مسلم کی یہ تفریق کے منظر کیسے
حریت میں تو لہو سب کا ہوا ہے شامل
متحد ہو کے سبھی لوگوں نے جانیں دی ہیں
موجِ افرنگ سے ٹکرا کے ملا ہے ساحل

(کلیاتِ نشاط، کفیل الرحمٰن نشاط، 'یوم جمہوریہ کا پیغام' نشاط پبلی کیشنز دیوبند (2013) ص: 240)

مولانا کفیل احمد علوی ایک معروف صحافی اور شاعر ہیں۔ ایک مدت تک پندرہ روزہ 'آئینۂ دارالعلوم' دیوبند کے مدیر اور ایک عرصے تک دارالعلوم دیوبند کے شعبہ صحافت 'شیخ الہند اکیڈمی' کے نگراں رہے۔ وہ انتہائی سادہ مزاج و سادہ لباس تھے لیکن ان کی شاعری داد کے قابل ہے۔ ان کے مجموعے 'شوق منزل' کا بیشتر حصہ نظموں پر محیط ہے۔ ان کی نظم 'یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے' سے چند اشعار

یہ انسانیت کا، شرافت کا حامی
یہ نفرت کا دشمن، محبت کا حامی
یہ امن و سکوں کا، صداقت کا حامی
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے
کوئی اس طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے
قدم جارحانہ بڑھا کر نہ دیکھے
میرے حوصلے آزما کر نہ دیکھے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے

(شوق منزل، کفیل احمد علوی، آستانہ بک ڈپو دہلی، 'یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے' (2014) ص: 70)

استاد شاعر علامہ سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی دیوبند کے قدیم فضلا میں ہیں۔ داغ کی شاگردی بھی انھیں حاصل ہے۔ دیوان غالب کی شرح 'کنز المطالب' کے نام سے تحریر کی۔ بحیثیت غزل گو شاعر ان کی شناخت ہے۔ ان کی نظم 'ترانۂ وطن' سے چند منتخب اشعار:

ہم جاں نثار اس کے، یہ مہرباں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں، ہندوستاں ہمارا
ہیں دل فریب منظر، پہلو میں نربدا کے
روح رواں ہے گنگا، آبِ رواں ہمارا
ہندو ہیں اور مسلماں، عیسائی، پارسی، سکھ
مل جل کے ہم سفر ہے یہ کارواں ہمارا
یہ سادھوؤں کی بستی، یہ صوفیوں کی بستی
کردار ہے تقدس، ناطق یہاں ہمارا

(دیوان ناطق، ناطق گلاؤٹھوی، 'ترانۂ وطن' ناشر و مرتب: محمد عبدالعلیم، ناگپور (1976) ص: 16)

فرحت قادری کی غزلیہ شاعری ان کی پہچان ہے، ان کے کئی مجموعے منصۂ شہود پر آئے اور خراج تحسین وصول کیا۔ دراصل ان کا میدانِ شاعری غزل ہے تاہم نظموں کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی نظموں کی بنیادی جذبہ حب الوطنی ہے۔ چونکہ ان کی اکیاون قومی نظموں کا باضابطہ ایک مجموعہ 'زمین ہند' موجود ہے اس لیے اسی مجموعے سے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ فرحت قادری صاحب کا خیال ہے کہ وطن اور اہلِ وطن کا تعلق ماں اور بچے کا سا ہے۔ انھوں نے خود کو 1942 کا ننھا مجاہد کہا ہے، اس وقت وہ دیوبند میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں دیوبند میں انگریزوں کے خلاف روزانہ جلسے جلوس منعقد ہوتے اور قادری صاحب بچوں کی قیادت فرماتے، اسی ماحول نے ان کے اندر قومی جذبہ بیدار کیا اور یہیں سے ان کی شاعری کی کونپل پھوٹی۔ بقول خود قادری صاحب: ''میری شاعری کی ابتدا بھی انھیں دنوں ہوئی اور قومی نظموں ہی سے ہوئی۔''

(زمین ہند، فرحت قادری، مکتبہ غوثیہ کریم گنج گیا، (1993) ص: 19)

فرحت قادری کے اندر جذبہ حب الوطنی اور وطن کے لیے کس قدر تڑپ تھی؟ اس پر علامہ ابراحسنی لکھتے ہیں:

''فرحت اصلاً غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے جذبۂ حب الوطنی نے ان کو نظمیں کہنے پر مجبور کیا ہے۔ شاعر جب قوم و وطن کو قابل اطمنان حالت میں نہیں پاتا تو اس کا دل تڑپ جاتا ہے اور ہر تڑپ، درد، خلوص اور جذبۂ سرفروشی میں ڈوبی ہوئی ایک نظم بن جاتی ہے۔ آپ فرحت کی ان نظموں کو پڑھیے آپ ضرور میرے ہم نوا ہوں گے اور اس خلوص، وفا اور قومی درد کو ضرور اپنے دل میں محسوس کریں گے جو فرحت کے دل نے محسوس کر کے اسے شعری جامہ پہنایا ہے۔'' (زمین ہند، ص: 11)

اب ان کی شاہکار اور طویل نظم 'زمین ہند' سے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ زمیں وید کی، پوران کی، گیتا کی زمیں
یہ زمیں رام کی، گوپال کی، سیتا کی زمیں
اس کی عظمت کو بچالیں تو غزل بھی چھیڑیں
بھکشوؤں، رشیوں کی، کاماؤں کی پیروں کی زمیں
مرشدوں، ولیوں، بزرگوں کی فقیروں کی زمیں
اس کو سینے سے لگالیں تو غزل بھی چھیڑیں
کاشی و متھرا کی، اجمیر کی کلیر کی زمیں
لکھنؤ، دہلی کی، چتوڑ کی، الور کی زمیں
اس کا رنگ اور جمالیں تو غزل بھی چھیڑیں
یہ ظفر شاہ و بھگت سنگھ کی، ٹیپو کی زمیں
سکھ مسلمان کی، عیسائی کی، ہندو کی زمیں
آنکھ سے اس کو لگالیں تو غزل بھی چھیڑیں
غالب و میر کے اشعار کی خوشبو اس میں
پریم و اقبال کا، ٹیگور کا جادو اس میں
اس کی شان اور بڑھالیں تو غزل بھی چھیڑیں
یہ نمازوں کی زمیں اور یہ پوجا کی زمیں
شانتی کی یہ زمیں اور اہنسا کی زمیں
اس کو اور اونچا اٹھالیں تو غزل بھی چھیڑیں

(زمین ہند، ص: 60،59)

ان اشعار کا ایک ایک نقطہ امن، شانتی، قومی ایکتا و یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہے۔ یہاں پر شاعر کے نزدیک لفظ غزل امن کا استعارہ ہے۔

یہ اور اس طرح کے درجنوں دیوبند اسکول کے شعرا و ادبا ہیں جن کی نظم و نثر میں ملک کی تعمیر و ترقی، امن و یکجہتی، بھائی چارہ اور اتحاد و اتفاق کی روشن تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں۔

■

Farooq Azam Qasmi
160, Periyar Hostel JNU
New Delhi- 110067
faqasmijnu@gmail.com/9718921072

اردو کی نئی بستیوں کے کچھ نمائندہ افسانہ نگار

محمد رکن الدین

برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ اردو جہاں جہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے، ان ممالک کو اردو کی نئی بستیوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برصغیر کے مختلف علاقوں میں اردو کی قدیم بستیاں سیکڑوں برس سے موجود ہیں۔ یہاں کے باشندے تلاش معاش کے لیے نقل مکانی کے عمل سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ یہی نقل مکانی ان نئی بستیوں کی موجد ہیں جہاں وہ اپنی زبان و تہذیب کے ساتھ آباد ہوتے گئے۔ اردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان بستیوں میں آباد لوگوں نے ابلاغ و ترسیل کے علاوہ اپنی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی مادری یا علاقائی زبان کا استعمال کیا۔ چنانچہ ان ممالک میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہوگئیں۔ مختلف ملکوں میں اردو کی نئی بستیاں توانا اور مستحکم بن کر ابھر رہی ہیں اور ان ممالک کے لوگوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کر رہی ہیں جو ایک خوش آئند اور اردو کے تابناک مستقبل کی ضامن ہے۔

اردو کی نئی بستیوں میں شعری اصناف کے بعد جن اصناف پر سب سے زیادہ خامہ فرسائی ہوئی وہ فکشن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند دہائیوں سے افسانہ نگاروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ برطانیہ، جرمنی، ناروے، سوئیڈن، ڈنمارک، امریکہ، کینڈا، آسٹریلیا، ماریشس، مصر، ترکی، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین، عمان اور کویت میں اردو فکشن باضابطہ طور پر نہ صرف تخلیق کیے جا رہے ہیں بلکہ ان کی ادبی حیثیت بھی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ ایران، جاپان، ترکی، سوئزرلینڈ، چین، ازبکستان، آذربائیجان، انڈونیشیا، بلجیم وغیرہ کی دانش گاہوں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے اور تصنیف و تراجم کے ذریعے اردو پر کام ہو رہے ہیں۔ ان ممالک میں مقیم زیادہ تر لوگوں کا ذریعۂ معاش اردو نہیں ہے۔ بلکہ وہ ڈاکٹر، انجینئر، کاروباری اور دیگر پیشے سے وابستہ ہیں لیکن مادری زبان سے محبت، لگاؤ اور ایک تہذیبی تعلق نے دیار غیر میں بھی ایک بستی آباد کر دیا ہے۔ ان ممالک میں لوگ اردو زبان میں اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ بے شمار ادبا و شعرا ہمیشہ اخبارات، رسائل اور کتابوں کی شکل میں ہمیں اردو زبان و ادب کا گلدستہ پیش کرتے رہتے ہیں جو اردو کی مقبولیت اور توانائی کی دلیل ہے۔

جہاں تک ہجرت سے متعلق سوالات ہیں تو ان کے لیے یہ پہلو زیادہ مناسب ہوگا کہ ہجرت کا عمل بذات خود تکلیف دہ عمل ہے۔ ہجرت صرف ایک خارجی عمل نہیں بلکہ داخلی عمل بھی ہے۔ اس سے انسانی وجود متاثر ہوتا ہے۔ وہاں کے رنگ و آہنگ میں خود کو ڈھالنا یا خود وہاں کے رنگ و آہنگ میں مست ہو جانا۔ اس عمل میں انسان بہت کچھ حاصل کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بہت کچھ کھو بھی دیتا ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد زاہد کے قول سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تارکین وطن کے لیے ہجرت محض ایک خارجی عمل نہیں۔ اس کے اثرات ان کے پورے وجود پر پڑتے ہیں۔ یہ نامانوس صورت حال کو اپنے رنگ و آہنگ میں ڈھال لینے یا خود کو اس میں ڈھل جانے کا سبب بنتی ہے۔ اس عمل میں انسان کچھ کھوتا ہے اور کچھ پاتا ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والی نقل مکانی ایک سیاسی جبر تھا، اس میں تہذیبی اجنبیت کم تھی۔ تلاش معاش میں نکلنے والے لوگ اپنی زندگی کو آسودہ بنانے کی غرض سے نکلے تھے۔ ان کی وطن واپسی کے امکانات کم تھے۔ یہ معاشی ہجرت معاشرتی ہجرت بھی ثابت ہوئی۔ یہاں اجنبیت اور غیریت کے تجربے زیادہ شدید تھے۔ اس کے ساتھ نیا ماحول، نیا رنگ ڈھنگ، نئے رسوم، نئی زبان وغیرہ کے معاملے تھے اور ان کا نباہ کرنا تھا۔ وقت نے آنے والوں کو مطابقت کرنا سکھا دیا۔ تارکین کی پہلی نسل کو شروع میں پریشانی ہوئی مگر دوسری نسل کے لیے نسبتاً سہل اور تیسری نسل کے لیے آزادی کا پروانہ ثابت ہوئی۔''

(محمد زاہد، ڈاکٹر، اردو کی نئی بستیوں کے افسانے۔ جائزہ و انتخاب، ہمارا چمن پبلی کیشنز، مٹیابرج، کلکتہ، 2016، ص 14)

ذیل میں چند اہم بستیوں اور وہاں کے نمائندہ تخلیق کاروں پر سرسری روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

اردو کی نئی بستیوں میں سب سے اہم اور قدیم بستی برطانیہ ہے۔ برطانیہ اور ہندوستان کے مابین آمد و رفت کا سلسلہ ہندوستان میں کمپنی کے استحکام سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ 1804 میں گل کرسٹ ہندوستان سے لندن واپس ہو گیا۔ لندن واپسی پر اردو تدریس کے لیے ایک کالج قائم کیا جو کہ لیسٹر اسکوائر میں واقع تھا۔ اس کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جو انگریز ملازمت کی غرض سے ہندوستان آئیں انھیں اردو زبان کی تعلیم دی جائے۔ 1857 کے بعد جب ہندوستان کے طول و عرض پر انگریزی سامراج کا تسلط ہو گیا تو اس کے بعد انگلستان میں تعلیم اور سیر و تفریح کے لیے ہندوستانی آنے لگے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں اردو زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ سول سروس کے امتحان کا مرکز ہونے کی وجہ سے طالب علموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ 1930 میں لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں سے اردو درس و تدریس کا کام لیا جانے لگا۔ جس سے اردو زبان و ادب کے تئیں انگریزوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ آزادی کے بعد ہند و پاک سے کثیر تعداد میں لوگ یہاں آتے جاتے رہے۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ سے پہلی مرتبہ محمود ہاشمی نے 1961 میں ہفت روزہ 'مشرق' نکالا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک متعدد روزنامے، ہفتہ وار ماہنامے اور سہ ماہی رسالے نکل رہے ہیں۔ یہاں بڑی تعداد میں ادبی ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں جو ادبی و شعری اجتماع کرتے رہتے ہیں۔ وہاں موجود اردو کے قلم کار اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت سے کچھ وقت نکال کر اردو زبان و ادب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ برطانیہ میں مندرجہ ذیل افسانہ نگاروں نے اب تک اپنی تخلیقات پیش کی ہیں:

جتندر بلو، مقصود الٰہی شیخ، فیروزہ جعفر، عطیہ خان، گلشن کھنہ، امجد مرزا، انور نسرین، خالد یوسف، نجمہ عثمان، فہیم اختر، محسنہ جیلانی، طلعت سلیم، صفیہ صدیقی، ایم

صدیقہ تبسم، سلطانہ مہر، بانو ارشد، مصطفیٰ کریم، ستارہ لطیف خانم، آغا محمد سعید، عمران مشتاق، احمد سعید انور، یعقوب مرزا، حمیدہ معین رضوی، شاہد احمد وغیرہ۔

جتندر بلو کا اصل نام دیولانبہ ہے۔ انھوں نے پشاور میں آنکھیں کھولی، دہلی میں بچپن کا لطف اٹھایا، بمبئی میں مختلف جگہوں پر ملازمت کی اور پھر لندن میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کو اپنی تہذیبی روایات سے بے حد لگاؤ ہے۔ جتندر بلو کے تین ناول اور چھ افسانوی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں اور 'آخری پڑاؤ' زیر طبع ہے۔ ان کا پہلا ناول 'پرائی دھرتی اپنے لوگ' 1977 میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ناول 'مہاتگر' 1990 میں شائع ہوا۔ تیسرا ناول 'وشواس گھات' ہے جو 2003 میں شائع ہوا تھا۔ افسانوی مجموعے 'پہچان کی نوک' (1986)، جزیرہ (1994)، نئے دیس میں (1998)، انجانا کھیل (2001)، چکر (2007)، درد کی حد سے پرے (2009)' شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ تمام تخلیقی جواہر نے موصوف کو شہرت دوام بخشی۔ ان تمام تخلیقات میں تخلیق کار اپنی نگاہ سے کائنات کی سیر کرتا ہے۔ اس سیر و تفریح میں تفنن قلب سے زیادہ کائنات کے مسائل کا انبار ہے۔ اس انبار کو کرداروں کا لبادہ پہنا کر آس پاس کی گندگی کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان کا ایک مشہور افسانہ 'آخری پڑاؤ' ہے۔

'آخری پڑاؤ' کہانی میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا ٹکراؤ ہے۔ سرجو جو کہ اب سرلیش ہے ضعیف اور بیمار باپ کے لیے خود سے کئی بار لڑتا ہے۔ کبھی بیوی اور بچوں کا پیار ذہنی سکون میں مخل ہوتا ہے تو کبھی باپ کی کمزوری اور بیماری سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ ضعف و کمزوری سے نڈھال باپ اسی سرجو کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور ہمہ وقت اسی کوشش میں رہتا ہے کہ اسے وہی سرجو مل جائے

جو بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ اس کہانی کا آخری اقتباس دیکھیے:

''سرجو! میرے بیٹے... میں اپنا کل اثاثہ تمہارے نام چھوڑے جا رہا ہوں... بیٹی ڈالی پبلک اسکول میں ہی تعلیم پائے گی ایک بات اور... کل صبح گیارہ بج کر دو منٹ پر میں اس جہاں میں نہیں رہوں گا۔ تم دوپہر میں پہلا جہاز پکڑ کر زورک چلے آنا۔''

''میری ڈینڈ باڈی Dead Dody لندن لا کر میرا اتم سنسکار اپنی برادری میں شان دار طریقے سے کرنا اور سب کو کھانا بھی مندر میں کھلا دینا... ڈالی اور ببلو سے کہنا کہ گرینڈ پا ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ فیونرز میں ایک دو منٹ میرے بارے میں ضرور بولیں۔''

(امجد مرزا امجد، برطانیہ کے ادبی مشاہیر، 36، ہیزل وڈ روڈ، والتھم سٹو، لندن، برطانیہ۔ ص 146)

مغربی سماج کا بھی عجیب رکھ رکھاؤ ہے۔ ایک کمزور باپ چند مہینے بیٹے کے یہاں اس حالت میں بھی قیام کرنے سے گھبرا رہا ہے۔ حالاں کہ مشرقی سماج میں اس طرح کے واقعات شاید ہی نظر آتے ہیں۔ مشرق خاص طور پر برصغیر کے سماج میں، سماجی تانا بانا کے لیے ہر ایک کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ انسانی سماج متعدد اکائیوں سے ہی بنتا ہے۔ برصغیر میں ایک گھر اور ایک خاندان کا تصور صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ مشرقی سماج میں بوڑھے ماں باپ کے لیے بچے سہارا ہوتے ہیں، اسی مشرقی سماج کے پروردہ انسان مغرب میں اپنی تہذیب اور روایت کا جنازہ نکالتے نظر آتے ہیں۔ جتندر بلو اس سماج سے سخت نالاں نظر آتے ہیں۔ گو کہ مغرب میں سماج کا تصور مشرق سے مختلف ہے لیکن مشرقی لوگ کب تک اس سماج کی پیروی میں آبا و اجداد کی روایات سے روگردانی کرتے رہیں گے۔ جتندر بلو اپنی کہانیوں کے ذریعے ان نکات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں۔ جو صحیح معنوں میں ہم سب کے لیے درس عبرت ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کا وطن گجرات مقصود الٰہی شیخ کی ایک منفرد شناخت ہفت روزہ 'راوی' سے ہوتی ہے اور دوسری شناخت ان کی افسانہ نگاری سے ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے چھ مجموعے 'پتھر کا جگر' (1966) 'برف کے آنسو' (1975) 'جھوٹ بولتی آنکھیں' (1992) 'دل ایک بند کلی' (1994) ناولٹ، 'پلوں کے نیچے بہتا پانی'، 'فریب تماشا' کے نام سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کا شمار اردو کی نئی بستیوں کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ عرصۂ دراز سے برطانیہ میں مقیم ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی زبان اور تہذیب سے وابستہ ہیں یہی وجہ ہے کہ وطن کی مٹی کی خوشبو انھیں بار بار اپنے وطن کی

گلیوں میں کھینچ لاتی ہے۔ وطن سے محبت کا یہ جذبہ ان کے یہاں ناسٹلجیائی صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ تعمیری انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کی تخلیقی شخصیت کی مختلف جہات ہیں جن میں سے ایک جہت افسانہ نگاری ہے۔ یہاں تمام افسانوں پر فرداً فرداً ذکر کرنا ممکن نہیں۔ ان کا ایک مشہور و معروف افسانہ 'پتھر نہیں مرتے' کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کہانی کا ایک ایک لفظ اکیسویں صدی کی بربریت، وحشی، ظالم اور انسانیت کے لیے خطرہ ممالک کی نشاندہی کر رہا ہے۔ جس کا مقصد دنیا سے اطمینان و سکون ختم کر کے پوری دنیا میں بے اطمینانی پیدا کرنا ہے۔ اس جنگ میں انسان کی ذاتی، ملکی، مسلکی، عائلی، سیاسی، مذہبی افراط و تفریط کا اصل امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس قدر انسانیت کا خیال رکھتا ہے۔ 'پتھر نہیں مرتے' جیسی کہانی میں گم شدہ بچی کا ذکر کبھی شام، کبھی فلسطین، کبھی یمن اور اسی طرح ظلم و ستم کے شکار ممالک کے لیے ہمیشہ انسانیت سوز مسائل پیدا کرتے رہیں گے۔ ہم نہ سہی کوئی اور اس ظلم و ستم کے شکار ہوتے رہیں گے۔ اس افسانے میں جنگ، محاذ جنگ اور اس سے پیدا ہونے والے انسانیت سوز مسائل کے انبار ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ افسانہ نگار خود ایک کردار کے ذریعے سوال کرتا ہے ''کیا یہ گورکھ دھندا ہے۔ انسان اپنے تحفظ کے لیے مکان، شہر اور بستیاں بساتا ہے۔ انھیں بستیوں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان نچھاور کر دیتا ہے۔ انسان مرجاتے ہیں، شہر زندہ رہتے ہیں''۔ اس پوری کہانی میں افسانہ نگار نے محاذ جنگ کے واقعات کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ جن سے موجودہ وقت میں چند بڑے ممالک کو سبق لینے کی ضرورت ہے۔

لندن کی معروف و مشہور اور ہر دل عزیز ادبی و سماجی شخصیت امجد مرزا امجد کئی اصناف میں اپنی انفرادی شناخت

رکھتے ہیں۔ 1961 میں برطانیہ آگئے جب ان کی عمر محض اٹھارہ سال کی تھی۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ بیک وقت افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور شعری ذوق وشوق کے مالک ہیں۔ شعری مجموعہ 'ہوائے موسم گل' اور افسانوی مجموعے 'کانچ کے رشتے'، 'سونے کی صلیب'، 'دوریاں'، 'تنہائیاں'، 'جھوٹے لوگ' اور 'توبہ' اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ انشائیوں کے مجموعے 'پھلواری' اور 'دھنک کے رنگ' اور پنجابی زبان میں افسانے اور شاعری 'اوکھے پینڈے' اور 'یاداں' بالترتیب اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

ان کا ایک افسانہ 'حد ہوگئی' ہے جس میں ایک پاکستانی جوڑے کی روداد ہے۔ فیض احمد اور نسرین کی دو اولاد ہیں۔ ایک لڑکا بابر اور ایک لڑکی پنکی۔ یہی دونوں اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ 'حد ہوگئی' کہانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد زاہد نے لکھا ہے:

''نسرین نے ماں کے انتقال کے بعد اپنے باپ کو انگلینڈ اس لیے بلوایا تھا کہ ان کی تنہائی دور ہو جائے۔ اب یہ مصیبت تھی کہ وہ روز مغرب میں رہنے والوں، مغربی تہذیب اور انگریزوں کی برائی بھی کر رہے تھے اور اسی ملک میں مستقل قیام کا ارادہ بھی کر رہے تھے۔ ایک دن اچانک نسرین کے والد شاپنگ کرتے ہیں اور پاکستان واپس چلے جاتے ہیں۔ بابر اس واقعہ کا پس منظر بیان کرتا ہے ''ہمارا یہ معمول بن گیا کہ ہر ہفتہ کو دس پاؤنڈ لاٹری میں لگاتے... (ایک دن لاٹری لگ گئی تو) انعام کی رقم ملتے ہی میں نے انھیں ان کا حصہ نوے ہزار پونڈ دے دیا جو انھوں نے اسی ہفتے اپنے بینک میں ٹرانسفر کرا دیا اور پھر دس دنوں میں واپس بھی چلے گئے'' مشرقی قدروں کے دلدادہ فیض کے سسر کی واپسی کا سبب یہ تھا کہ انھیں نکاح ثانی کی جلدی تھی۔ انھوں نے ایک رشتہ دیکھ رکھا تھا مگر لڑکی والے ان کی عمر کے سبب پانچ لاکھ حق مہر مانگ رہے تھے۔ لاٹری کی رقم نے سارے مسائل حل کر دیے۔ امجد مرزا نے حقیقی کردار اور حقیقی ماحول کی تخلیق کی ہے اور بڑی نفاست کے ساتھ افسانہ میں تضاد بیانی کو نمایاں کیا ہے۔ ایسے کرداروں سے ہر جگہ واسطہ پڑتا ہے جو صرف خود کو اچھا اور دوسروں کو برا کہتے نہیں تھکتے اور جب وقت آتا ہے تو ناجائز باتیں ان کے لیے جائز ہو جاتی ہیں۔''

(محمد زاہد، ڈاکٹر، اردو کی نئی بستیوں کے افسانے۔ جائزہ و انتخاب، ہمارا انجمن پبلی کیشنز، مٹیا برج، کلکتہ، 2016، ص 18)

امجد مرزا نے اس کہانی میں حقیقی کردار اور معاشرے میں موجود حقیقی احوال کو بیان کیا ہے۔ انسان میں روپوش تضاد صفت کی بخیہ گری کی ہے۔ اس طرح کے کردار ہم سب کے سامنے آئے دن مل جاتے ہیں۔ قول وفعل میں تضاد ہی تضاد نظر آتا ہے۔ گویا انسانی شکل میں دو متضاد صفات کے مالک افراد کی ترجمانی اس افسانے کا اہم حصہ ہے۔

برطانیہ کے کہانی کاروں میں فہیم اختر اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ فہیم اختر کا تعلق کلکتہ سے ہے۔ 2014 میں 'ایک گریزاں لمحہ' کے نام سے افسانوی مجموعہ اور 2018 میں 'لندن کی ڈائری' نام سے کالموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ فہیم اختر کے افسانوی جہان کا خاص موضوع مغربی ومشرقی سماج ومعاشرے میں رائج طبقاتی جبر وتشدد اور ذہنی ونفسیاتی کش

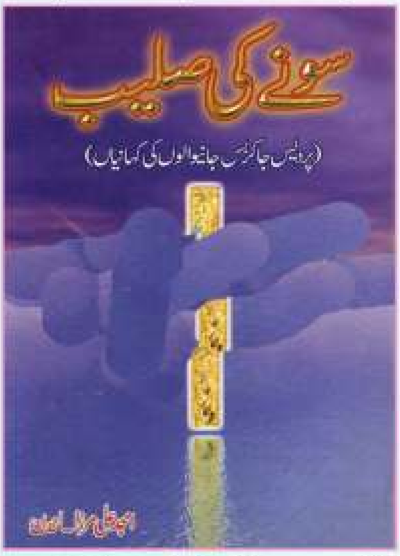

مکش ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں 'کتے کی موت'، ایک گریزاں لمحہ، وندے ماترم، بیوٹی پارلر، سرکل لائن، دیو داسی، ڈرو نیل، گئو ماتا، تشنگی، پیاسی ندی، ٹوٹے بندھن، آخری سفر، درگا مہتر، گواہی، لال کرسی، رکشہ والا، سروپ سنگھ، رشتوں کا درد، کالی پتلون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ افسانہ 'کتے کی موت' ایک انگریز شخص ڈیوڈ کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اس کہانی میں ڈیوڈ ایک ایسا شخص ہے جو مغربی سماج یا یہ کہہ لیں کہ موجودہ مادیت پرست دنیا کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے:

'ڈیوڈ! پلیز، ائی ایم سوری۔ مجھے کل ہی تمہاری ماں کی موت کی خبر معلوم ہوئی۔

'وہ ہاں، مائی مدر...،

'تم۔ تم ٹھیک تو ہو'

''وہ یس۔ وہ بوڑھی تھی یار، ڈونٹ وری!''

ڈیوڈ یہ کہہ کر ہنستے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا''

اس کہانی میں بنیادی طور پر ڈیوڈ اس سماج کی پیداوار ہے جس کے لیے ایک کتا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب ڈیوڈ کا کتا مر گیا تھا تو اس کے غم میں ڈیوڈ نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، کتے کی موت پر ڈیوڈ بہت بے قرار تھا۔ افسانہ نگار اس کی حساسیت کو دیکھتے ہوئے اسے ماں کی موت کے بارے میں بتاتے ہوئے جھجھک محسوس کر رہا تھا لیکن ڈیوڈ کی بات سن کر افسانہ نگار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک بیٹے کو ماں کی موت کا غم نہیں ہے لیکن کتے کی موت کے غم میں کئی دن بے قرار رہتا ہے۔ حالاں کہ ماں نے ڈیوڈ کو پیدا کیا، پھر بھی کتے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس افسانے کا اختتامیہ انسانی فکر وشعور کو نہ صرف جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے بلکہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ آخر ماں سے اہم کتا کیسے ہو سکتا ہے۔

اردو کی نئی بستیوں میں مرد کے ساتھ خواتین بھی قلمی تعاون پیش کر رہی ہیں۔ خواتین تخلیق کاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ فیروزہ جعفر جو 1968 میں کراچی سے لندن آئیں۔ ان کے افسانوی مجموعہ 'پہلی بوند سمندر' 1987 میں شائع ہو چکا ہے۔ محسنہ جیلانی کا تعلق ہندستان سے ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا اور 1965 میں برطانیہ آگئیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'عذاب بے زبانی' 1988 میں شائع ہو چکا ہے۔ 'میں سمندر اور وہ' ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک بے سہارا لڑکی کی داستان ہے۔ لڑکی اپنا تعارف جیکی نام سے کراتی ہے۔ دربدری جیکی کا مقدر بن چکا تھا۔ اچانک جیکی کی ملاقات افسانہ نگار سے ہوتی ہے، گویا خود افسانہ نگار راوی ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے:

''جب میں سولہ سال کی تھی تو میرے بھائی نے مجھے ایک مالدار عرب کے ہاتھ بیچ دیا۔ میں بہت روئی پیٹی۔ چلائی لیکن بے سود... یہ انسان نما جانور اپنے خاندان کے ساتھ مجھے یہاں لے آیا... ایک دن جب کہ گھر کے تمام افراد باہر گئے تھے میں گھر میں بند تھی۔ دروازہ پر تالہ لگا تھا۔ میں ہمت کر کے بیڈ روم کی کھڑکی سے نیچے کود گئی... میری ملاقات جیک سے ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما، میری ہمت بندھائی اور زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اب میں اس کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ میں بس ایک انسان ہوں۔''

اس کہانی میں جیکی کے وہ تمام خواب روپوش ہیں جو وہ اپنی زندگی میں دیکھ سکتی تھیں لیکن گھریلو جبر وتشدد نے اسے کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے لیے ایک ہمدرد شخص ایک فرشتہ کی شکل میں جیک مل گیا۔ اس کہانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد زاہد لکھتے ہیں:

''جیکی نے اپنی کہانی سنا دی۔ وہ اکیلی نہیں، اس جیسی ہزاروں لڑکیاں ہیں جو غموں سے گزرتی ہیں۔ وہ کیا سے کیا بن جاتی ہیں۔ انھیں کوئی جیکی نہیں ملتا جو ان کی

زندگی کو سنوار دے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اپنے، ہم نسل، ہم زبان اور ہم مذہب ان کا استحصال کرتے ہیں اور کوئی غیر ناخدا بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ محسنہ جیلانی کا افسانہ انسانیت کا نوحہ ہے۔''

(محمد زاہد، ڈاکٹر، اردو کی نئی بستیوں کے افسانے۔ جائزہ و انتخاب، ہمارا چمن پبلی کیشنز، ضیا برج، کلکتہ، 2016، ص 24)

حمیدہ معین رضوی آگرہ میں پیدا ہوئیں۔ 1968 میں برطانیہ آ گئیں۔ شعری و نثری دونوں صنف میں تخلیقات موجود ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''فن کی دہلیز (1972)، مردہ لمحوں کے زندہ صنم (1984)، اجلی زمین میلا آسمان (1988)، بے سورج بستی (2000)، داستان در داستان، ناولیٹ، افسانے (2010) اور ایک شعری مجموعہ 'شیشہ گھر' (1998) میں منظر عام پر آ چکا ہے۔

شاہدہ احمد برطانیہ کے دو افسانوی مجموعے 'مہجور میں چراغ' (1992) اور ہجرتوں کے بھنور' (2000) میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ اسٹیج ڈراموں سے بھی دل چسپی رکھتی ہیں۔ عطیہ خان متعدد رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ 'تجربات و حوادث' ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کا نمائندہ افسانہ 'محافظ' ہے۔

بانو ارشد اپنی بے باکی اور منفرد لب و لہجے کی وجہ سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'بانو کے افسانے' (1977) اور 'بانو کی کہانیاں' (1999) میں شائع ہو کر اردو کی نئی بستیوں کے خاتون قلم کاروں میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ 'بتو خالہ' ان کی مشہور کہانی ہے۔ اس میں برطانیہ کی ایک فیملی کی روداد ہے۔ اس کہانی کا لب لباب گھریلو کش مکش، ماڈرن ایج کی آزادی اور ہم جنس پرستی ہے۔ 'بتو خالہ' اپنے ایجاز و اختصار کے سبب بہت متاثر کن افسانہ ہے۔ بانو ارشد اپنی تخلیقات میں بڑی باریک بینی سے پیغام قارئین تک پہنچا جاتی ہیں جو ان کا منفرد اسلوب ہے۔ اردو فکشن کی تاریخ میں ہم جنس پرستی کے باب میں 'لحاف' کو شاہکار ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس موضوع پر متعدد خواتین قلم کاروں نے خامہ فرسائی کی ہیں لیکن بانو ارشد کا بیانیہ سب سے جداگانہ ہے۔

اس تعلق سے ڈاکٹر محمد زاہد لکھتے ہیں:

''یہ افسانہ (بتو خالہ) اپنے ایجاز اور اختصار کے سبب بہت متاثر کن ہے۔ بانو ارشد اسی فنکارانہ چابک دستی کا استعمال اپنی تحریروں میں کرتی ہیں۔ ہم جنسی کے موضوع پر عصمت چغتائی کی کہانی 'لحاف' شاہکار مانی جاتی ہے۔ دوسروں نے بھی اس موضوع کو اٹھایا ہے لیکن جتنے سلیقے سے بانو نے اسے سمیٹا ہے وہ قابل تعریف ہے۔''

(محمد زاہد، ڈاکٹر، اردو کی نئی بستیوں کے افسانے۔ جائزہ و انتخاب، ہمارا چمن پبلی کیشنز، ضیا برج، کلکتہ، 2016، ص 26)

صفیہ صدیقی کی پیدائش ہندستان میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ شادی کے بعد 1961 میں لندن منتقل ہو گئیں۔ 1990 میں پہلا افسانوی مجموعہ 'پہلی نسل کا گناہ' 1994 میں دوسرا افسانوی مجموعہ 'چاند کی تلاش' اور 2001 میں تیسرا افسانوی مجموعہ 'چھوٹی سی بات' کے نام سے شائع ہوا۔ صفیہ نے ایک اہم کام یہ کیا ہے کہ برطانیہ کی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے انگریزی میں ترجمہ کر کے دی گولڈن کیج (The Golden Cage) کے نام سے شائع کیا۔ انھیں کالم نگاری سے دل چسپی اور شعری ذوق و شوق بھی ہے۔ ان کا مشہور افسانہ 'ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا' ہے۔ اس افسانہ میں ایک عورت اور اس کے تین بچوں کی کہانی ہے۔ ان کے افسانوی موضوعات دیگر افسانہ نگاروں کے بہ نسبت مختلف ہیں۔

کناڈا میں اردو قلم کار خاصی تعداد میں قیام پذیر ہیں۔ ان میں ڈاکٹر شان الحق حقی (مرحوم)، سید تقی عابدی، جاوید دانش، بیدار بخت، ولی عالم شاہین، خالد سہیل، عبدالقوی ضیا، اختر جمال، اکرام بریلوی، رضاء الجبار، معین اشرف، نسیم سید، رحیم انجان، عابد جعفری، فیصل فارانی، زہرہ زبیری، روبینہ فیصل، رشید منظر حسین، سلطان جمیل نسیم، تسلیم الٰہی زلفی، اطہر رضوی، اشفاق حسین، خواجہ ناظم الدین مقبول اور جمال انجم وغیرہ کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے۔ اختر جمال کے اب تک چار افسانوی مجموعے، ایک ناول اور ایک خاکہ 'زرد پتوں کا بن' شائع ہو چکے ہیں۔ شان الحق حقی مرحوم کی ادبی کاوش آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ 'شاخانے' ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اکرام بریلوی نے ڈرامہ، افسانہ، ناول، تنقید و تراجم تمام اصناف پر قدرے اطمینان بخش کام کیا ہے۔ افسانوی مجموعے میں 'تیز ہوا میں پتے' اور 'تیسری نسل' شائع ہو چکے ہیں۔ ناول میں 'پل صراط' اور 'آشوب سرا' مقبول عام و خاص ہو چکے ہیں۔ خالد سہیل نے ناول، افسانہ، شاعری اور تنقید میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ موصوف اردو، انگریزی اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ 'دو کشتیوں میں سوار' اور 'کالے جسموں کی ریاضت' ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ عبدالقوی ضیا مرحوم نے متعدد کہانیاں لکھیں۔ ان کی آٹھ کتابیں اردو ادب کے اہم سرمایے ہیں۔ معین اشرف 'ترچھے راستے' کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ رضاء الجبار کے بھی اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جمیل اختر نسیم کا ایک افسانہ 'بے اختیار' ہے۔ اس افسانے کا بیانیہ بہت کمزور ہے لیکن وقت کی اہمیت کیا شئے ہے 'بے اختیار' میں دیکھ سکتے ہیں۔

عابد جعفری کا افسانہ 'پرندہ' توہمات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ خالد سہیل کا افسانہ 'کٹی ہوئی پتنگیں' تجربات پر مبنی افسانہ ہے۔ نقل مکانی آج ایک عالمی مسئلہ بن گیا ہے۔ دیہات سے شہر کی طرف انسانی ہجوم کی کثرت پتنگ کی طرح ہے۔ کبھی کامیاب اور کبھی ناکام۔ گویا نقل مکانی کو پتنگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

براعظم آسٹریلیا میں بھی متعدد افسانہ نگار موجود ہیں۔ ان میں نگہت نسیم، کنیز فاطمہ کرن، اوم کرشن فرحت، فریدہ لاکھانی اور ساوتری گوسوامی قابل ذکر ہیں۔ نگہت نسیم پیشے سے ڈاکٹر ہیں۔ سائکالوجسٹ کی حیثیت سے سڈنی کے ایک ہاسپٹل میں اپنی خدمات انجام دیتی ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعہ اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'گرد باد حیات' (2004) اور 'مٹی کا سفر' (2009) اس

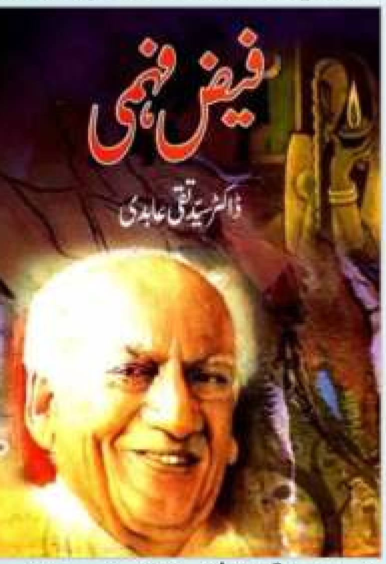

کے علاوہ 'سفید جھیل' (نظموں کا مجموعہ) 2011، 'یہی دنیا ہے یہیں کی باتیں' (کالمز کا مجموعہ) 2011، 'خاک دان' (افسانوں کا مجموعہ) 'منظوم دعاؤں کا مجموعہ'، 'نظموں کا مجموعہ'، 'اہل بیت اطہار کی حیات مبارکہ' وغیرہ جیسی تصنیفات ہیں جن میں کچھ شائع ہو چکے ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں۔ ان کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہجرت اور یاد وطن ہیں۔

براعظم افریقہ کے کئی ممالک میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہیں۔ ان میں کینیا، سوڈان، لیبیا، مصر اور ماریشس قابل ذکر ہیں۔ ماریشس میں متعدد اردو ادارے اور ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ یہاں کالج اور یونیورسٹیوں میں اردو شعبے بھی قائم ہیں۔ اسکول اور مدرسوں میں اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مذہبی جلسے جلوس اور مسجدوں میں تقریر اردو میں کی جاتی ہے۔ ماریشس کے اردو قلم کاروں میں عنایت حسین عیدن، فاروق رجل، حنیف کنہائی، رشید مینو،

صابر گوڈر، قاسم ہیرا، فاروق حسنو، سعید میاں جان، طاہر رومن، ریاض گوکھل، شہزاد عبداللہ، فاروق باؤچہ، ایجاز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں میں ماریشس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں اردو ڈرامے پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ یہاں کے بیشتر ادبا نے صنف ڈرامہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ عنایت حسین عیدن، صابر گوڈر، فاروق حسنو، حنیف کنہائی، رشید مینو وغیرہ افسانوں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

سوڈان میں نیلما ناہید درانی اپنے افسانوی اختصاص کی وجہ سے مشہور ہیں۔ 'ٹھنڈی عورت' نام سے ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کا نمائندہ افسانہ 'جنگلی جانور' ہے۔ جس میں گھریلو زندگی میں عورت پر ہونے والے برے سلوک یعنی گھریلو استحصال کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کینیا میں شیخ اسماعیل افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا نمائندہ افسانہ 'پناہ گیر' ہے۔ جس میں کینیا کے قبائلی واقعات و حادثات، خانگی و خاندانی زندگی کا تصور، فسادات، لوٹ و گھسوٹ کی داستان، سیاسی و سماجی چپقلش، سیاست اور مذہب کے نام پر تشدد اور غارت گری کا واضح بیان ہے۔

خلیجی ممالک میں شعری صنف سخن عروج پر ہے۔ مشاعروں سے اردو زبان کی شمع روشن ہے۔ یہاں مختلف ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ رسائل و جرائد، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اردو زبان و ادب کا فروغ ہو رہا ہے۔ کویت میں مقیم زیبا صدیقی افسانہ نگار ہیں ان کا ایک افسانہ 'کایا پلٹ' ہے۔ اس افسانے کا موضوع ہندوستان میں موجود اکثریتی سماج میں رائج اونچ اور نیچ ہے۔ سماجی بھید بھاؤ اور معاشرتی تنگ نظری ایسے مسائل ہیں جن سے ہندوستانی سماج صدیوں سے برسر پیکار ہے۔ زیبا نے بڑی خوب صورتی سے اپنی کہانی میں ذات پات پر مشتمل سماج کی نشاندہی کی ہے۔

امریکہ میں اردو زبان و ادب کے لیے بہت ساری تنظیمیں متحرک ہیں۔ یہاں جن لوگوں نے اردو زبان کی بستی بسائی ان میں مامون ایمن، فیروز عالم، رشیدہ عیاں، عبدالقادر فاروقی، اشرف شیخ، اخلاق احمد خان، یونس کھوکھر، عبدالرحمان عبد، انور علی رومی، توفیق انصاری، جاوید ریاض، حسن چشتی، حامد امروہوی، رضیہ فصیح احمد اور غوثیہ سلطانہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں کے افسانہ نگاروں میں عبدالقادر فاروقی، سید سعید نقوی، شائستہ سید ایمن اور فیروز عالم گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ فیروز عالم کا ایک کالم نما افسانہ 'دہشت گرد' ہے۔ 'یہ افسانہ خطوط کے پیرائے میں لکھا گیا ہے'۔ اس افسانے کا موضوع اور انداز پیش کش قابل ستائش ہے جس میں پاکستان کا المیہ، خودکش دھماکے اور ڈرون حملے کی کہانی ہے۔ اس میں پاکستانی شہری ہی مارے جاتے ہیں جنھیں غیر ملکی اور دہشت گرد کہہ کر اپنے ہی ملک کی توہین کی جاتی ہے۔

'قطرہ قطرہ زندگی'، 'دھنک کا آٹھواں رنگ'، 'آج کی مریم' اور 'سونامی' وغیرہ فیروز عالم کے بہترین افسانے ہیں۔ عبدالقادر فاروقی کا افسانوی مجموعہ 'اور خون جلتا رہا' میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں 'یتیم کی عید' فاروقی صاحب کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک یتیم

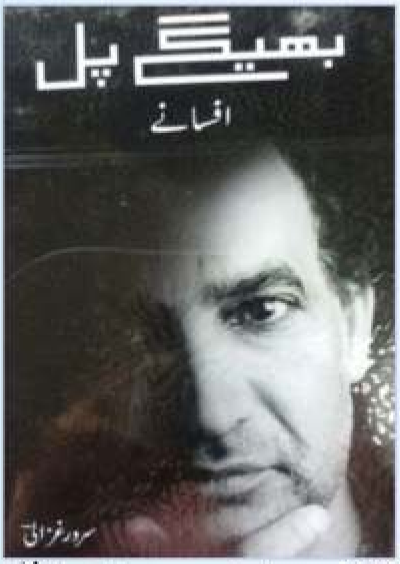

کی کہانی ہے۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھتے ہی ایک ننھی منی بچی اپنی زندگی میں اس قدر محتاج ہو جاتی ہے کہ در بہ در کی ٹھوکریں کھانا اس کی زندگی کا حصہ ہو جاتا ہے۔

یورپ میں برطانیہ کے بعد جرمنی اردو کی نئی بستیوں میں اہم مقام رکھتا ہے۔ جرمنی میں اردو داں افراد تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال سے روحانی فیض حاصل کرتے ہوئے آج حیدر قریشی، منیر الدین احمد، نعیمہ ضیاء الدین، عشرت معین سیما، سرور غزالی، ثریا شہاب اور ہما خالد وغیرہ جہانِ فکشن میں منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ثریا شہاب کے افسانوی مجموعے 'سرخ لباس' اور ناول 'سفر جاری ہے' شائع ہو کر داد وصول کر چکے ہیں۔ احمد کے دو افسانوی مجموعے 'زرد ستارہ' اور 'بنت حرام' اور نعیمہ ضیاء الدین کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

سرور غزالی اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے معاصرین میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ برلن، جرمنی میں قیام پذیر ہیں۔ اب تک دو افسانوی مجموعے 'بکھرے پتے'، اور 'بھیگے پل' اور ایک ناول 'دوسری ہجرت' منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ سرور غزالی کے تمام افسانوں میں ایک شے مشترک ہے یعنی تمام افسانے حقیقت کے عکاس ہیں۔

حیدر قریشی بیک وقت ادیب، شاعر اور صحافی ہیں۔ 'روشنی کی بشارت' اور 'قصے کہانیاں' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کا نمائندہ افسانہ 'اپنے وقت سے تھوڑا پہلے' ہے۔

ناروے میں ہری چرن چاولہ منفرد لب و لہجہ کی وجہ سے منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں عکس اور آئینہ، ریت سمندر اور جھاگ، آتے جاتے موسموں کا سچ، دل دماغ اور دنیا قابل ذکر ہیں۔ ناول میں درندے، چراغ کے زخم، بھٹکے ہوئے لوگ اور آگے سمندر ہیں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ہری چرن چاولہ کے علاوہ علی اصغر شاہد، نوید امجد، جمشید مسرور، سعید انجم اور فیصل نواز چوہدری وغیرہ بھی یہاں کے ادیب ہیں۔ سعید انجم کے دو افسانوی مجموعے 'سب اچھا ہوگا' اور 'سوتے جاگتے' شائع ہو چکے ہیں۔ فیصل نواز کے بھی دو افسانوی مجموعے بشمول سفرنامے پانچ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کا ایک افسانہ 'موڑ وے' ہے۔

ڈنمارک کے نمائندہ تخلیق کاروں میں نصر ملک کا نام سرفہرست ہے۔ نصر ملک کے دو افسانوی مجموعے 'ہوئے مر کے ہم جو رسوا' اور 'قسط در قسط زندگی' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مہاجرین کے مسائل ہیں۔ ہجرت جو کہ خود تکلیف دہ عمل ہے اس پر مستزاد یہ کہ انھیں بنیادی سہولتیں فراہم نہ ہوں۔ دیار غیر میں روزگار، سکونت کے ٹھکانے اور نہ جانے اس طرح کے کتنے مسائل نصر ملک کے افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

جمیل اصغر سویڈن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عمران مشتاق کے افسانوں میں مذہبی رنگ اور اعتدال پسندی نمایاں ہیں۔ ان کا نمائندہ افسانہ 'ایک جلوس کی کہانی' ہے۔ اسی طرح گلشن کھنہ اپنی متعدد تخلیقات کی وجہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

اردو کی نئی بستیوں کے تخلیق کاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ بہت سارے تخلیق کاروں کا ذکر اس لیے نہیں کر سکا کیونکہ مواد کی کمی کا شدت سے احساس ہے۔ مہجری افسانہ نگاروں کے موضوعات میں تنوع اور اسلوب صاف شفاف ہے۔ اشاروں کنایوں میں تخلیقات پیش کرتے ہیں لیکن مطالب بہت گنجلک نہیں ہوتے۔ قارئین زیادہ تر افسانوں کی تہہ میں جلدی پہنچ جاتے ہیں لیکن کبھی کبھار اسلوب اس قدر گنجلک ہوتے ہیں کہ مضامین سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان بستیوں میں موجود ادبا پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب کی تاریخ میں انھیں بہتر مقام مل سکے۔

■

Md Ruknuddin
Room No 312, Kaveri Hostel, JNU
New Delhi-110067

سائنسی علوم کے تراجم اور دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

نگہت امین

اردو میں سائنسی علوم کی روایت اور اس میں سائنسی موضوعات کو منتقل کرنے کا سلسلہ اگر چہ کافی قدیم ہے لیکن انیسویں صدی کا زمانہ اس کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں مختلف ایسے ادارے قائم ہوئے جن میں علوم و فنون، ادب، سائنس اور درسی کتابوں کے تراجم پر باقاعدہ کام شروع ہوا۔ اس سے قبل 1798 میں 'کمال الدین حیدر' نے 'پرکنس' کی تالیف کردہ کتاب کو 'بحر حکمت' کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اس میں بھاپ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے 19 مغربی رسالوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

1811 میں 'کپتان روک' نے جہاز رانی پر ایک فرہنگ مرتب کی جس میں ایسے الفاظ کا ترجمہ کیا گیا تھا جو میدان جنگ میں کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سید محمد میر نے 'چارلس' کی طلسم کیمیا سے متعلق ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ 1836 میں 'ترن لال' نے رسالہ علم ہندسہ مرتب کیا۔ مولوی محمد احمد نے 1851 میں 'چارلس واکر' کی انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں ایک دھات سے دوسری دھات میں ملمع سازی کے آسان طریقے واضح کیے گئے۔ سید عبدالرحمٰن نے 'فارگومن' کے رسالے 'علم ہیئت' کا ترجمہ 'تحفۂ گراں' کے نام سے کیا۔ یہ سارے تراجم سائنسی علوم پر مشتمل ہیں، لیکن سائنسی موضوعات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی باقاعدہ کوشش 'نواب میر عثمان علی خاں' کے عہد میں ہوئی۔ انھوں نے سائنسی موضوعات کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ قائم کیا اور جامعہ عثمانیہ قائم کر کے اردو میں ذریعہ تعلیم کا آغاز کیا۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ اس سرزمین پر قائم ہوا جہاں اردو زبان و ادب کی ایک خاص اور تاریخی روایت رہی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں بہمنی خاندان نے 1347 میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس دور کے حکمرانوں نے دکن میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے مختلف مراکز قائم کیے جس سے بعد کے سلاطین نے مزید فروغ دیا۔ بہمنی حکمرانوں کو بعد 1508 سے 1687 تک قطب شاہی سلاطین نے اور 1671 سے 1948 تک آصف جاہی سلاطین نے دکن پر حکومت کی۔ آصف جاہی حکمرانوں کے ساتویں فرماں روا 'نواب میر عثمان علی خاں' کا عہد علم و ادب کے لحاظ سے بہت اہم رہا ہے۔

'سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں' کے عہد میں سائنسی علوم کی طرف بطور خاص توجہ دی گئی۔ اس عہد کے دو بڑے کارناموں کو اردو ادب کی دنیا میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دارالترجمہ کا قیام ہے اور دوسرا عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد ہے۔ اس سے قبل حیدر آباد میں میٹریکیولیشن اور انٹرمیڈیٹ تک دارالعلوم میں اردو اور نظام کالج میں انگریزی ذریعہ تعلیم تھی مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے نہ صرف حیدر آباد بلکہ پورے ہندوستان میں ایسی کوئی یونیورسٹی نہیں تھی جہاں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دہلی کالج میں بھی اردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ نچلی سطح تک قائم تھا۔ اسی ضرورت کے پیش نظر حیدر آباد کے اہل علم اور باشعور افراد شدت سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ اس کے لیے پہلی بار 1873 میں 'نواب میر محبوب علی خاں' کے عہد میں کوشش کی گئی تھی لیکن ان کوششوں کا کوئی بہترین نتیجہ بر آمد نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں محی الدین قادری زور رقم طراز ہیں کہ:

''حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا خیال عہد مختارالملک میں پیدا ہو چکا تھا اور عہد آصف جاہ سادس میں دو چار مرتبہ تحریر وتقریر کے ذریعے سے اہل ملک نے اس اہم کام کی طرف توجہ دلائی مگر معلوم ہوتا ہے کہ وقت نہیں آیا تھا لہٰذا اس اہم کام کے سلسلے میں جتنی بھی تحریکیں کی گئیں وہ تمام جنگل کی آواز بن کر رہ گئیں۔''[1]

نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں ایسی تحریکیں ان کی تخت نشینی کے بعد ابھریں اور 1914 میں یہ کوشش تحریک کی شکل میں نمودار ہوئی۔ قیام یونیورسٹی کے لیے دارالعلوم کے طلباء نے ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد کر کے منظم طور پر یونیورسٹی کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ دارالعلوم کے علاوہ یونیورسٹی کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں 'انجمن ترقی اردو اورنگ آباد' کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے سکریٹری بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو زبان کو فروغ دینے اور اس کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''گزشتہ نصف صدی میں جو تغیرات اس ملک میں ہوئے ان پر نظر ڈالتے ہوئے صاف نظر آتا ہے کہ اہل ہند کا مستقبل باقاعدہ اور اعلیٰ درجے کی ترقی کا بہت کچھ دارومدار زبان اردو کی وسعت اور ترقی پر ہے۔ اس ملک کی دفتری اور سرکاری زبان بھی اردو ہے جس زبان کو دولتِ آصفیہ کی سرپرستی کا افتخار حاصل ہو اس کی ترقی اور وسعت کے لیے اس ملک کے اعیان واکابر اور دیگر خوش باش حضرات سے جس قدر بھی اعانت طلب کی جائے بجا اور درست ہوگا۔''[2]

اس طرح قیام یونیورسٹی کی تحریک میں کسی ایک ادارے، انجمن اور سوسائٹی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ سیاسی انجمنوں اور تحریکوں کے علاوہ دارالعلوم کے قدیم طلباء کی تحریک، حیدرآباد ایجوکیشنل سوسائٹی، انجمن ترقی اردو حیدرآباد، محکمۂ تعلیمات کی اصلاحی تجاویز اور مجلس اشاعتِ علوم وغیرہ بھی پیش پیش رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سر راس مسعود کی بھرپور تائید نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کے نتیجے میں دکن کے گوشے گوشے سے اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں سر اکبر حیدری نے 1917 میں موجودہ طریقۂ تعلیم کے نقائص کی تفصیل لکھ کر میر عثمان علی خاں کی خدمت میں پیش کی:

''موجودہ طریقۂ تعلیم کی دورنگی اور بے اصولی کو مٹانے کے لیے اور ان خطرات اور خطرناک نقائص کو رفع کرنے کے لیے جو موجودہ طریقۂ تعلیم نے پیدا کیے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن ومعاشرت وقوائے ذہنی وجسمانی کو اندر ہی اندر کھائے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم ملکی خدمات اور قومی خصائص پر قائم ہو جس میں قدیم وجدید دونوں خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف وترجمہ کا کام بھی کرے اور تربیت ذہن اور تحصیل علوم وفنون کے لیے اپنی زبان یعنی اردو کو کام میں لائے۔''[3]

غرض یہ کہ 4/رجب 1335ھ بمطابق 26/اپریل 1917 کو میر عثمان علی خان نے اس عرضداشت کو شرف قبولیت بخشا اور یونیورسٹی کے احکام صادر کرنے کے ساتھ کچھ بنیادی اصولوں کو واضح کر دیا کہ ان اصولوں کی پابندی سے ہی یونیورسٹی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید وقدیم مشرقی ومغربی علوم وفنون کا امتزاج اس طور پر کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی ودماغی وروحانی تعلیم کے قدیم کو جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔[4]

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولہ عرضداشت کے مطابق ممالک محروسہ کے لیے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے اس یونیورسٹی کا نام (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد ہوگا۔''[5]

فرمان اشاعت کے بعد دکن کے علمی اور ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ قیام یونیورسٹی کی منظوری کے بعد میر عثمان علی خان نے منشور خسروی جاری کیا:

''حیدرآباد دکن میں ایک جامعہ (یونیورسٹی) بنام "جامعہ عثمانیہ" یکم محرم الحرام 1337ھ سے قائم کی جائے۔

جامعہ عثمانیہ کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی، اخلاقی، ادبی، فلسفی، طبیعی، تاریخی، طبی، قانونی، زراعتی، تجارتی اعلیٰ تعلیم کا اور دیگر علوم وفنون وسودمند پیشوں اور صنعت وحرفت وغیرہ سکھانے اور ان سب میں تحقیقات وترقی کا انتظام کرے۔

جامعہ عثمانیہ کی خاص خصوصیت یہ ہوگی کہ جملہ علوم کی تعلیم زبانِ اردو میں دی جائے گی اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان وادب کی تعلیم بھی لازمی رہے گی۔''[6]

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کو عملی شکل دینے کے لیے سائنس کے مختلف مضامین اور جدید علوم کی کتابوں کو اردو

میں ترجمہ کرنے کی فراہمی کو اولیت دی گئی۔ لہٰذا جامعہ عثمانیہ کے لیے پورے ہندوستان سے بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا گیا۔ ان اساتذہ کے علمی اور ادبی ذوق کو دیکھ کر طلبا میں بھی اردو ادب کی خدمت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ حیدرآباد میں سٹی کالج، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور اس سے قبل ورناکلر اسکول بھی قائم ہو چکے تھے۔ اس طرح اب یہ بات واضح ہونے لگی کہ اردو میں بھی سائنسی علوم وفنون کا احاطہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

غرض یہ کہ اکبر حیدری نے 24/شوال 1334ھ بمطابق 13/اگست 1913 کو علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ (سررشتہ تالیف وترجمہ) کے قیام کی درخواست پیش کی اور نواب میر عثمان علی خان نے دارالترجمہ (1917) کی منظوری دے دی۔ دارالترجمہ کا قیام عثمانیہ یونیورسٹی سے قبل ہو چکا تھا تا کہ طلباء کے لیے اعلیٰ درجے کی کتابیں اردو میں مہیا ہو سکیں۔ اس بات کو عبدالقادر سروری نے اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''جدید اور سائنٹفک درسیات کا ترجمہ اور ان کی اشاعت کا انتظام کرنے کے لیے 14 راگست 1917 کو شاہی فرمان جاری ہوا اور جامعہ عثمانیہ سے قبل 6رستمبر 1917 میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔''[7]

حقیقت یہ ہے کہ دارالترجمہ عثمانیہ اردو زبان کو علوم وفنون سے مالا مال کرنے کی پہلی مستقل کوشش ہے۔ ابتدا میں دارالترجمہ میں صرف مغربی زبانوں کی کتابوں

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے کی پہلی باقاعدہ اور مستقل کوشش ہے جو بڑے پیمانے پر کی جا رہی ہے۔ دارالترجمہ کی مطبوعات نے اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا کر دی، جدید علوم و فنون کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کر دیا اور علمی خیالات کے اظہار کے لیے گنجائش پیدا کر دی اردو کے ذخیرہ الفاظ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

کے تراجم کیے گئے۔ بعد میں عربی، فارسی اور مشرقی علوم کی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا جانے لگا۔ دارالترجمہ کے قیام کا بنیادی مقصد سائنس اور جدید علوم کو اردو میں ترجمہ کرنا اور اردو زبان کو مغربی ذخیرے سے فیض پہچانا تھا۔ لہٰذا اس ادارے کے لیے ایسے مترجمین کا تقرر عمل میں آیا جو اپنے مضمون کے ماہر یعنی انگریزی، عربی، فارسی اور اردو پر مکمل دسترس رکھتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان علوم وفنون کا ترجمہ پوری صحت کے ساتھ کریں۔ تاکہ وہ علوم وفنون کا ترجمہ نمایاں طور پر انجام دیں۔ بقول میر حسن:

''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے کی پہلی باقاعدہ اور مستقل کوشش ہے جو بڑے پیمانے پر کی جا رہی ہے۔ دارالترجمہ کی مطبوعات نے اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا کر دی، جدید علوم وفنون کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کر دیا اور علمی خیالات کے اظہار کے لیے گنجائش پیدا کر دی اردو کے ذخیرہ الفاظ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے''[8]

اس طرح دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ ایسا تجربہ پہلی بار عثمانیہ یونیورسٹی میں ہی کیا جا رہا تھا اور نہ صرف فنون بلکہ سائنس، کامرس، انجینئرنگ، میڈیسن، طب اور قانون کی تعلیم بھی اردو کے ذریعے دی جا رہی تھی۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے علوم وفنون کے تراجم کے لیے کچھ کمیٹیاں مقرر کی تھیں جن کا مختصراً ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اول، 'نصاب کمیٹی' یہ کمیٹی 1917 میں عمل میں آئی جس کے چیرمین سر اکبر حیدری تھے یہ گیارہ افراد پر مشتمل ایسی کمیٹی تھی جو نصاب کا تعین کرتی اور دارالترجمہ کو اصل کتابیں فراہم کر کے تراجم کے لیے منتخب کرتی نیز یونیورسٹی کا انتظام چلانے کے لیے قوانین بھی بناتی تھی۔ دوم، 'انتظامی کمیٹی' جو 1917 میں قائم ہوئی اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اس کے صدر تھے۔ اس کے قیام کا اصل سبب یہ تھا کہ جب دارالترجمہ میں کام شروع ہوا تو جن موضوعات کا تعلق ترجمہ کی مشکلات یا مضامین سے ہوتا تھا۔ ان پر بعض اوقات مترجمین کی بحث بہت طویل ہوتی تھی۔ اس بحث کی روک تھام کے لیے خاص 'انتظامی کمیٹی' کو بنایا گیا۔ سوم 'انجینئرنگ کمیٹی' اس کے صدر عبدالرحمٰن خاں تھے۔ اس کا مقصد انجینئرنگ کے لیے انگریزی کتابوں کا انتخاب اور ترجموں کا انتظام کرنا تھا۔ علاوہ ازیں سب سے اہم کمیٹی 'وضع اصطلاحات کمیٹی' تھی۔ اردو میں عملی اصطلاحیں وضع کرنے کے لیے اس کمیٹی کا قیام ہوا تھا ان اصطلاحوں کے استعمال کے لیے فن سے واقف اشخاص کو رکھا گیا۔ جن میں وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق، نظم طباطبائی، مرزا ہادی رسوا وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

دارالترجمہ میں کمیٹیاں چار تھیں یا اس سے زائد، اس ضمن میں اختلاف ملتا ہے۔ امیر عارفی نے دارالترجمہ کے لیے جو مضمون لکھا ہے اس میں سات کمیٹیوں کا ذکر کیا ہے جب کہ مجیب الاسلام نے چار کا۔ لیکن تحقیق سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ بیشتر محققین کا اتفاق چار کمیٹیوں پر ہے۔ چنانچہ دارالترجمہ میں کمیٹیوں کی تعداد چار تھی۔

دارالترجمہ میں سب سے اہم مسئلہ اصطلاح سازی کا تھا کیونکہ اصطلاح سازی کی ضرورت ایسی تھی کہ اس سے واقفیت کے بغیر ہم علمی مطالب کے ادا کرنے اور ان اشاروں کے مفہوم کو واضح کرنے میں ناکام رہتے۔ بقول 'وحیدالدین سلیم' ''اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتے ہیں''[9]۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ہم جدید علوم کو حاصل کرنا اپنا مقصدِ حیات سمجھیں اور اپنی زبان کو اصطلاحات اور نئے نئے الفاظ سے آراستہ کریں تاکہ اس کی وسعت میں اضافہ ہو جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر اصطلاح سازی کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً:

''انگریزی زبان کی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی علمی اصطلاحات کے مقابلے میں اردو علمی اصطلاحات وضع کی جائیں''۔[10]

پہلا گروہ اپنی رائے اس طرح پیش کرتا ہے: ''تمام الفاظ عربی زبان سے بنانے چاہئیں''۔[11]

پہلا گروہ مسلمانوں کے پیش نظر اپنے دلائل اس طرح پیش کرتا تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے، اس سے سارے مسلمان واقف ہیں لہٰذا اگر اس زبان کے الفاظ سے اسی زبان کے قواعد کے مطابق علمی اصطلاحیں بنائی جائیں تو سارے مسلمان اسے بہتر طریقے سے قبول کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی پہلے سے علمی زبان ہے اور مسلمانوں کے سارے علمی کارنامے جو وہ ماضی میں انجام دے چکے ہیں، اسی زبان میں جمع ہیں لہٰذا اگر جدید علمی اصطلاحیں بھی اس زبان کے الفاظ سے اور اسی زبان کے قواعد کے مطابق وضع کی جائیں تو اس کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

دوسرا گروہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ ''جو اردو زبان میں بطور عنصر کے شامل ہیں (یعنی عربی، فارسی، ہندی) اور ان لفظوں کی ترکیب میں اردو گرامر سے مدد لینی چاہیے''۔[12]

گروہ ثانی نے اپنی بات کے لیے چار دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول یہ کہ کسی بھی زبان کی ترقی کے معنی یہ نہیں

ہیں کہ اس میں غیر زبانوں کے بے شمار الفاظ بجنسہٖ بغیر کسی تصرف کے داخل کر لیے جائیں۔ زبان کی ترقی اسی وقت ترقی کہلا سکتی ہے جب وہ تمام الفاظ جن کا اس میں اضافہ کیا جائے اس زبان کی قدرتی ساخت اور اس کے اصلی قواعد کے مطابق بنائے گئے ہوں۔ دوسری دلیل میں وہ لکھتے ہیں کہ عربی زبان میں مفرد مادوں کی افراط ہے اس لحاظ سے یہ زبان اعلیٰ درجے کی زبان ہے جبکہ اردو کے قدرتی عنصر عربی، فارسی، ہندی زبانیں ہیں ان میں کسی زبان پر قناعت کر لینا ترقی کے دائرے کو محدود کر لینا ہے۔ تیسری بات یہ کہ اردو زبان ہندوستان کے مختلف باشندوں نے مل کر بنائی ہے۔ یہ زبان تمام گروہوں کے لیے فائدہ مند ہے تو اگر ہم کسی ایک گروہ کی زبان مثلاً صرف عربی کے الفاظ کثرت سے شامل کریں گے تو وہ فائدہ مند نہیں رہیں گے۔ چوتھی دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہندوستان میں دو زبانیں یعنی ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانون کے لیے عربی ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ اس بنا پر نہ تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ سنسکرت کی اصطلاحوں سے اپنی زبان کو بوجھل کریں اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کریں اور عربی اصطلاحیں استعمال کر کے اپنی زبان کو اجنبی اور نامانوس ہونے دیں لہٰذا ہمارے لیے یہی طریقہ ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے میں ان تمام زبانوں سے کام لیں جو اس زبان کی ترکیب میں پہلے سے موجود ہوں۔

مذکورہ بالا دلیلوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گروہ ثانی کے دلائل قابل قبول ہیں۔ ان کی دلیلیں صرف مسلمانوں کے لیے فائدہ مند نہیں تھیں بلکہ ہر قوم کے لیے بہتر ثابت ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ دارالترجمہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں اتنی صلاحیت ہے کہ اس میں اصطلاحات وضع کی جائیں اور وضع اصطلاحات کمیٹی کے ممبران نے غور و فکر کے بعد مندرجہ ذیل سات اصول مرتب بھی کیے۔

1۔ اصطلاحیں وضع کرنے کے لیے ماہران زبان اور ماہران فن دونوں کو یکجا ہونا ضروری ہے اصطلاحات بنانے میں دونوں پہلو کا خیال رکھنا لازم ہے تاکہ جو اصطلاحیں بنائی جائیں وہ زبان کے سانچے میں ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے ناموزوں نہ ہو۔

2۔ اصطلاحات بنانے کے لیے عربی، فارسی، ہندی میں سے کسی زبان کا بھی ایسا مادہ لے سکتے ہیں جو سہل ہو جو مروج ہو اور جو موزوں ہو۔ الفاظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن اس کے لغوی قاعدے نہیں لے سکتے۔

3۔ جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیر زبانوں کے اسماء مصادر بنائے جاتے تھے مثلاً بولنا، قبولنا، بخشنا وغیرہ اسی طرح اب بھی حسب ضرورت اسماء سے افعال بنائے جائیں۔

4۔ حتی الامکان مختصر لفظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کر سکیں۔

5۔ ترکیب میں انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے جو اب تک ہماری زبان میں مستعمل ہیں مثلاً ہندی لفظ کے ساتھ فارسی عربی کا جوڑ اور عربی سابقوں خصوصاً لاحقوں کا میل ہندی الفاظ کے ساتھ مثلاً دھڑے بندی، اگال دان، بے کل وغیرہ یا عربی قاعدے سے فارسی ہندی الفاظ کے اسم کیفیت جیسے رنگت، نزاکت کے طرز پر مزاجیت وغیرہ۔

مذکورہ بالا دلیلوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گروہ ثانی کے دلائل قابل قبول ہیں۔ ان کی دلیلیں صرف مسلمانوں کے لیے فائدہ مند نہیں تھیں بلکہ ہر قوم کے لیے بہتر ثابت ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ دارالترجمہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں اتنی صلاحیت ہے کہ اس میں اصطلاحات وضع کی جائیں اور وضع اصطلاحات کمیٹی کے ممبران نے غوروفکر کے بعد مندرجہ ذیل سات اصول مرتب بھی کیے۔

6۔ ہماری زبان کی ایسی اصطلاحیں جو قدیم سے رائج تھیں اور اب بھی اسی طرح کارآمد ہیں انھیں برقرار رکھا جائے البتہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں اور رائج ہو گئی ہیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کی رو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے انھیں ترک کر کے ان کے بجائے دوسرے مناسب لفظ وضع کر لیے جائیں۔

7۔ بعض انگریزی اصطلاحیں جو پہلے زمانے میں اس وقت کی معلومات کی رو سے تجویز کی گئی تھیں اور حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں ان کے بجائے ایسے لفظ تجویز کیے جائیں جو جدید تحقیق کی رو سے صحیح مفہوم ادا کر سکیں اس میں انگریزی الفاظ کی تقلید نہ کی جائے''۔13

ان تمام اصولوں کو وضع کرنے کے لیے دارالترجمہ کے مترجمین کا بہت بڑا زبردست رول رہا ہے جنھوں نے علوم و فنون کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کر کے علمی خیالات کے اظہار کے لیے گنجائش اور وسعت پیدا کر دی اور غور و فکر اور عرق ریزی سے اس دشوار کام کو آسان بنانے کی کوشش کی۔ مترجمین ترجمہ کرتے وقت سادہ، عام فہم، سلیس، معنوی اور معیاری الفاظ کا استعمال کرتے۔ ادبی اصطلاحوں کے مقابلے میں سائنسی اصطلاحوں کو وضع کرنے میں دشواریاں پیش آتی تھیں کیونکہ سائنسی اصطلاحوں کا تعلق روزمرہ کی ضروریات سے نہیں ہوتا ہے اس کے باوجود مترجمین محنت و مشقت سے سائنسی اصطلاحوں کا استعمال کرتے تھے۔ وضع اصطلاحات کی پہلی مجلس کا انعقاد 1917 میں ہوا تھا۔ اس میں مولوی عبدالحق، وحیدالدین سلیم، مرزا ہادی رسوا، نظم طباطبائی اور مہدی خاں کوکب شامل تھے۔ آخری مجلس 1946 میں ہوئی جس میں مولوی عبداللہ عمادی، ناظر مذہبی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، محمد نصیر احمد عثمانی، مولوی عاقل علی خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دارالترجمہ کے ترجمہ نگار ہندوستان کے بلند پایہ ادیب، انشاپرداز، مدبر، معلم اور ماہر لسانیات تھے جنھوں نے تراجم کے لیے اپنی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام مولوی عبدالحق کا ہے جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی تحریک میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے مزید جان ڈال دی اور انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی ممتاز خدمات انجام دی۔ 'اردو ذریعہ تعلیم سائنس'، 'اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ علاوہ ازیں مقدمات، خطبات کے مجموعے، تنقیدات عبدالحق، مراٹھی زبان پر فارسی کا اثر، اردو کی نشوونما میں صوفیاء اکرام کا حصہ، مرحوم دہلی کالج اور نصرتی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ علامہ عبداللہ عمادی، مولوی مسعود علی، قاضی تلمذ حسین، چودھری برکت علی اور سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہ قابل ذکر مصنفین ہیں۔ ان مترجمین نے مغربی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ جامع اور بامحاورہ انداز میں کیا ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ کے سائنسی مترجمین میں چودھری برکت علی، قاضی تلمذ حسین، خلیل الرحمٰن، محمد عبدالرحمٰن خان، مفتی شاہنواز، شیخ فروز الدین مراد، محمد حسین، محمد نعمت اللہ، محمد نصیر الدین عثانی، محمد عظمت اللہ، عبدالباری ندوی، محمد سعید الدین، محمد اشرف، ضیاء الدین انصاری، سید ہاشمی فرید آبادی، کرنل فرحت علی، ڈاکٹر غلام دستگیر، حکیم محمد یوسف، حکیم غلام جیلانی اور حکیم کبیرالدین کے نام قابل ذکر ہیں۔

دارالترجمہ نے 17 اگست 1917 سے 1951 تک مختلف علوم و فنون پر مشتمل کتابیں ترجمہ کی ہیں۔ آخر

میں دارالترجمہ میں مترجمین کی تعداد کم ہوکر چھ ہوگئی جن میں احسان اللہ، رشید احمد، ڈاکٹر غلام دستگیر، ڈاکٹر یوسف انطونی، محمد حسین اور عبدالرحمٰن خان شامل تھے۔ 1951 تک دارالترجمہ کی بیشتر کتابوں کی اشاعت ہو چکی تھی لیکن جو طباعت کے مراحل سے نہیں گزری تھیں۔ ان مخطوطات کو دارالترجمہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ نذر آتش کے باوجود یہ کتابیں محفوظ رہیں اور بعد میں نظام ٹرسٹ لائبریری کو بطور ہدیہ دی گئیں جو آج بھی وہاں دستیاب ہیں۔ دارالترجمہ کی آتش زدگی کے بارے میں رہنمائے دکن میں لکھا ہے کہ:

''حیدرآباد 18 راگست کل رات زبان اردو کی نایاب کتابوں کا ذخیرہ جل کر خاکستر ہوگیا۔ جب کہ دارالترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی۔ نقصان کی مالیت کا اندازہ اسی ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے۔ ساری کتب کی فہرستیں تیار کی جا رہی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ اور نایاب کتب آہنی الماریوں میں جو تباہ ہونے سے بچ گئی ہیں۔''[14]

دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ اردو میں وہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ اس نے مشرق و مغرب کے درمیان علم کا وہ فاصلہ جو بظاہر بڑی خلیج کی مانند تھا، مٹا دیا۔ دار الترجمہ کے زیر اہتمام شائع شدہ کتابوں کو فنون کے اعتبار سے سات شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد شکیل خاں رقم طراز ہیں:

''اگر دارالترجمہ کی شائع شدہ جملہ کتابوں کو فنون کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو یہ سات شعبوں میں ترتیب دی جا سکتی ہیں۔ پہلا شعبہ آرٹس یعنی میٹا فزکس، سیکالوجی، لاجک اور ایتھکس دوسرا شعبہ ہسٹری اور جاگرافی، تیسرا شعبہ سوشیالوجی، پولیٹکل سائنس اور اکنامکس چوتھا شعبہ قانون، پانچواں شعبہ ریاضی اور سائنس، چھٹا شعبہ انجینئرنگ اور ساتواں شعبہ زولوجی، بوٹنی اور میڈیسن وغیرہ سے متعلق ہوگا۔''[15]

نصیرالدین ہاشمی کے مطابق ان ساتوں شعبوں پر مشتمل مندرجہ ذیل کتابیں طبع ہوئیں جن کی تعداد 359 اور سائنس سے متعلق 73 کتابیں ہیں:

فلسفہ مابعدالطبیعات، نفسیات، منطق، اور اخلاقیات	59
تاریخ جغرافیہ، تاریخ اسلام، ہند، قدیم، یورپ	118
عمرانیات، سیاسیات، معاشیات	29
قانون و دستور	23
ریاضی، سائنس	73
سیول و میکانیکل انجینئرنگ	27
طب	30 [16]

ان تراجم کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دار الترجمہ عثمانیہ نے اردو ادب اور ہندوستان کے عوام کے لیے جن علوم و فنون کا انتخاب کیا، وہ نہ صرف ادبی، مذہبی یا شعری تھے بلکہ سائنس، علم حیوانات، علم طبیعات، جغرافیہ، انجینئرنگ، نفسیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، طب، جراحی، فلاسفی، منطق، اخلاقیات، قانون اور تاریخ بھی تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تمام تر کامیابی دارالترجمہ کی مرہون منت ہے لیکن افسوس 1948 میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اندر موجود اردو کے بیش بہا ذخیرے کو آتش زدگی کی بنا پر اور میر عثمان علی خان والی دکن کے زوال کے بعد اس کا کوئی پرسان حال نہیں رہا۔ کیونکہ 1950 میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی جگہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں دارالترجمہ کی ضرورت یکسر ختم ہوگئی۔ اس طرح دارالترجمہ کی تینتیس سالہ خدمات پر پانی پھر گیا اور اردو زبان جس کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنی بے پناہ اہمیت اور فضیلت تھی، صفحۂ تاریخ سے مٹا دی گئی۔ چنانچہ ایک ایسی یونیورسٹی جو اردو ذریعۂ تعلیم کے سبب ملک میں انفرادی اہمیت کی حامل قرار دی جاتی تھی، اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی انفرادیت کو کھو دیا۔

بحیثیت مجموعی دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے 1917 سے لے کر 1948 تک اپنی عظیم الشان روایات کو برقرار رکھا۔ ان اکتیس برسوں میں جامعہ عثمانیہ کو مختلف قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور کتابوں کے ترجمے کے لیے دشوار گزار حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اردو زبان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ سائنس اور تکنالوجی جیسے موضوعات کو بحسن خوب پیش کرنے لگی تھی۔ آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں ایسے اداروں کی سخت ضرورت ہے جو دنیا کی نت نئی ایجادات اور علوم و فنون کو ترجمہ کے ذریعہ ہر خاص و عام تک پہنچانے کا کام کرے۔ کیونکہ مغربی ممالک ترقی کے باوجود بھی دوسری زبانوں کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کراتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تراجم سے قومیں ترقی یافتہ اور باشعور ہوتی ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے یہ کام ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں سب سے پہلے شروع کیا تھا لیکن آج افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اس میدان میں سب سے پیچھے ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنسی علوم و فنون کی اردو زبان میں منتقلی کے لیے مناسب اور موثر اقدام اٹھائے جائیں۔

حواشی:

1۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، محی الدین قادری زور، حیدرآباد (1934) ص 87
2۔ اپیل منجانب کانفرنس۔ روزنامہ مشیر دکن 23 مئی 1914
3۔ دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، نامی پریس لکھنؤ (1963) ص 754
4۔ احکام و کاغذات متعلقہ جامعہ عثمانیہ، حمید احمد انصاری، دارالطبع عثمانیہ حیدرآباد، ص 1
5۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، محی الدین قادری زور، حیدرآباد (1934) ص 92 (یا) احکام و کاغذات متعلقہ جامعہ عثمانیہ، حمید احمد انصاری، دارالطبع عثمانیہ حیدرآباد، ص 1
6۔ احکام و کاغذات متعلقہ جامعہ عثمانیہ، حمید احمد انصاری، دارالطبع عثمانیہ حیدرآباد، ص 95 (یا) داستان ادب حیدرآباد، محی الدین قادری زور، سب رس کتاب گھر حیدرآباد (1951) ص 188۔
7۔ رہنمائے دکن (گولڈن جوبلی جامعہ عثمانیہ۔ خصوصی اشاعت، مضمون جامعہ عثمانیہ تاریخی جائزہ از پروفیسر ہارون خان شیروانی، حیدرآباد دکن 15 ر اکتوبر 1968۔
8۔ انگریزی تصانیف کے اردو تراجم، ص 117
9۔ وضع اصطلاحات، وحیدالدین سلیم، حیدرآباد (1931) ص 2
10۔ وضع اصطلاحات، وحیدالدین سلیم، حیدرآباد (1931) ص 7
11۔ وضع اصطلاحات، وحیدالدین سلیم، حیدرآباد (1931) ص 8
12۔ اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان (1949) ص 41
13۔ اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان (1949) ص 42،39
14۔ روزنامہ رہنمائے دکن، حیدرآباد مورخہ 19 راگست (1955)
15۔ سائنسی و تکنیکی ادب، ڈاکٹر محمد شکیل خاں، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، ص 240
16۔ دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، نسیم بکڈپو لکھنؤ (1963) ص 758

Nighat Ameen
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

عاتکہ ماہین

بچوں کی نظموں میں جدید موضوعات

کسی بھی زبان کے ادب کی مقبولیت کا انحصار زیادہ تر اس کے شعری سرمائے پر ہوتا ہے۔ مثلاً میر اور غالب کی جو مقبولیت ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آسکتی یوں بھی نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ پر اثر واقع ہوئی ہے اور جلدی ذہنوں میں محفوظ ہو جانے والی ہے۔ بچہ جب آنکھ کھولتا ہے تو سب سے پہلے اس کے کانوں میں جو آواز پہنچتی ہے وہ منظوم شکل میں ہی ہوتی ہے۔ ماں کے منھ سے لوری سن کر پرسکون محسوس کرتا ہے گویا بچے بھی ترنم اور موسیقی کی آوازوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نظمیں ان کو لطف فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

شاعری نہ صرف بڑوں میں بلکہ بچوں کے اندر بھی جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے۔ اکثر بچے اس کو گنگنانے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں چھوٹی جماعتوں کے بچے نظم کو گا گا کر پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں بچوں کے ہاتھ میں ہی ملک کا مستقبل ہوتا ہے انھیں ہی بڑے ہو کر مختلف حیثیتوں سے ملک کی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان کو اخلاقی طور پر اچھا انسان بنانے کے لیے ایسی نظمیں لکھی جائیں جن سے ان کی اصلاح بھی ہو سکے اور طبعی حظ بھی حاصل ہو سکے۔ نظم کے موضوعات ایسے ہوں جو بچے کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نثر کے بالمقابل نظم میں لفظوں کی کاریگری زیادہ اہمیت رکھتی ہے لہٰذا شاعری کے ذریعہ بچے کے اندر لفظوں کے استعمال، ان کے بہتر انتخاب و ترتیب کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی نیز شاعری میں آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے پیدا ہونے والی موسیقی بچوں کے لیے لطف فراہم کرتی ہے اور ان کے اندر شاعری کا شوق بھی پیدا کرتی ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی بہترین نظمیں لکھی گئی ہیں اور بیشتر شعراء نے اپنی نظموں کے ذریعہ ادب اطفال کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے۔ محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض نے بچوں کے لیے نظموں کی بہترین روایت قائم کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے تبدیلی کا عمل ہر میدان میں جاری و ساری رہتا ہے اور اگر تبدیلی نہ ہو تو چیزیں اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ جائیں گی اور ترقی کے امکانات باقی نہ رہ سکیں گے۔

بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے موضوعات کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جن کی اہمیت ہر دور میں مسلّم ہے۔ مثلاً بہادری، بلند حوصلگی، حب الوطنی، دوستی، بھائی چارگی، علم، وقت کی پابندی، جانوروں، چڑیوں سے متعلق میلوں ٹھیلوں، مناظر فطرت، صبح، شام، دوپہر، موسموں، گرمی، سردی، برسات، مختلف تہواروں، عید، ہولی، دیوالی وغیرہ۔ دوسری قسم ان موضوعات کی ہے جو سیاسی، سماجی، جغرافیائی حالات کی تبدیلی اور جدید ایجادات و انکشافات سے متعلق ہیں۔ مثلاً آزادی کے بعد سے 26 جنوری اور پندرہ اگست پر مستقل نظمیں کہی جا رہی ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ چیزیں بدلتی رہتی ہیں اور پہلے کے مقابلے میں مزید ترقی کے امکانات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ادب پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے اور نت نئے موضوعات ادب کے دامن کو وسیع کرتے ہیں۔ بچوں کو نئی نئی چیزوں سے واقف کرانے کی غرض سے ان کے ادب میں بھی نئے موضوعات شامل ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ ادوار میں بچوں کے لیے جو ادب تخلیق ہوتا آیا ہے اس میں زیادہ تر جانوروں، چرند، پرند وغیرہ کے ذریعہ نصیحت سے پر اور سبق آموز کہانیاں پیش کی گئیں۔ جانوروں کے ذریعہ کہانی کو دلچسپ بنا کر پیش کرنے کی روایت بہت پرانی ہے 'پنچ تنتر' کی کہانیاں اس قدیم روایت کی مثالیں ہیں۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ 'کلیلہ و دمنہ' کے نام سے ابن مقفع نے کیا اسی طرح جب بیسویں صدی میں بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں پر نظر ڈالتے ہیں تو چوہے، بلّی، بندر، سانپ، بکری، چڑیا، طوطا، مینا، کوئل وغیرہ سے متعلق ایک وافر ذخیرہ سامنے آتا ہے اور یہ روایت پرانی ہونے کے باوجود آج بھی اتنی ہی مقبول ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اکیسویں صدی میں نئی نئی تبدیلیوں، ترقیوں اور نئے مسائل کو بچوں کے ادب میں برتا جا رہا ہے۔ ادب اطفال میں ان موضوعات کی پیش کش کا مقصد انھیں اپنے عہد کے مسائل اور ضروریات سے باخبر رکھنا ہے۔ اس لیے ہلکے پھلکے انداز اور سادہ زبان میں ان چیزوں کو پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

بچوں کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تخیل سے کام لیا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر بھی تخیل کی صلاحیت پیدا ہو، موجودہ دور میں بھی تخیل پر مبنی نظمیں لکھی جا رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایسی نظموں کے لکھنے پر توجہ دی جا رہی ہے جو حقیقت پر مبنی ہوں۔ سائنس کا دور ہے نئی نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں اس لیے ایسی نظموں کا اضافہ ہوا ہے جو بچوں کے اندر سائنسی ذہن پیدا کرنے میں معاون ہوں۔ جنوں اور پریوں کی جگہ راکیٹ اور روبوٹ

نے لے لی ہے علاوہ ازیں اکیسویں صدی کے بچوں کے ذہنی رویوں میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ گزشتہ صدی کے بچوں کے مقابلے میں یہ زیادہ ذہین واقع ہوئے ہیں ان معنوں میں کہ آج کے بچے کو یہ یقین ہو چکا ہے کہ چاند میں بڑھیا نہیں رہتی ایسی صورت میں اب چاند سے متعلق لکھی جانے والی نظم کا موضوع چاند میں بڑھیا اور چرخے تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ سائنسی کھوج بن گیا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ چاند پر بھی ایسی ہی زمین ہے جیسی ہمارے اردگرد ہے۔ ظفر گورکھپوری کی نظم

'چاند کوئی افسانہ نہیں' اس موضوع کی بہترین پیشکش ہے۔

اب تو علم کی پروازیں   اور ہی قصے کہتی ہیں
باجی اب تو مت بولو   چاند میں پریاں رہتی ہیں
چاند نہ اپنا ماموں ہے   اور نہ دیس وہ پریوں کا
چاند میں کوئی بڑھیا ہے   اور نہ بڑھیا کا چرخا
صدیوں صدیوں کھوج کے بعد   اب ہم نے یہ جانا ہے
چاند کوئی افسانہ نہیں   ایک حقیقی دنیا ہے
سردی گرمی دونوں تیز   آکسیجن کا نام نہیں
چٹانیں ہیں، کھائیاں ہیں   دھرتی سا آرام نہیں
ہو جائے گا پر اک روز   جی لینا آسان وہاں
اپنے جینے کا سامان   کر لے گا انسان وہاں
علم و ہنر کی دھارائیں   پیچھے کو کب بہتی ہیں
باجی اب تو مت بولو   چاند میں پریاں رہتی ہیں

اکیسویں صدی میں فطرت سے متعلق موضوعات میں جدت یہ آئی ہے کہ آج کی بڑھتی ہوئی آبادی، فیکٹری اور کارخانوں کی وجہ سے فضائی آلودگی بڑھ گئی ہے جو انسانی صحت کے لیے مضر ثابت ہو رہی ہے۔ پیڑ پودوں کو کاٹ کر عالیشان عمارتیں اور فیکٹریاں قائم کی جا رہی ہیں جس سے صاف ستھری اور تازہ ہوا میں سانس لینا محال ہو گیا ہے چنانچہ ایسی نظمیں تخلیق کی جا رہی ہیں جن سے بچوں کے اندر نیچر کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ پیڑوں کے فوائد اور ان کی اہمیت کا احساس پیدا ہو۔ فریاد آزر کی نظم 'آؤ بچو پیڑ لگائیں' شجاع الدین شاہد کی 'بادل تم کیوں نہیں آتے' احمد سعید اطہر کی 'جنگلوں کی بہار' اور شفیق اعظمی کے مجموعے 'بچوں کی نظمیں' میں شامل ان کی نظم 'پیڑ لگائیں' اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ فریاد آزر کی نظم ملاحظہ ہو۔

آؤ بچو پیڑ لگائیں / موسم کو گلزار بنائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں / دھرتی پر پانی برسائیں
پیڑوں سے سب کریں محبت
پیڑوں کی سب کریں حفاظت
دشمن ان کو کاٹ نہ پائیں / آؤ بچو پیڑ لگائیں
کمی آکسیجن کی نہ ہوگی
ہم سارے ہیں جس کے بھوگی
پیڑ صاف کرتے ہیں ہوائیں / آؤ بچو پیڑ لگائیں

فضائی آلودگی کے ساتھ ساتھ زمینی آلودگی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ سڑکوں اور چوراہوں پر کوڑے کرکٹ کی وجہ سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو انسانوں اور جانوروں دونوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ صفائی کا خیال رکھے اور اپنے بچوں کو بھی اس طرف توجہ دلائے تاکہ ان کے اندر اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا شعور پیدا ہو سکے اور بچوں کو اس طرف توجہ دلانے کا سب سے بہتر ذریعہ یہ ہے کہ انھیں اس موضوع سے متعلق کہانیاں یا نظمیں سنائی جائیں۔ بچوں کے ادب میں اس موضوع سے متعلق نظموں کا اضافہ ہوا ہے۔ نظم 'آیا سنہ دو ہزار اٹھارہ' دیکھیے۔

صاف صفائی کا ہے نعرہ   اور ایکتا کا ملا اشارہ
امن و اماں کا ہو نظارہ   آیا سنہ دو ہزار اٹھارہ

رہے سوچھ یہ دیش ہمارا   اور ہو ہم کو جان سے پیارا
کھلی جگہ نہ ہو ناکارہ   آیا سنہ دو ہزار اٹھارہ

موجودہ دور میں ایسی ایجادات سامنے آئی ہیں جو روزمرہ کی ضرورت بن گئی ہیں ان کے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی ہیں مثال کے طور پر بچہ دنیا میں آتے ہی اپنے اردگرد موبائل اور کمپیوٹر جیسی چیزیں دیکھتا ہے اور ان چیزوں میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے باعث وہ کتابوں سے دور ہو رہا ہے۔ وقت کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ لہذا کمپیوٹر، موبائل، انٹرنیٹ کو ایک اہم موضوع کے طور پر برتا جا رہا ہے اور اس طرح کی نظموں میں ان چیزوں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ فراغ روہوی کی نظم 'کمپیوٹر' جمال اختر کی 'موبائل فون' عطا الرحمٰن طارق کی 'انٹرنیٹ' محمد غلام کاشف ربانی کی 'ڈیڈی جی ایک ڈبہ لائے' غضنفر کی 'جادو کی ڈبیا' اس کے علاوہ حافظ کرناٹکی کی کتاب 'معصوم نغمے' میں شامل ان کی نظم 'زمانہ ہر پل بدل رہا ہے' اس موضوع پر بہترین نظمیں ہیں۔ حافظ کرناٹکی نے اپنی نظم میں آسان زبان میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم تکنیکی دور میں قدم رکھ چکے ہیں اور نئی چیزیں پرانی چیزوں کا بدل بن رہی ہیں۔ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چھوٹی چھوٹی مشینوں اور موجودہ دور کے ترقیات کا ذکر کرنے کے ساتھ انھوں نے بچوں کو زمانے کے ساتھ چلنے اور تکنیکی علوم حاصل کرنے کی نصیحت بھی کی ہے۔ غضنفر کی نظم 'جادو کی ڈبیا' ملاحظہ ہو۔

سنو اس میں جادو کی پڑیا پڑی ہے
یہاں کا وہاں کا تماشہ دکھائے
اسے جب گھماؤ تو دنیا گھمائے
یہ مشرق کو مغرب سے پل میں ملائے
یہ گھر بیٹھے بیٹھے سیاحت کرائے
بس اک آن میں دوریوں کو مٹائے
اسے کھٹکھٹاؤ تو گھونگھٹ اٹھائے
یہ فوٹو بھی بیٹھے ہی بیٹھے اتارے
ہمیں چاند سی اپنی صورت دکھائے
ہمارے بھی چہرے کا نقشہ ابھارے
اسے جب دباؤ تو یہ گنگنائے
یہ دیکھو تمھارا بھی فوٹو کھنچا ہے
انوکھی نرالی دھنیں یہ سنائے
تمھارے بھی چہروں کا نقشہ بنا ہے
بنا کچھ دبائے بھی یہ بولتی ہے
نہیں وقت کا صرف چکر چلائے
بنا کچھ ہلائے بھی یہ ڈولتی ہے
یہ ڈبیا تو تاریخ دن بھی بتائے
ضرورت ہو جس کی اسے یہ بلا دے
الارم کی دھن وقت پر یہ بجائے

آج کے اس مصروف دور میں لوگوں کی مشغولیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ان کے پاس اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ خاص طور سے جن گھروں میں ماں باپ دونوں ملازم ہیں ان گھروں میں بچہ بالکل نظر انداز ہو کر رہ گیا ہے والدین نوکروں کے رحم و کرم پر بچے کو چھوڑ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ والدین کی اپنے بچوں کے تئیں عدم توجہی کے موضوع کو ظفر گورکھپوری نے اپنی نظم 'کہانی ایک بچے کی' کا موضوع بنایا ہے۔

باپ اک کمپنی میں افسر ہے
ماں ملازم ہے ایک دفتر میں
گھر مرے جاگنے سے پہلے ہی
چھوڑ دیتا ہے باپ روزانہ
ماں کا معمول بھی کچھ ایسا ہے
صبح کا جانا رات کو آنا
سورج آتا ہے جب دریچے میں
نوکرانی مجھے جگاتی ہے
ناشتہ دے کے دودھ اور پھل کا
مجھ کو اسکول چھوڑ آتی ہے

کیسی ہوتی ہے ماں کی چمکاریں؟
کیسی ہوتی ہے باپ کی شفقت؟
کون مجھ کو لگائے سینے سے
ماں کو فرصت نہ باپ کو مہلت

آج کے اس ڈیجیٹل دور میں بچے کتابوں سے دور ہوتے جاتے رہے ہیں چنانچہ ان کے اندر کتابوں کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ فراغ روہوی کی نظم 'کتاب میلہ' اس کی عمدہ مثال ہے۔ گزشتہ صدی میں استاد کو جو عظمت حاصل تھی آج اس میں بھی کمی آئی ہے۔ بچے اساتذہ کی قدر نہیں کرتے لہٰذا ایسی نظمیں بھی سامنے آئی ہیں جن میں بچوں کے لیے اساتذہ کے احترام کا سبق ہے۔ حافظ کرناٹکی کی نظم 'استادوں کے دل پر چھاؤ' فراغ روہوی کی 'اسکول ٹیچر' اس موضوع پر بہترین نظمیں ہیں۔ اسی طرح فرقہ واریت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ زبانیں بھی اس کی زد میں آنے لگیں ہیں اور زبانوں کو بھی کمتری اور برتری کے پیمانوں پر تولا جا رہا ہے۔ چنانچہ بچوں کے اندر اردو زبان سے لگاؤ پیدا کرنے کے لیے بھی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔

مہنگائی کی وجہ سے استعمال کی اشیاء کے ساتھ ساتھ تعلیمی اخراجات بھی برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہو۔ مظفر حنفی کی نظم ''بچو تمہاری عیدی کیسے بڑھائی جائے'' مہنگائی کے مسئلے کو پیش کرتی ہے۔

تم خود ہی کہہ رہے ہو مہنگائی بڑھ گئی ہے
عام آدمی بچارا کیا کھائے کیا بچائے
بچو تمھاری عیدی کیسے بڑھائی جائے

موجودہ سماج میں کسانوں کی حالت ابتر ہے۔ کسان جس پر اناج کی پیداوار کا انحصار ہے اس کی شرح اموات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح مزدور جو سماج کی خدمت کرتے ہیں لیکن انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ان سے متعلق نظمیں کہی جا رہی ہیں تاکہ بچوں کے اندر ان کی قدر پیدا ہو سکے۔ کسان سے متعلق مظفر حنفی کی نظم 'چور چوہے اور بچے' ملاحظہ ہو:

بنجر کو زرخیز بنا کر/کھیتوں میں فصلیں لہرا کر
جو کھلیانوں کو بھرتا ہے/وہ کسان بھوکوں مرتا ہے
غلّہ تو چوہے کھاتے ہیں

بچو ایسا کب تک ہوگا/تم چاہو گے جب تک ہوگا
روکو اس سینہ زوری کو/محنت کش کو بھی کھانا دو
چوہے تم سے گھبراتے ہیں

ملک میں بچہ مزدوری کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچوں میں چائے کے اسٹالوں، ہوٹلوں اور دیگر جگہوں پر معصوم بچے جن کی عمریں ابھی کھیلنے کودنے کی ہوتی ہیں، چھوٹے سے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ لیے اپنا بچپن قربان کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی کرتب بازیوں سے کبھی مزدوری کر کے اور کبھی بھیک مانگ کر اپنے لیے رزق کا بندوبست کرتے ہیں۔ مصداق اعظمی کی نظم 'میں نہیں چاہتا' اسی مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میں نہیں چاہتا کوئی بچہ/ریل گاڑی کا فرش
صاف کرے/نٹ کی رسی پہ اب نظر آئے
جسم کو موڑنے کا فن سیکھے
شیر کے منھ میں ہاتھ کو ڈالے
تپتے بھٹوں کی اینٹ کو ڈھوئے
ہوٹلوں اور شراب خانوں کی
اپنے دامن سے میز صاف کرے
سانپ کو رکھ کے/اک پٹارے میں
شاہ راہوں پہ بھیک بھی مانگے
ناچ گانے سے سب کو/خوش کردے
بوٹ پالش میں خوب ماہر ہو
ماں کے آنچل سے دور ہو جائے
باپ کے ساتھ کام پر جائے
میں تو یہ چاہتا ہوں ہر بچہ
اپنے بچپن میں صرف بچہ ہو

موجودہ عہد میں معاشرتی بدعنوانیاں، جرائم، حادثات و اموات کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ انسانی زندگی بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔ آئے دن انسانیت سوز خبریں، اخباروں کے ذریعہ موصول ہوتی رہتی ہیں۔ انسانی ترقی کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوں اس طرح کے حادثات و واقعات کی خبریں ٹی وی چینلوں اور اخباروں کے ذریعہ سکینڈوں میں ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔ دوسری طرف انسانی ذہن نے اپنی سہولتوں کے لیے جو اشیا ایجاد کی ہیں وہی اشیا ان کی تباہی کا سبب بھی بنی ہیں نیز عدم انسانیت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ نچلے طبقے کے لوگ جو غربت کی زندگی جینے پر مجبور ہیں اگر ان کی رہائشی جھونپڑیاں کسی وجہ سے آگ کی نذر ہو جاتی ہیں تو موقع واردات پر کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچتا۔ بچوں کے لیے لکھی جانے والی نظموں میں یہ موضوعات بھی اپنی طرف توجہ مبذول کرانے لگے ہیں۔ مظہر الاسلام کی نظم 'پہیلی' میں ان تمام صورتِ حال کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے۔

کوئی طیارہ اغوا فضا میں ہوا
خیر سے ریل حادثہ ہوتے ہوتے بچا
جھونپڑی جھگیاں نذر آتش ہوئیں
عملہ آتش بجھانے کا تھا لاپتہ
بات انصاف کی سچی کہتا ہوں میں
جانے کتنی زبانوں میں چھپتا ہوں میں

مذہبی منافرت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ انسانیت کا قد اس کے سامنے بونا پڑ گیا ہے۔ تمام ممالک آپس میں کسی نہ کسی مسئلے کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر قابض ہونے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کبھی ہتھیار، کبھی تیل، کبھی مذہب ،اور کبھی صنعتی ترقی یہ تمام چیزیں ان آپسی جھگڑوں کا باعث ہوتی ہیں۔ بچوں کے ادب میں اس موضوع کو بھی اعتبار حاصل ہوا ہے تاکہ بچوں کے اندر آپسی منافرت کے بجائے آپسی محبت کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی کی نظم 'ترانہ اتحاد' میں بچوں کے اندر اتحاد پیدا کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔

بھارت، بنگلہ دیش ہو یا نیپال ہو پاکستان ہو
ترکی، کویت، کے ایس اے ،لبنان ہو ایران ہو
چین، فرانس و امریکہ ہو یا پھر انگلستان ہو
اب ان میں لڑنے بھڑنے کا کوئی نہ ہرگز کھیل ہو
دنیا کے سب دیشوں کا آپس میں ایسا میل ہو
ایسے ملیں چنتے ہیں جیسے اینٹیں ہم دیواروں میں
رنگ برنگے پھول گندھے ہوتے ہیں جیسے ہاروں میں
پیار و محبت، امن و سکوں کب رکھا ہے ہتھیاروں میں
لڑنے کا کارن اب دولت، مذہب اور نہ تیل ہو
دنیا کے سب دیشوں کا آپس میں ایسا میل ہو

مختصر یہ کہ اکیسویں صدی میں بچوں کی ترجیحات تبدیل ہوئی ہیں اب ان کی دلچسپی بے جان کھلونوں، پریوں اور جانوروں تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ لہٰذا بچوں کے ادب کے موضوعات بھی تبدیل ہو رہے ہیں ان کے ادب میں موضوعات کے سلسلے میں خوشگوار اضافے ہو رہے ہیں۔ دلچسپ نظمیں لکھی جا رہی ہیں مذکورہ مسائل کے علاوہ ہمارے سامنے اور بھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کو موضوع بنایا جا رہا ہے یا بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن بچوں کا ادب تخلیق کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ناصحانہ انداز نہ غالب ہونے پائے ورنہ بچوں کی دلچسپی برقرار نہیں رہ سکے گی۔

■

Atika Mahin
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

محمد اکبر

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورتوں کے مسائل

1960 کے بعد شاعری کی شروعات کرنے والی پاکستانی شاعرات میں ایک اہم نام فہمیدہ ریاض کا ہے۔ انھوں نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا تھا وہ طوائف الملوکی کا دور تھا جس کی وجہ سے وہ بہت متاثر رہی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد ریڈیو سے وابستگی نے ان کے سیاسی شعور کو بیدار کیا۔انھوں نے نیشنل اسٹوڈینٹ فیڈریشن سے وابستگی اختیار کی۔فہمیدہ ریاض چھپ چھپ کر اشتراکی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔انھوں نے کمیونسٹ پارٹی بھی جوائن کی تھی۔اشتراکیت سے دلچسپی کے سبب وہ فیض احمد فیض کی شاعری سے بہت متاثر تھیں۔ 1967 میں ان کا شعری مجموعہ 'پتھر کی زبان' منظر عام پر آیا۔اسی سال ان کی شادی بھی ہوگئی اور اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئیں،وہاں پر 1967 سے 1972 تک بی بی سی میں خدمات انجام دیں۔فلم سازی کا عملی تجربہ بھی کیا۔دوران قیام انگلینڈ انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کو بہت نزدیک سے دیکھا اور وہاں کے ادب کا مطالعہ بھی کیا۔عالمی تحریک آزادی برائے نسواں سے بہت متاثر ہوئیں۔کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہو کر انگلینڈ میں سوشلسٹ پارٹی کی رکنیت بھی حاصل کی۔ 1972 میں شوہر سے نا

خوشگوار تعلقات کے سبب وہ پاکستان آکر کراچی میں مقیم ہوگئیں۔ان کی دوسری شادی سندھ کے ایک شخص سے ہوئی جو ایک سماجی کارکن تھے اور سندھ میں چل رہی کسانوں کی تحریک سے وابستہ بھی تھے۔

فہمیدہ ریاض کو محسوس ہوا کہ سندھیوں کو ہر سطح پر نظر انداز کیا گیا ہے،لہٰذا انھوں نے دانشورانہ طور پر سندھیوں کی حمایت میں وقتاً فوقتاً بیانات جاری کیے،احتجاج کیا اور بے باکی کے ساتھ انسانی ہمدردی اور جذبہ صلہ رحمی کا زبردست مظاہرہ کیا۔ان کی نظموں کا مجموعہ 'بدن دریدہ' جب شائع ہوا تو ایک کہرام سا مچ گیا۔کیونکہ فہمیدہ ریاض نے ہر اس نقطے کو نشانہ بنایا تھا جس سے انسانیت پامال ہو رہی تھی۔بنی نوع آدم کے لیے خطرہ

تھا۔جنسیات سے متعلق انھوں نے بڑی بے باکی سے لکھا اور ایسے معاملات و مسائل پر قلم اٹھایا جو سماج اور معاشرے میں ناقابل بحث ہوا کرتے تھے،جس کی پاداش میں فہمیدہ ریاض معتوب ہوئیں۔اپنی بات کو عوام تک پہنچانے کے لیے انھوں نے 'آواز' نامی رسالہ جاری کیا،جو تقریباً چار سال تک پابندی سے شائع ہوا۔مجبوراً آخری شمارہ مارچ 1981 میں نکال کر بند کرنا پڑا۔اس کے بعد فہمیدہ نے ہندوستان کا رخ کیا۔ رسالہ آواز پر چودہ مقدمے کیے گئے۔ایک مقدمہ بغاوت کا بھی تھا۔بغاوت کی سزا پھانسی بھی ہوسکتی تھی۔لہٰذا وہ ہندوستان چلی آئیں اور سات برس تک یہیں رہیں۔ ہندوستان میں اپنے پڑھنے لکھنے کا کام جاری رکھا اور مختلف پروجیکٹ پر کام کرتی رہیں۔

فہمیدہ ریاض ایک کثیر الجہات شخصیت کی مالک ہیں، انھوں نے شاعری کے علاوہ افسانے، ناول اور خاصی تعداد میں سیاسی،سماجی اور ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ان کے شعری مجموعے کے نام بالترتیب یہ ہیں۔ پتھر کی زبان،بدن دریدہ،دھوپ، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے۔ ہمرکاب،اپنا جرم ثابت ہے اور آدمی کی زندگی۔ یوں تو

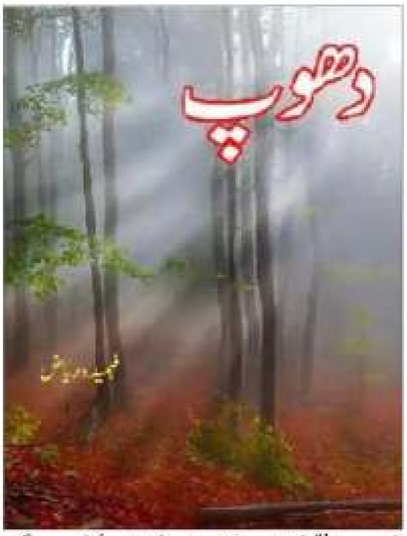

فہمیدہ نے نظم کی تمام ہیئتوں میں طبع آزمائی کی ہیں، مگر سب سے زیادہ انھوں نے آزاد نظم کے فارم کو اپنی تخلیقی کاوش کا حصہ بنایا ہے۔ البتہ غزلیں انھوں نے کم کہی ہیں، جوان کے دوسرے مجموعے، بدن دریدہ میں موجود ہیں۔ ترجمے کے میدان میں بھی انھوں نے اہم کارنامہ انجام دیتے ہوئے شیخ ایاز کے سندھی کلام کو اردو میں نہایت بلیغ ترجمہ کیا ہے۔ ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی فارسی کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ ن م راشد سے لے کر فہمیدہ ریاض تک کئی ادبی ہستیوں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن فہمیدہ کا ترجمہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ بذات خود فکر وفن کی سطح پر فرخ زاد سے مماثلت اور مطابقت رکھتی ہیں۔ ان کی یہ ترجمہ شدہ کتاب 'کھلے دریچے سے' کے نام سے 1988 میں پاکستان سے شائع ہوئی۔

ہر زمانے کا شاعر اور فنکار اپنے عہد کے محرکات کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ البتہ اس عہد کے سیاسی و معاشرتی نظام کے تحت اسلوب بیان اختیار کرتا ہے۔ 'پتھر کی زبان' فہمیدہ ریاض کا پہلا مجموعہ ہے، جو صرف 21 برس کی عمر میں شائع ہوا تھا۔ اس کی زیادہ تر نظمیں ایک نوعمر لڑکی کے خوابوں اور اس کے تصور کی عکاسی کرتی ہیں۔ عورت مرد کے ازلی رشتے اور اس رشتے میں جسم وجان کی قیمت پر بھی عورت کی جانب سے وفا کی ریت نبھانے کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل ایک نظم جھجک دیکھیے:

یہ مری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہتے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے نظریں کترا کے نکل جاتی ہے

(جھجک، پتھر کی زبان)

'پتھر کی زبان' کی بیشتر نظموں کی شروعات مایوسی اور اداسی سے ہوتی ہے۔ لیکن تقریباً سبھی نظموں میں ایک واضح موڑ آتا ہے، جہاں مایوسی اور اداسی کی جگہ ایک ایسی کیفیت لے لیتی ہے جسے امید، یقین، اثبات یا ایسے کسی رجحان کا نام تو نہیں دیا جاسکتا، لیکن بہر حال وہ کیفیت ہار مان لینے کی نہیں ہے۔ مثالیں دیکھیے:

اسی اکیلے پہاڑ پر تو مجھے ملا تھا
یہی بلندی ہے وصل تیرا
یہی ہے پتھر مری وفا کا
اجاڑ، چٹیل، اداس، ویراں
مگر میں صدیوں سے اس سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں
پھٹی ہوئی اوڑھنی میں سانسیں تری سمیٹے
ہوا کے وحشی بہاؤ پر اڑ رہا ہے دامن
نکیلے پتھر
جو وقت کے ساتھ میرے سینے میں اتنے گہرے اتر گئے ہیں
کہ میرے جیتے لہو سے سب آس پاس رنگین ہو گیا ہے
مگر میں صدیوں سے لپٹی ہوئی کھڑی ہوں

(پتھر کی زبان)

اس نظم کی پوری فضا یہ احساس دلاتی ہے کہ وصل کے بعد مرد عورت کو بھول گیا ہے۔ لیکن عورت وفا کی پاسداری میں مصروف ہے۔ اسی مجموعے میں ایک دوسری نظم 'گڑیا' ہے، جس میں مرد عورتوں کو گڑیا کی طرح بالکل بے جان چیز سمجھتا ہے اور اسے گڑیا بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بچہ جب تک اس کا جی چاہتا ہے کھلونوں سے کھیلتا ہے اور پھر دل بھر جانے پر اس کو الماری میں بند کر دیتا ہے۔ نظم دیکھیے گا:

چھوٹی سی ہے
اس لیے اچھی لگتی ہے
بوا جیسے ہونٹ ہیں اس کے
اور رخساروں پر سرخی ہے
نیلی آنکھیں کھولے بیٹھی تاک رہی ہے
جب جی چاہو کھیلو اس سے
الماری میں بند کرو
یا
طاق پر رکھو اسے سجا کر
اس کے ننھے لبوں پہ کوئی پیاس نہیں ہے
نیلی آنکھوں کی حیرت سے مت گھبراؤ
اسے لٹا دو
پھر یہ جیسے سو جائے گی

(گڑیا، پتھر کی زبان)

جو چیز سب سے زیادہ یہاں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ نظم کا آخری حصہ ہے۔ یعنی مرد یہ سمجھتا ہے کہ عورت اس کی خود غرضی سے واقف نہیں ہے، مگر کم و بیش ہر عورت سب کچھ سمجھ رہی ہوتی ہے، لیکن اس کے اندر اظہار کرنے کی جرأت نہیں ہو پاتی۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں مختلف موضوعات کے علاوہ جو چیز واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے اور جس سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے وہ تانیثی مسائل ہیں۔ جہاں وہ پورے نظام سے نبرد آزما ہیں۔ فہمیدہ ریاض کے سوچنے کا یہ انداز ہے کہ جس نظام میں عام انسانوں کے حقوق سلب ہو جائیں اور ایسے سماج میں عورتوں کے اوپر دوسرے خارجی مسائل کا بار اس قدر ڈال دیا جاتا ہے کہ اسے سوچنے کا موقع تک نہیں دیا جاتا۔ پھر وہ مخلوق اٹھنا چاہتی ہے، ایسے میں جب وہ پردہ پھاڑ کر باہر آتی ہے تو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ پاکستان کی تانیثی شاعری اسی سماجی و سیاسی جبر تلے محرومی و بے بسی کے رد عمل کے طور پر ایک احتجاج، بغاوت اور سرکشی و مزاحمت کی شاعری ہے۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری نے ان کے وجود کو ثابت بھی کیا اور عصری نظام سے تسلیم بھی کرایا۔ گویا ان کی شاعری سماج کا اعتراف نامہ ہے:

وصال ہجر کی باتیں پرانے قصے ہیں
شکست دل تو بڑی عام سی کہانی ہے
نئے زمانے میں جذباتیت سے کام نہ لو
وہ ایک ذرا سی شرارت ہی کیا محبت تھی

(مجبوری۔ پتھر کی زبان)

پتھر کی زبان میں فہمیدہ کے یہاں جس مردانہ ذہنیت کے خلاف احتجاجی شعور تشکیل پاتا ہوا نظر آتا ہے وہ ان کے دوسرے مجموعے بدن دریدہ میں مکمل ہو جاتا ہے۔ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ ہم عورت ضرور ہیں، لیکن سماج میں ہماری ایک فرد کی حیثیت بھی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کی مرکزی فکر عورت اور اس کے مسائل ہیں۔ انھیں یہ شکایت ہے کہ آخر یہ مرد سماج ہمیں صرف ایک وقتی ضرورت کی شئے کیوں سمجھتا ہے، جب کہ ہم اس کے علاوہ بھی تو ہیں۔ اسی احساس کو انھوں نے اپنی ایک نظم 'کب تک' میں پیش کیا ہے:

کب تک مجھ سے پیار کرو گے
کب تک
جب تک میرے رحم سے بچے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس سے آگے بھی تو کچھ ہے

وہ سب کیا ہے
کسے پتا ہے
وہیں کی ایک مسافر میں بھی
انجانے کا شوق بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہوگے تب تک

(کب تک، بدن دریدہ)

فہمیدہ ریاض ایک ایسی بے باک و نڈر فنکار ہیں، جن کا کوئی ثانی نہیں۔ افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی نے جنسی موضوعات کو جس بے باکی سے ابھارا تھا، شاعری میں اسی طرح کے موضوعات کو فہمیدہ ریاض نے نہ صرف برتا ہے، بلکہ اس کا حق بخوبی ادا کیا ہے۔ جن موضوعات کو دوسری شاعرات شجر ممنوعہ سمجھ کر کبھی چھونے کی جرأت نہ کر سکیں، فہمیدہ نے اپنی شاعری میں بے باکانہ ان کا اظہار کیا ہے۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری کو جنسی لذت پرستی کا الزام دے کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی اور سیاسی مہم جوئی کی شاعری کا الزام بھی لگا۔ مگر ان کی شاعری شعری لوازمات اور فنی خوبیوں سے پوری طرح آراستہ ہے، جمالیاتی محاسن سے بھرپور ان کی شاعری میں ایک پیغام ہے۔ چونکہ فہمیدہ ریاض جس سماج میں رہیں، وہ سماج جبر واستبداد سے بھرا ہوا تھا۔ فہمیدہ نے اگر جنسی موضوعات کو چھوا تو انھوں نے مرد عورت کے جبلی تعلقات کی فطری ضرورت کو اپنی نظموں میں برتا بھی ہے۔

فہمیدہ کی شاعری میں ایک ایسی متحرک اور فعال عورت کارفرما نظر آتی ہے، جو اپنے مکمل وجود کی اہمیت کو مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں منوانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ اسے احساس ہے کہ سماج کا کوئی بھی ادارہ ہو، وہ عورت کو صرف تابع ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے فہمیدہ روایتی معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں باکرہ، تمہارے بیچ، وہ ایک زن ناپاک ہے، ایک عورت کی ہنسی، اک زن خانہ بدوش اور ایک لڑکی وغیرہ یہ ایسی نظمیں ہیں جن میں ایک عورت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ عورت کے بارے میں مردانہ رویہ یہ ہے کہ اس کا انکار بھی اقرار سمجھا جاتا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر یہ مظہریت کی نفی ہے، مگر انھوں نے اس کا اظہار کھل کر کیا ہے۔

جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے
جو میرے دل میں ہے اس حرف رائیگاں پہ نہ جا

مرد زیادہ تر عورت کی ظاہری شکل وصورت سے متاثر
ت وخیالات کے بارے
میں جہاں مروجہ نظام سے

فہمیدہ ریاض کی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔انھوں نے عورتوں کے مسائل پر کھل کر آواز اٹھائی ہے۔ ان کا تخلیقی سفر مارشل لا کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔اس لیے جبرو استحصال کے خلاف اور جمہوری واشتراکی نظام کی حمایت میں ہمیشہ لکھتی رہیں۔وہ فیض سے متاثر نظر آتی ہیں، مگر ان کا اپنا لب و لہجہ ہے۔فہمیدہ ریاض کے یہاں ہجرت کا درد بھرا ہوا ہے اور ان کی شناخت تانیثی مسائل سے ہوتی ہے۔

انحراف تیغ کی تلوار کی دھار پہ چلنے کے مانند ہے۔ فہمیدہ ریاض کو کبھی کبھی اس ڈگر پر تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ نظم سورہ یاسین دیکھیے:

سوکھے حلقوم اور بیٹھے دل سے سوچتی ہوں
شاید میں رستہ بھول گئی
یہ راہ تو میری راہ نہیں
اس راہ سے میں کب گزری تھی
سب گلیوں پر یہاں نام لکھے
اس گلی پہ کوئی نام نہیں

(سورہ یاسین۔ بدن دریدہ)

حاشیہ نظم اس جاگیردارانہ ذہنیت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں شرم وحیا کے نام پر عورتوں کا صدیوں سے استحصال ہو رہا ہے۔ جہاں نظم میں طنزیہ عنصر پیش ہوا ہے، وہیں ایک معنویت بھی پیدا ہو گئی ہے:

کبھی تم نے سوچا
کہ روز کر جب اپنی قدروں کا
اور اپنے، مشرق کے اخلاق، کی رفعتوں کا
جہاں سے نظر تم کو آتا رہا ہے
تمدن پرایا نہایت حقیر
کرو جب رقم زرفشاں داستاں
تو اک حاشیہ اس میں تاریک چھوڑو
کہ لیٹی ہوئی ہیں وہاں باحیا مشرقی عورتیں
جن کو چشم فلک نے نہ دیکھا کبھی
وہاں درج ہے ان کے جسموں پہ
خود ان کے ہاتھوں سے تحریر ہوتی کہانی
تسلسل سے اب تک لکھی جا رہی ہے
بہت قابل رحم یہ داستاں
ہے تمہارے تمدن کا وہ حاشیہ
کہ اوجھل رہا سب کی نظروں سے اب تک
اب اتنا بتا دو
کہ تم اس سے نظریں چراؤ گے کب تک؟

(حاشیہ، آدمی کی زندگی)

فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں ایک عورت کے تجربات کو انتہائی بے باک اظہار سے مربوط کر کے اور ان کا رشتہ زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں سے قائم کر کے پیش کیا ہے۔ ایک عورت اپنی زندگی میں جن تجربات سے گزرتی ہے، ان میں وہ ایک محبوبہ بھی ہوتی ہے، ایک بیوی بھی اور ایک ماں بھی۔ پتھر کی زبان کی نظمیں اگر ایک نوعمر لڑکی کے تجربات اور احساسات کا آئینہ ہیں تو، بدن دریدہ، دھوپ اور آدمی کی زندگی کی نظمیں ایک لڑکی سے عورت اور عورت سے ایک ماں بننے تک کے سفر میں عورت کے تجربات کی سچی اور دلکش تصویریں ہیں۔ جیسا کہ رام لعل نے بیان کیا ہے:

"لڑکی سے عورت اور عورت سے ماں بننے تک کے سفر میں جو تصویریں 'بدن دریدہ' اور 'دھوپ' کے زاویوں اور کرنوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہیں وہ ذاتی، دھاردار اور ست رنگی ہیں۔ ذاتی اس حوالے سے کہ اس سے پہلے ایسی باتیں ہم نے کسی عورت کی زبان سے نہیں سنیں۔ دھاردار اس حوالے سے کہ ایسا بے باک لہجہ، ایسے بے باک خیالات کے جلو میں اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا اور ست رنگی اس حوالے سے کہ فہمیدہ نے ہر تجربہ کو ہری بھری رتوں، ساون کی بارشوں اور بہار کے حسن کی لذتوں اور منظروں کو گود میں پال کر جوان کیا ہے۔"

(رام لعل، فہمیدہ ریاض، بشمول دریچوں میں رکھے چراغ (ادبی خاکے)، شانتی نکیتن، لکھنؤ، 1991 ص 295)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فہمیدہ ریاض کی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل پر کھل کر آواز اٹھائی ہے۔ ان کا تخلیقی سفر مارشل لا کے زمانے میں شروع ہوا تھا، اس لیے جبر و استحصال کے خلاف اور جمہوری واشتراکی نظام کی حمایت میں ہمیشہ لکھتی رہیں، وہ فیض سے متاثر نظر آتی ہیں، مگر ان کا اپنا لب و لہجہ ہے۔ فہمیدہ ریاض کے یہاں ہجرت کا درد بھرا ہوا ہے اور ان کی شناخت تانیثی مسائل سے ہوتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری میں عورتوں کے مسائل کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ یقیناً غیر معمولی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان شاعری عورتوں کے مسائل کا ایک ایسا آئینہ ہے، جہاں اہل نظر بہت کچھ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

■

Dr Mohd Akbar
Assistant Professor
CPDUMT, MANUU
Hyderabad - 500032 (Telangana)

منظور احمد

پروفیسر عبدالمغنی

ڈاکٹر عبدالمغنی نقاد بھی، مفکر بھی ہیں اور مدبر بھی، مبصر بھی اور مقرر بھی، ماہر اقبالیات بھی ہیں اور ماہر اسلامیات بھی، ان سب خوبیوں کے علاوہ زبردست تحریکی و تنظیمی خوبیوں کے مالک بھی۔ ریاست بہار میں اردو کو جو مقام و مرتبہ ملا، اس کے لیے انھوں نے جو جدوجہد کی، اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر انجمن ترقی اردو کی ہر ریاستی شاخوں کو ان جیسا فعال، سرگرم، متحرک اور دوراندیش قائد مل جائے تو وہ دن دور نہیں کہ اکثر ریاستوں میں اردو زبان کو دوسرا درجہ مل جائے گا۔

لیکن اس مضمون میں آپ کی قلمی کاوشوں اور تخلیقی و تنقیدی بصیرت کے تعلق سے کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس کام کو دوسرے اہل قلم پر چھوڑتا ہوں۔ یہاں صرف چند واقعات اور تاثرات کو سپرد قلم کرتا ہوں، جن کا تعلق ان کی باغ و بہار شخصیت سے ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی گراں قدر تخلیقات پڑھ کر اور اس سے زیادہ آپ کے تحریکی و تنظیمی کارنامے بلکہ کرامات کو سن کر آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ 1988 میں انجمن کی کل ہند کانفرنس دلی میں منعقد ہوئی تو شرف نیاز حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حسن اتفاق کہ افتتاحی اجلاس میں میرے بالمقابل جو شخصیت جلوہ افروز ہوئی، وہ پروفیسر عبدالمغنی کی تھی۔ صورت اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بے نظیر اور قد آور پایا۔ چہرے سے عظمت و جلال، چشمے کے فریم سے جھانکتی ہوئی روشن آنکھیں، بلکہ نورانی داڑھی، قیمتی شیروانی، سر پر اسی رنگ کی ٹوپی، پاؤں میں انگریزی جوتے، مزاج مولویانہ مگر ذوق مجتہدانہ، حق گو بے باک، علم و وقار کا پیکر، خلوص و محبت کی جیتی جاگتی تصویر، اردو کا بے تاج بادشاہ۔

ڈاکٹر صاحب بی این کالج، پٹنہ میں انگریزی کے پروفیسر تھے، جن کو کوئی عربی کا پروفیسر سمجھتا ہے تو کوئی اردو کا ریڈر، جنھوں نے ساری عمر روٹی انگریزی کی کھائی مگر اردو زبان و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انھوں نے انگریزی ادب کو کچھ نہیں دیا۔ انگریزی زبان میں تین چار کتابوں کے علاوہ بے شمار مضامین سپرد قلم کیے۔ ملک کے موقر انگریزی روزنامہ 'ٹائمز آف انڈیا' میں آئے دن ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے۔ ایک زمانے میں ہفت روزہ 'ریڈینس' کا ہر شمارہ ان کے مضمون سے مزین ہوتا تھا۔ 'ریڈینس' اور 'دعوت' میں شائع شدہ مقالات کو یکجا کرکے کتابی شکل دے دی جائے تو ایک اہم علمی خدمت ہوگی۔

ایک اچھے معلم میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ معلم کو اپنے پیشے سے لگاؤ نہیں رہتا تو پھر طلبہ میں علم و لیاقت کہاں رہے گی۔ ویسے مجھے ان کے کسی طالب علم سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، مگر میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ لکھ سکتا ہوں کہ ان کی تدریسی زندگی یقیناً بے نظیر ہوگی اور ان کے بے شمار شاگرد آپ پر فخر کرتے ہوں گے۔

ادیب کو چاہیے کہ ادب کے معیار کو اتنا نہ گھٹا دے کہ وہ چوراہے کی چیز بن جائے۔ ادیب کو چاہیے کہ وہ ہر حال میں ایسا ادب تخلیق کرے جو معاشرے کے لیے باعث مسرت و افتخار ہو، ڈاکٹر صاحب کی تحریریں یقیناً ہمیں افکار کی بلندی اور ادب کی چاشنی عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قلم میں بڑی روانی ہے، تقریر تو ٹھہر ٹھہر کر کرتے ہیں مگر قلم کی روانی حیرت انگیز ہے، اردو بھی، انگریزی بھی، صفحات کے صفحات ایک نشست میں روشن کر دیتے ہیں۔ نظر ثانی کی ضرورت تک نہیں پڑتی۔ چاہے کوئی اخباری بیان ہو یا ادبی مضمون فرفر لکھتے ہیں۔ خط بھی بڑا عمدہ اور قابل رشک ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زودنویسی کا ایک واقعہ سنیے 'فکر و آگہی' کا رفعت سروش نمبر کتابت و طباعت کے آخری مرحلے میں تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک تقریب میں ہماچل بھون نئی دلی میں بیٹھا ہوا تھا۔ سروش مرحوم تشریف لائے، علیک سلیک کے بعد کہا کہ آپ نے سروش نمبر کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ مجھے نہ مدیرہ کی طرف سے کوئی خط ملا اور نہ آپ نے کبھی اس کا ذکر کیا۔ موصوف نے کہا کہ اگر اب بھی لکھیں تو شامل اشاعت ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ اپنی چند غزلیات اور منظومات (نثری اور آزاد نظم کے سوا) مجھے کل صبح دیجیے۔ میں پرسوں پٹنہ جانے سے قبل مضمون آپ کے حوالے کردوں گا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہمارے اکثر اہل قلم فرمائشی مضامین کے لیے تاخیر یا تساہل سے کام لیتے ہیں، جس سے ہمارے اخبارات اور رسائل کے مدیروں کا وقت اور روپے برباد ہوتے ہیں اور خصوصی نمبروں کی اشاعت میں خاصی تاخیر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے تبصرے بھی بڑے لاگ ہوتے تھے۔ وہ مصنف یا مولف کے منصب یا مسلک کو نہیں دیکھتے بلکہ تخلیق کو دیکھ کر بڑے جاندار غیر جانب دار تبصرے 'مریخ' میں شائع کرتے تھے۔ بات کہاں سے کہاں جا پڑی، میں کیا لکھنا چاہتا تھا اور کیا لکھ گیا۔ باتیں ان کی شخصیت کے تعلق سے قلمبند کرنا چاہتا تھا، فن پر آ گیا— خیر، آیئے اب آپ کی پروقار اور پرکشش شخصیت کے تعلق سے کچھ باتیں عرض کروں۔ بڑے ہمدرد اور مہمان نواز ہیں۔ ان کی ہمدردی اور مہمان نوازی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

دلی میں عبدالمغنی صاحب سے کئی ملاقاتوں کا شرف رہا، جو بڑی پرتکلف اور دلچسپ ہی نہیں بلکہ یادگار بھی ثابت ہوئیں۔ پھر بھی آپ سفر میں اور میں بھی مسافرت میں۔ اب وہ وقت آیا کہ آپ حضر میں اور میں سفر میں— میں پہلی بار پٹنہ اس وقت پہنچا جب بھاگلپور (نومبر 1989) میں آزاد ہند کا بدترین فساد بلکہ نسل کشی نقطہ عروج پر تھی۔ اس فساد میں جو جانی مالی نقصان ہوا اس نے تمام سابقہ ریکارڈز کو مات دے دی ہے جس سے دنیائے انسانیت تہہ و بالا ہوگئی تھی۔ 'اردو بھون' کے معمار کو اردو بھون کے باہر بار بار دیکھ چکا تھا، اردو بھون میں فروکش ہوتے ہوئے دیکھنے کی آرزو لیے ہوئے فسادات کی پروا کیے بغیر ایک صبح پٹنہ پہنچ گیا، پھر اردو بھون— معلوم ہوا

کہ آپ دفتر میں شام چار بجے آتے ہیں۔ اردو بھون سے سیدھے ان کے دولت کدے بمقام وارثی گنج، عالم گنج جانا چاہا تو اطلاع ملی کہ اب ان کا قیام وہاں نہیں رہا، بلکہ اردو بھون کے قریب ہی سائنس کالج کے احاطے میں ہے۔

بھاگلپور کے فسادات کے اثرات کی وجہ سے پٹنہ کی فضا بھی مکدر تھی اور الیکشن کے ہنگامے بھی اپنے شباب پر، بقول شخصے آزادی کے بعد پہلی بار عظیم آباد میں بھگدڑ مچی تھی۔ اس ماحول کی پروا کیے بغیر آپ کے در دولت پر پہنچا تو بڑا پرتپاک استقبال کیا اور میری غیر متوقع آمد پر مسرت اور حیرت کا اظہار کیا۔ ناشتے کا اہتمام کرایا اور کہا کہ یہ فی البدیہہ ناشتہ ہے، کرلیجیے۔ پھر شام میں پرتکلف عشائیہ کا اہتمام بھی کیا۔ دیر تک گفتگو کی، اردو کی صورتِ حال، انتخابات، فسادات وغیرہ پر بڑی گہری تشویش ظاہر کی۔ سوء اتفاق کہ آپ کے آفس سکریٹری جناب افتخار عظیم چاند بھی بھاگلپور گئے ہوئے تھے اور واپس نہیں ہوئے تھے جس کی وجہ سے بار بار آپ کے چہرے سے بے اطمینانی اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں مگر آپ کی زبان پر صرف عظیم صاحب کا نام بار بار آرہا ہے۔

ہمارے کچھ قائدین نے اردو تحریک کے نام پر اپنی سیاسی دکان چمکائی۔ اردو کے پلیٹ فارم کو غلط استعمال کیا۔ اردو کے نام پر ذاتی منفعت حاصل کی، نام اردو کا لیا، کام اپنا کرتے رہے، عہدے اور کرسی کے پیچھے دوڑتے رہے، اردو تحریک کا دم بھرتے رہے اور عین وقت پر حکومت اور حکام سے سودے بازی کرکے تحریک کو سخت نقصان پہنچایا، مگر ڈاکٹر عبدالمغنی کی شخصیت اس طرح کی کسی بھی بددیانتی اور فرض ناشناسی سے مستثنٰی ہے۔ آپ چاہتے تو بڑا سے بڑا عہدہ ملتا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ بڑے بڑے عہدے آپ کو پیش کیے گئے، کبھی اردو اکادمی کی صدارت تو کبھی اردو بھون سے نکال کر ہندستان کے کسی بھی راج بھون میں گورنر کی کرسی پر فائز کرنے کا منصوبہ ان کے سامنے رکھا گیا مگر انھوں نے ان سب عہدوں کو ٹھکرادیا اور انجمن کی قیادت کو ان سب عہدوں پر اہمیت دی، اس کی صدارت کے لیے باقاعدہ جمہوریت کے دائرے میں رہ کر الیکشن لڑا اور ہمیشہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے

وہی بشارت منزل ملی مرے دل کو
خلوص دل سے اٹھایا قدم جہاں میں نے

صوبۂ بہار کی اردو تحریک کو ایک طرف رکھیں، ملک کی دوسری ریاستوں کی تحریکوں کو ایک طرف تو بہار کی تحریک کی کامیابی وکامرانی ہی زیادہ نظر آتی ہے۔

مختلف ریاستوں کی انجمن کی شاخوں کی سرگرمیوں اور کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور بہار (سوائے آندھرا پردیش انجمن کے) شاخ کی سرگرمیوں اور کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو بہار کی انجمن ہی سبقت لے جائے گی۔ ممبر سازی کے معاملے میں تو بہار کی شاخ سب سے آگے ہے۔ اتنی بھاری تعداد میں ممبر سازی کسی ریاست میں نہ ہوسکی۔ انجمن کی ممبرشپ سیاسی جماعتوں کی ممبرشپ سے زیادہ ہے۔ یہ سب دراصل ڈاکٹر صاحب کی دوراندیشی، قائدانہ، جدوجہد اور سعی پیہم کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جب بھی حکومت سے کوئی مطالبہ کیا، تو عاجزی یا جی حضوری سے نہیں بلکہ پرزور اور پراثر انداز ہی سے اپنا حق طلب کیا۔ جب کبھی حکومت نے دیر سویر سے کام لیا تو بڑے سخت احتجاجی بیان جاری کیے۔ انھوں نے انجمن کے پلیٹ فارم سے نہ صرف اردو زبان و ادب کے مسائل، بلکہ ملی وقومی مسائل کو ایوانِ حکومت تک بڑی گھن گرج کے ساتھ پیش کیا۔

ڈاکٹر صاحب خوش پوشاک ہی نہیں خوش خوراک بھی تھے اور خوش مزاج بھی۔ ایک مرتبہ ہم دونوں کا قیام جماعت اسلامی کے مہمان خانے (چتلی قبر دلی) میں تھا۔ صبح کی نماز کے فوراً بعد آپ نے پرتکلف ناشتے کا اہتمام کیا اور مجھے بھی دعوت دی۔ میں نے کہا علی الصباح میرا ناشتہ بقدر بادام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ برہمن ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے لفظ برہمن مجھے بڑا ناگوار گزرا، ڈاکٹر صاحب نے میری ناگواری کو بہت جلد محسوس کیا اور کہا کہ جناب اقبال نے بھی برہمن زادہ ہونے پر فخر کیا ہے۔ پھر علامہ کے مشہور فارسی اشعار پڑھ کر میری ناگواری دور کردی ہے

میر و مرزا بہ سیاست دل و دین باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجا است

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رجز آشنائے روم وتبریز است

ماہر اقبالیات سے اقبال کے اشعار سن کر محظوظ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری ایک شکایت کو دور کردی، تاہم آپ کی ذات سے مجھے ایک اور شکایت ضرور ہے اور وہ جائز بھی ہے اور برحق بھی۔ آپ نے اپنی تمام تر صلاحیت، قوت، لیاقت اور طاقت کو صرف اور صرف صوبہ بہار کے لیے مختص کردیا۔ آپ بہت ہی کم عمری میں انجمن سے وابستہ ہوئے۔ آپ کے بے شمار تجربوں، مشاہدوں اور جذبوں کے پیش نظر کاش آپ کل ہند انجمن کے صدر منتخب ہوتے یا صدارت کی پیش کش آپ کو کی جاتی تو آج بہار کے علاوہ ملک کی دیگر شاخیں بھی یقیناً بہتر طریقے پر اپنے فرائض انجام دیتیں اور زیادہ فعال اور سرگرم نظر آتیں۔ اردو کے چرچے بہار کے ساتھ ساتھ ملک کی بہت سی ریاستوں میں بھی ہوتے۔

ہمت کے دھنی جب الجھیں گے دریا کی تلاطم خیزی سے
موجوں کے تھپیڑے کیا ہوں گے، طوفان کا دھارا کیا ہوگا؟

ڈاکٹر عبدالمغنی کو شاندار مجاہدے، ریاضت اور ملازمت میں پوری پوری ایمانداری، قابل فخر حب الوطنی، قابل تقلید کارناموں کے باوجود جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی مگر یہ تو ایک طرح سنت یوسفی تھی اور ان کی بے گناہی ثابت ہوئی اور ہر طرح کے الزام سے بری ہوئے۔ ان کا جیل جانا شاید چند دوست نما دشمنوں کے اور منافقوں کے کارنامے تھے۔ انھوں نے بڑی دوراندیشی اور اولوالعزمی سے کام لیا۔

اردو تحریک کا یہ بے مثال قائد، نامور ادیب، دیدہ ور نقاد، انگریزی زبان کے مایہ ناز استاد، جب ملک بھر میں یوم اساتذہ 5 ستمبر کو منایا جارہا تھا تو داعی اجل کو لبیک کہا، جس کے کارنامے نہ صرف ریاست بہار میں بلکہ پورے ملک کے لیے ناقابل فراموش اور یادگار ہیں۔

■

Syed Manzoor Ahmad
H.I.G-2, Bada Makan Layout
Mysore - 57007 (Karnataka)
Mob.:09731634434

رفیق اشفاق

اردو طنز و ظرافت کا یوسفِ گم گشتہ

یوسف ناظم

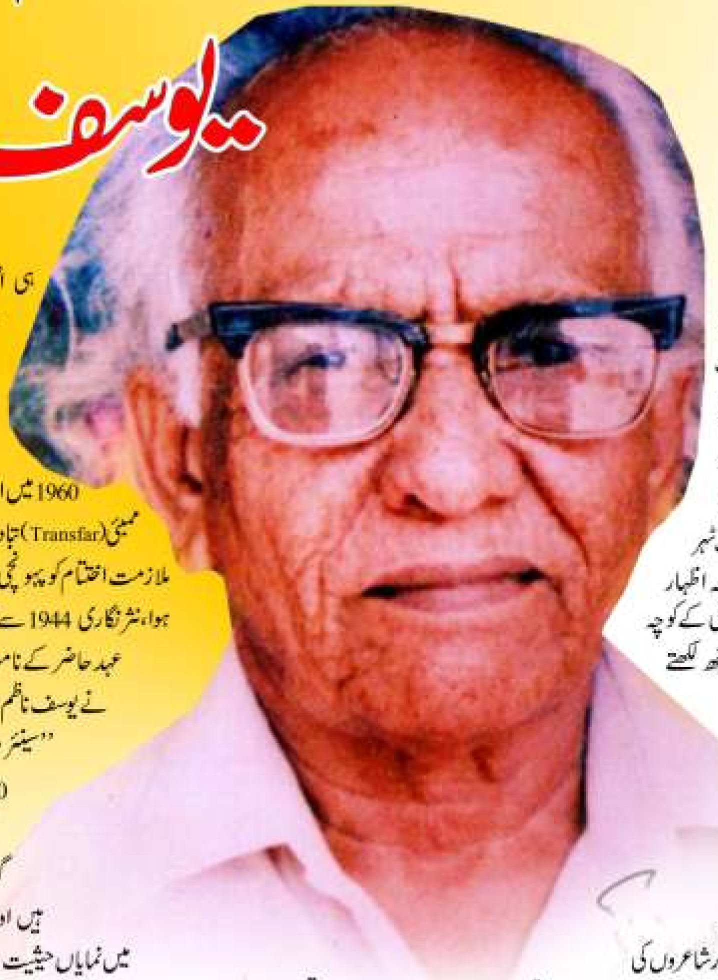

اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کی علمی و ادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں آپ کا نام سید محمد یوسف اور تخلص ناظم تھا ادبی حلقوں میں یوسف ناظم کے نام سے مشہور و مقبول ہیں ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے ہوا مگر اس وادیٔ پُرخار میں زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکے اور نثر نگاری کو مستقل طور سے وسیلہ اظہار بنایا 1944 میں باقاعدہ طور پر طنز و مزاح نگاری کے کوچہ میں قدم رکھا ابتداء میں محتاط رویہ کے ساتھ لکھتے رہے مگر آگے چل کر بہتات نویسی کا شکار ہو گئے اور بادلِ ناخواستہ بسیار نویسی کے چکر میں پڑ کر اپنی تحریروں میں اعتدال و توازن کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکے اور زیادہ لکھ کر کم شہرت و مقبولیت پانے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

اردو زبان و ادب میں عام دانشوروں اور شاعروں کی طرح یوسف ناظم کی تاریخ ولادت میں بھی معمولی سا الٹ پھیر ہوا ہے اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی ماخذ کا سہارا لیتے ہوئے خود یوسف ناظم کے حوالے سے ان کی تاریخ پیدائش کو پیش کیا جائے تا کہ تحقیق کی راہوں میں حائل دشواریاں خود بخود کافور ہو جائیں اس سلسلے میں یوسف ناظم نے اپنے مزاحیہ مضامین کے مجموعے 'سائے ہمسائے' مطبوعہ 1975 کے گرد پوش والے صفحہ میں لکھا ہے"۔

میری تاریخ پیدائش نومبر 1921 بتائی جاتی ہے لیکن اپنی درج شدہ پیدائش کے حساب سے نومبر 1918 میں نمودار ہوا"۔

واضح رہے کہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے ایک مستند و معتبر کتاب 'دستاویز' کے نام سے 1983 میں شائع ہوئی تھی جس میں ادیبوں، دانشوروں اور نثر نگاری کی خود نوشت سوانح شامل ہے مذکورہ کتاب کے صفحہ 381 پر یوسف ناظم اپنی خودنوشت میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"میری سوانح حیات بڑی آسان سی ہے میرا وطن جالنہ ہے جو پہلے ضلع اورنگ آباد کا تعلقہ تھا اب بجائے خود ایک ضلع ہے (اس ترقی کا میری ولادت سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے) 7 نومبر 1921 کی پیدائش ہے سن پیدائش سرکاری ریکارڈ میں 1918 درج ہے جس کا مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا بلکہ خود کو کافی بڑا محسوس کرتا رہا، جالنہ ہائی اسکول سے میٹرک اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹر کے امتحانات کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں داخلہ لیا 1942 میں بی۔اے اور 1944 میں اردو میں ایم۔اے کیا ایم۔اے کے لیے اردو میں ظرافت نگاری پر ایک طویل مقالہ (275) صفحات کا لکھا، 1944 ہی میں ریاست حیدر آباد کے محکمۂ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی 1946 میں شادی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اصل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا ریاست حیدر آباد کی تقسیم کے بعد کچھ دنوں میسور میں بھی رہا اور 1957 میں ریاست مہاراشٹر کے لیے نامزد ہوا، 1960 میں اسسٹنٹ لیبر کمشنر کی حیثیت سے ممبئی (Transfar) تبادلہ ہوا۔ اور دسمبر 1976 میں یہیں ملازمت اختتام کو پہونچی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا، نثر نگاری 1944 سے شروع ہوئی"۔

عہد حاضر کے نامور دانشور اور مزاح نگار نامی انصاری نے یوسف ناظم کے بارے میں لکھا ہے:

"سینئر مزاح نگار یوسف ناظم 7 نومبر 1920 کو جالنہ ضلع اورنگ آباد آندھرا پردیش میں پیدا ہوئے گذشتہ 40 سال سے بمبئی میں مقیم ہیں اور وہاں کی ادبی و ثقافتی محفلوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں دہلی کے غالب ایوارڈ اور مدھیہ پردیش کے جوہر قریشی سمان سے نوازے جا چکے ہیں طنز و مزاح پر ان کی تقریباً دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مزاحیہ مضامین کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے خاکے بھی بہت پر لطف اور خیال انگیز ہوتے ہیں ان کا ایک مزاحیہ سفر نامہ 'امریکہ میری عینک سے' منظر عام پر آچکا ہے، ان کا مزاح بڑا شائستہ اور لطف انگیز ہوتا ہے لیکن شخصیت پر لکھے گئے خاکوں میں ذرا بھی رعایت نہیں برتتے اور جس کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیتے ہیں، ان کے مزاح میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ متانت بھی موجود ہوتی ہے وہ طنز کے نشتر بھی آزماتے ہیں مگر اس کی دھار اکثر کند کر کے پیش کرتے ہیں تا کہ قاری اس کو ہنس کر سہہ لے۔"

(بیسویں صدی میں طنز و مزاح: نامی انصاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2002 ص 244)

یوسف ناظم کی تاریخ ولادت کے تعلق سے نامی انصاری کا بیان محلِ نظر ہے کیونکہ ان کی صحیح تاریخ پیدائش سرکاری ریکارڈ کے مطابق نومبر 1918 ہے جس کا تذکرہ یوسف ناظم نے اپنی خودنوشت سوانحی مضمون میں کیا ہے یوسف ناظم صرف میدان ظرافت کے شہسوار ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے عمدہ خاکہ نگاری بھی کی ہے ان کے لکھے خاکوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ عدل و انصاف کو مدِنظر رکھتے ہوئے صحیح معنوں میں خاکہ اڑانے کا کارہائے نمایاں انجام دیا گیا ہے ان کو خاکہ نویسی پر قدرت کاملہ حاصل ہے انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان میں صداقت بیانی کا عکس صاف نظر آتا ہے ان کے خاکے فنِ خاکہ نگاری کے اصول وضوابط اور تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

یوسف ناظم نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ہیں ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سلیمان، اریب اور باقر مہدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو میں جدید لہجہ کے نمائندہ شاعر باقر مہدی بڑی اہمیت کے حامل ہیں ان کے شعری مجموعہ 'ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں' کی اشاعت پر 10 دسمبر 1972 میں بمبئی کے ادیبوں اور سخن وروں نے ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا تھا اس مجلس میں یوسف ناظم نے باقر مہدی پر لکھا ہوا اپنا خاکہ پیش کیا تھا، اس خاکہ کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

باقر مہدی شاعر ہیں، نقاد ہیں، مقرر ہیں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور تنقیدی شعور کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا سراسر ناانصافی ہوگی یوں ناانصافی سے باقر مہدی صاحب کو شغف رہا ہے، پورا ہندوستان یعنی غیر منقسم ہندوستان اس بات پر متفق ہے کہ باقر مہدی جتنے عالم ہیں اس سے زیادہ ظالم ہیں، باقر مہدی صاحب روایت شکن آدمی ہیں اتنے روایت شکن کہ ان کی پیشانی ہمیشہ شکن آلودہ رہتی ہے، باقر مہدی کی خاصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ ادب کے کسی موضوع پر مدلل اور مبسوط مضمون لکھ کر اس کی مخالفت میں دوسرا مدلل مضمون لکھ سکتے ہیں، وہ ایک محفل میں ایک ہی موضوع کی تائید اور مخالفت میں گھنٹوں بول سکتے ہیں۔''

(بیسویں صدی میں طنز ومزاح: نامی انصاری، صفحہ 249)

اردو کے نامور دانشور اور تنقید نگار پروفیسر محمد حسن نے اس خاکہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''باقر مہدی ہمارے دور کے آتش گر شخصیتوں میں سے ہیں جنھیں برتنے کے لیے سخت احتیاط کی ضرورت ہے، یوسف ناظم نے جرأت رندانہ کے ساتھ ان کی شخصیت پر قلم اٹھایا اور ایسے ایسے خوبصورت جملے صَرف کیے جو صرف ان ہی کا حصہ تھے۔''

(طنز ومزاح کے نئے رجحانات: مطبوعہ ماہنامہ 'آجکل' اپریل 1974)

ابن اسماعیل نے یوسف ناظم کے اسلوب تحریر کی خوبیوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''یوسف ناظم کی انفرادیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ خیال اور واقعہ ہی سے جملوں کی تراش وخراش اور جملوں کے باہمی تضاد سے مزاح پیدا کرنے میں بے نظیر ہیں، ان کا اسلوب اردو مزاح میں قطعی نیا اور منفرد ہے، مزاح کا اچھوتا پن ان کے مضمون کے ہر سطر کے ہر لفظ میں رگوں میں دوڑتے خون کی طرح نظر آتا ہے، بلاشبہ ناظم کی نثر اردو کے مزاحیہ ادب میں وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ انسان کے جسم میں دوڑتا لہو رکھتا ہے''۔

(اردو طنز ومزاح، اختصار وانتخاب، ابن اسماعیل، ص 121)

یوسف ناظم کی کچھ تحریریں فن انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں اس سلسلے میں ان کا مشہور انشائیہ 'بارات' اور 'دستِ راست' بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر عصر حاضر میں ان کی تخلیقات کو ناقدینِ ادب نے معیاری و مستند قرار دیا ہے یہ الگ بات ہے کہ بسیار نویسی کے باعث یوسف ناظم کی وہ پذیرائی نہیں ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے پھر بھی انھوں نے اردو طنز و ظرافت کے میدان میں اپنے وقار کو مجروح ہونے سے بچائے رکھا اور اپنے منفرد اسلوب نگارش کے ذریعہ اردو مزاح نگاری کو جدید طرز کی شاہ راہ پر گامزن کیا ہے۔

یوسف ناظم نے کالم نگاری بھی خوب اچھے ڈھنگ سے کی ہے اور اس منزل میں بھی وہ بہتات نویسی کا شکار ہیں ہفت روزہ 'بلٹز' بمبئی کا کالم 'باتیں ہماری' اس فہرست میں شامل ہے اس کالم میں وہ طوالت سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے علاوہ ازیں موجودہ دور کے مشہور نیم ادبی اور علمی و مذہبی مجلّہ 'البلاغ' بمبئی کا مشہور کالم 'ادب لطیف' تاحیات لکھتے رہے ادبی دنیا میں 'البلاغ' کو متعارف کرانے میں اس کالم نے جو رول ادا کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ناظم کی مطبوعہ تصنیفات وتخلیقات میں سے چند کا تجزیہ کیا جائے تاکہ ان کے اسلوب کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا قارئین کو نہ کرنا پڑے اس سلسلے میں سر دست کچھ کتابوں کے نام یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

طنز ومزاح کے موضوع پر یوسف ناظم کی سب سے پہلی اولاد (کتاب) 'کیف وکم' کے نام سے 1963 میں منظر عام پر آئی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شائع کیا تھا پہلی اولاد سب کو عزیز ہوتی ہے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا ادبی مارکیٹ میں یوسف نام کے اس چہیتے کی مانگ بڑھی تو دوبارہ میر اینڈ کمپنی دہلی نے 1964 میں شائع کیا یوسف ناظم کی اس پہلی کتاب کا مقدمہ اردو کے مستند ومعتبر دانشور اور افسانہ نویس کرشن چندر نے لکھا تھا۔

یوسف ناظم کی دوسری کتاب 'فٹ نوٹ' کو عصر حاضر کے نامور ادیب اور فکشن رائٹر عابد سہیل صاحب نے اپنے ادارہ نصرت پبلشرز لکھنؤ سے 1969 میں شائع کیا تھا۔ ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں یوسف ناظم کی کل بیس عدد طنزیہ ومزاحیہ تحریریں شامل ہیں کتاب کے آخر میں ان کا لکھا ہوا مزاحیہ شکریہ نامہ بڑا دلچسپ ہے۔ مزاحیہ تحریر 'لقمانیات' کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

''زندگی ایک گیت ہے، فلمی گیت اس گیت میں صرف شروع کے دو بول مرد کے ہوتے ہیں باقی سارا گیت عورت کا ہوتا ہے بیک گراؤنڈ میں بچوں کی موسیقی ہوتی ہے''۔ ''عورت کا دل وہ تجوری ہے جسے کوئی نہیں کھول سکتا ایک مرتبہ کسی نقب زن نے یہ لا کر کھول لیا تھا اس نے پایا کچھ نہیں اس میں صرف میکے کی باتیں تھیں۔ جن مردوں کو بیویوں کی عادت ہوجاتی ہے وہ کسی کام کے نہیں رہتے۔''

(فٹ نوٹ، یوسف ناظم، نصرت پبلشرز لکھنؤ 1969، ص 64)

'فٹ نوٹ' کے مشمولات پر ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو

''یو سف ناظم نے کالم نگاری بھی خوب اچھے ڈھنگ سے کی ہے اور اس منزل میں بھی وہ بھتات نویسی کا شکار ہیں. ہفت روزہ 'بلٹز' بمبئی کا کالم 'باتیں ہماری' اس فہرست میں شامل ہے اس کالم میں وہ طوالت سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے علاوہ ازیں موجودہ دور کے مشہور نیم ادبی اور علمی و مذہبی مجلہ 'البلاغ' بمبئی کا مشہور کالم 'ادب لطیف' تاحیات لکھتے رہے ادبی دنیا میں 'البلاغ' کو متعارف کرانے میں اس کالم نے جو رول ادا کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں.''

اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف ناظم نے طنز و مزاح کے اس چھوٹے سے گلدستہ میں رنگ برنگ کے پھول کھلا رکھے ہیں یہ وہ پھول ہیں جن کو ہم بآسانی اپنے ڈرائنگ روم کی زینت کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اس کتاب کے اہم مزاحیہ مضامین میں چہرے اور ترکاریاں، خلعتِ فاخرہ، مقابلۂ حسن، علم سے قلم تک، گداگری، موازنۂ قیس وفرہاد، اور 'مرد کی پسلی' وغیرہ اپنے طرزِ تحریر اور بیان کی شگفتگی کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ 'دیوارِیے' یوسف ناظم کی تیسری تصنیف ہے جسے نقش کوکن پبلی کیشنز نے 1971 میں شائع کیا تھا۔

فن صحافت کی ابتدائی تاریخوں میں 'دیوارِیے' (Wall Magzeen) کو بڑی اہمیت حاصل ہے دیواریہ ہر اس تخلیق اور تحریر کو کہا جا سکتا ہے جسے دیوار سے لٹکا دیا جائے یا دیوار پر چسپاں کر دیا جائے پرنٹ میڈیا اور برق رفتار الکٹرانک میڈیا کے اس عہد میں بھی دیوار پر لکھی تحریروں کو عوام بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں عام حالات میں بھی دیواریں اشتہار اور پرچار کا کارنامہ انجام دیتی ہیں الیکشن کا پرچا ہو یا حکیموں کے قوتِ مردانگی والے نسخوں کی تشہیر ہر ایک کے لیے 'دیوارِیے' بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں یوسف ناظم نے اپنی کتاب 'دیوارِیے' میں جو تحریریں شامل کی ہیں ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ معاشرے کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اس کتاب میں تین مضامین صرف جدید شاعری پر طنزیہ و مزاحیہ انداز میں لکھے گئے ہیں ایک طویل مضمون 'نئی یادگار غالب' کے موضوع پر ہے جس میں غالب کے اشعار کی طنزیہ و ظریفانہ شرحیں کی گئی ہیں 'نئی شاعری' کے نام سے انھوں نے جو شوخی آمیز مزاحیہ لکھا ہے اس میں خاص طور سے عہد جدید کے شاعروں، مشاعرۂ شاعرات اور مشاعروں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

'زیرِ غور' کے نام سے یوسف ناظم کے اٹھارہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ بنت حوا پبلی کیشنز، بمبئی سے 1973 میں شائع ہوا۔ اس چوتھی کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ 'زیرِ غور' سے شروع ہو کر 'غور کرنے کے بعد' پر ختم ہوتے ہیں یہ کتاب مبالغہ آرائی اور بسیار نویسی کی اچھی مثال ہے اس میں زبانی جمع خرچ اور لفاظی اپنے عروج پر ہے اس کے چند اہم مضامین میں الیکشن، ہوئے اس قدر مہذب، آج کا جغرافیہ اور 'سیر کر دنیا کی' وغیرہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

ادبِ اطفال کے موضوع پر یوسف ناظم نے بچوں کے لیے ایک کتاب 'پلک نہ مارؤ' کے نام سے لکھی جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے 1974 میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا تعلق بچوں کے مزاحیہ ادب سے ہے یو پی اردو اکادمی لکھنؤ سے انعام یافتہ کتاب ہے۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ یوسف ناظم کے کتابوں کی تعداد میں بھی اضافہ بڑی تیزی سے ہو رہا تھا 'سائے ہمسائے' ان کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جسے 1975 میں زندہ دلانِ حیدرآباد نے شائع کیا تھا اس کے دیباچہ میں یوسف ناظم لکھتے ہیں: ''اس کتاب سے کتابوں کی تعداد میں تو یقیناً اضافہ ہوگا لیکن اس کی وجہ سے ادب میں کسی خاص اضافے کی بات کرنا بلکہ سوچنا بھی بجائے خود مزاح ہے۔''

اس کتاب میں یوسف ناظم نے یار لوگوں کا خاکہ اڑانے کے ساتھ ہی بمبئی کی ادبی زندگی کے تعلق سے نیم تنقیدی مضامین مزاحیہ انداز بیان میں پیش کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے اپنے مضمون 'آج کے مزاح نگار' مطبوعہ شاعر ممبئی فروری 1980 کے شمارہ میں لکھا ہے کہ ''یوسف ناظم کو شخصیات سے بے حد دلچسپی ہے لیکن محض ان کے خط و خال تک ہی، وہ گہرے پانی میں بھی نہیں اترتے کنارے کھڑے ہو کر جال پھینکتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی رنگ برنگ مچھلیاں پکڑ کر خوشی کے مارے ناچتے اور شور مچاتے رہتے ہیں۔''

'سائے ہمسائے' کہنے کو تو شخصیات کے خاکوں پر مشتمل کتاب ہے مگر حقیقت میں اس میں نہ تو مرقع نگاری پائی جاتی ہے اور نہ ہی خاکہ نگاری کے اصولوں اور تقاضوں کے معیار پر یہ کتاب پوری اترتی ہے یہ کتاب خاکہ نما انشائیوں کی فہرست میں شمار کی جا سکتی ہے۔ مزاح کے نام پر یوسف ناظم بہت سی غیر مزاحیہ باتیں اور طول طویل داستانیں لکھ جاتے ہیں جن کا حقیقت میں موضوع سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا مثلاً انھوں نے 'زیرِ غور' ادھر ادھر کی تیر'' کے عنوان سے لفاظی اور مبالغہ آرائی اور عبارت آرائی میں دس صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں وہ اپنی مزاح نگاری کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''میں کوئی پچیس سال سے مزاح کے نام سے نثر لکھ رہا ہوں اب اتنے لمبے عرصے تک خود کو مزاح نگار کہنے کے بعد جی نہیں چاہتا کہ اپنے مضامین کسی اور عنوان سے پیش کروں فلسفیوں نے متفقہ طور پر رائے دی ہے کہ جھوٹ اتنا بولو کہ سچ معلوم ہونے لگے معلوم نہیں اس جھوٹ کو ثابت کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔''

یونس اگاسکر نے یوسف ناظم کے اسلوبِ تحریر کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''یوسف ناظم بات سے بات پیدا کرتے ہیں سنجیدہ بات کہہ کر اس کے ساتھ Anti (Climax) قسم کے جملہ چپکا دیتے ہیں۔ الفاظ سے کھیلتے ہیں بیان میں مبالغہ کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر پیراگراف کے آخر میں وہ جملہ بازی جسے انگریزی میں (Punch Line) کہتے ہیں سے کام لیتے ہیں، یوسف ناظم کے انشائیے بھی اچانک اختتام کو پہنچتے ہیں اور دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔''

(ماہنامہ شاعر ممبئی دسمبر 1976، بحوالہ 'اردو ادب میں طنز و مزاح' آزادی کے بعد: ڈاکٹر صادق ص 453)

'سائے ہمسائے' کے بعد یوسف ناظم کے جو طنزیہ و مزاحیہ مجموعے منظر عام پر آئے ہیں ان میں 'فقط' اور 'ذکرِ خیر' 1977 میں حیدرآباد سے شائع ہوئے بچوں کے مزاحیہ ادب سے متعلق ان کی ایک اور کتاب 'الف سے بے تک' شائع ہو چکی ہے 'پلک نہ مارؤ' بھی اس سلسلے کی کڑی ہے ان دونوں کتابوں پر آندھرا پردیش، اتر پردیش اور مہاراشٹر کی اردو اکادمیوں سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ 1981 میں ان کی ایک طنزیہ کتاب 'البتہ' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے اس کے علاوہ بہت سے مزاحیہ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، طوالت کے باعث جن کا ذکر ممکن نہیں ہے اردو طنز و ظرافت اور مزاح نگاری کے حوالے سے یوسف ناظم کی ہشت پہلو شخصیت اس قابل ہے کہ ہمارے تحقیق نگار اس پر خصوصی توجہ صرف کریں تاکہ اردو والوں کی آنے والی نسلیں اس کے طنزیہ و مزاحیہ ادبی کارناموں سے بآسانی واقفیت حاصل کر سکیں۔

■

Dr. Rafique Ahmad
Dept of Urdu
D.C.S.K.(Post Graduate)College
Maunath Bhanjan
Mau 275101 (U.P.)Mob:09236126977
E-Mail : rafique.mau@gmail.com

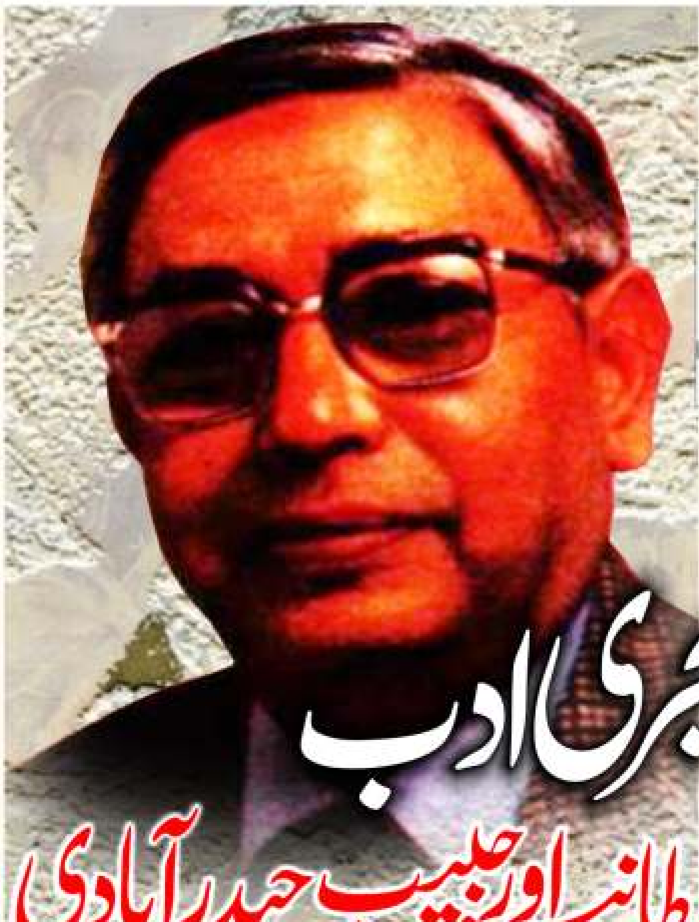

عزیز سہیل

مہجری ادب
برطانیہ اور حبیب حیدرآبادی

تاریخ شاہد ہے کہ اردو زبان وادب کے ابتدا سے ہی ہر دور میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں اور ادب ترقی کرتا رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم، فورٹ سینٹ جارج کالج، دلی کالج کے قیام نے اردو زبان وادب کی وسعتوں میں اضافہ کیا وہیں سرسید تحریک نے اردو کو ایک نئے ماحول اور نثری اصناف سے آشنا کیا سرسید تحریک نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا، سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے دیگر زبانوں کے ذخیرہ کو اردو میں منتقل کرنے کا اہم کام انجام دیا گیا۔ بیسویں صدی میں حیدرآباد میں اردو ذریعہ تعلیم کی پہلی درس گاہ جامعہ عثمانیہ کے نام سے قائم کی گئی اور اس جامعہ کے تحت دارالترجمہ قائم کیا گیا جہاں دیگر علوم کی اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے، بیسویں صدی میں ہمارے ملک سے باہر تعلیم کے لیے ہجرت کرنے والے طلبہ نے لندن میں ترقی پسند تحریک کی بناء ڈالی جو آگے چل کر ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب بن گئی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہمارا ادب فروغ پانے لگا، اس کے ساتھ ساتھ حلقہ ارباب ذوق کا قیام عمل میں آیا اور بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں جدیدیت کی تحریک بھی پروان چڑھی۔

آزادی سے قبل اور بعد ہجرت کا سلسلہ چل پڑا، جس کے بعد اردو ادب میں مہجری ادب کا تصور پیدا ہوا۔ اردو، انسائیکلوپیڈیا میں مہجری ادب کے معنی اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ ”وہ ادب جو ہجرت کے بعد تخلیق ہوا، بالخصوص برصغیر میں آزادی کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت سے متعلق ادب“ مہجری ادب میں وطن کی محبت اور تہذیبی تبدیلی کے باوجود بھی اپنی مادری زبان ووطن سے محبت اور حب الوطنی کے جذبہ کو بیان کیا جاتا ہے۔

ہجرت سے دراصل مہجری ادب، نے جنم لیا ہے مہجری ادب میں ہجرت کرنے والوں کا اپنی زمینوں سے بچھڑنے اور ٹوٹنے کا کرب نمایاں پایا جاتا ہے ہمارے جن شعرا کے یہاں اس کرب کا تصور نظر آتا ہے ان میں ناصر کاظمی، عمیق حنفی، اختر الایمان، من موہن تلخ، اور ظفر اقبال وغیرہ کے نام شامل ہیں جن کی شاعری میں مہجری ادب کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں، ان کے علاوہ نثر نگاروں کی تخلیقات میں بھی مہجری ادب کی خوب نشاندہی ہوتی ہے، ماہرین ادب نے مہجری ادب کے تعلق کو زبان سے نہیں بلکہ اہل زبان سے بتایا ہے۔ مہجری ادب میں وطن سے نقل مقامی کے باوجود وطن کی یاد اور اپنے وطن سے انسیت کا بیان ہوتا ہے جو اکثر ہجرت کرنے والے شعرا اور ادبا کے یہاں نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے تیسرے دہے میں عرب کے باشندوں کے لیے بہت مشکلات اور مصائب جھیلے رہے عرب کے باشندوں کو اپنی آزادی سے محروم ہونا پڑا، بہت سی قربانیاں دینی پڑی جس کے ساتھ ساتھ انھیں ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا، عربی ادب کے قلمکار جنھوں نے آخری دور میں عرب سے ہجرت کرکے امریکہ میں قیام پذیر ہوگئے اور انھوں نے وہاں عربی زبان وادب کی خدمات انجام دیں، اسی لحاظ سے عرب کے ان ادبا کو مہجری ادبا کہتے ہیں اور ان کا ادب ادب المہجر کہلاتا ہے ان ادبا نے سماجیات، تعلیم، اور تاریخ پر حد سے زیادہ توجہ دی، انھیں ادبا میں ایک نام ’جبران خلیل جبران‘ کا بھی ہے انھوں نے امریکہ میں عربی زبان وادب کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اشفاق احمد ندوی عربی میں مہجری ادب کے آغاز سے متعلق رقمطراز ہیں ”مہجری شعروادب کا جنم بیسویں صدی میں وطن سے دور ایک اجنبی ماحول میں انتہائی تکلیف دہ اور کسمپرسی کے حالات میں اس طرح ہوا کہ برسوں اس پر ظلمت وجمود کے سائے لہراتے رہے اس کی آواز بے حد پست اور اس کی رفتار بے انتہا سست رہی۔ درصل ہجرت کا جب طوفان تھما تو کچھ مہاجرین اپنے وطن واپس آگئے مگر ان کی ایک بڑی تعداد نے دیار غیر کو ہی اپنا مستقر بنالیا جہاں وہ زندگی کی مختلف مصرفیات میں مشغول ہوگئے۔ جس کے نتیجہ میں کچھ جرائد ورسائل وجود میں آئے اور چند انجمنوں اور سوسائٹیوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔“[1]

ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ملک کے بعد برصغیر سے کافی تعداد میں لوگ فکر معاش کے لیے خلیجی ممالک، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا گئے اور ان میں سے اکثر بیرون ملک ہی مقیم رہے۔ ایسے لوگ تارکین وطن کہلاتے ہیں۔ تارکین وطن اپنے ساتھ اپنی زبان اپنی تہذیب لے گئے اور جس جگہ بسے وہاں انھوں نے اپنی زبان وتہذیب کے نقوش چھوڑے۔ برطانیہ تارکین وطن کا اہم ملک رہا۔ یہاں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی بڑی آبادی ہے۔ اور وہاں اردو زبان وتہذیب نے بھی جڑ پکڑنا شروع کیا۔ برصغیر سے جانے والوں نے برطانیہ میں اردو کے فروغ کی شعوری کوشش کی جس کی بنا برطانیہ برصغیر کے بعد اردو کی دوسری بڑی بستی بن گیا۔ حیدرآباد دکن سے برطانیہ میں مستقل قیام کرنے والے اور اردو زبان وادب کے فروغ میں بے پناہ خدمت انجام دینے والے جو ادیب و شاعر مشہور ہیں ان کا نام عبدالقادر حبیب حیدرآبادی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی نے حبیب حیدرآبادی کا تعارف اور ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”حیدرآباد سے برطانیہ منتقل ہونے والوں میں ایک نام حبیب حیدرآبادی

کا ہے جنھوں نے اپنے قیام برطانیہ کے دوران نہ صرف وہاں اردو زبان اور ذریعہ تعلیم کو فروغ دیا بلکہ اپنی تصانیف کے ذریعے برطانیہ میں اردو کی ترقی اور وہاں کی تہذیب وتمدن کو بھی محفوظ کیا،عبدالقادر صاحب حبیب حیدرآبادی کے نام سے مشہور ہوئے اوران کا مقبول عام تعارف یہ ہے کہ وہ اردو کے نامور محقق،نقاد،شاعر اور پروفیسر مغنی تبسم کے بہنوئی رہے ہیں،ان کی اہلیہ صدیقہ شبنم ایک اچھی شاعرہ ہیں اور نامور افسانہ نگار عوض سعید ان کے ہم زلف رہے ہیں،حبیب حیدرآبادی 1960 کی دہائی میں حصول معاش کے لیے برطانیہ منتقل ہوئے اور وہ اپنی حیات کے باقی ایام میں انھوں نے وہاں فروغ اردو کے بے شمار کام انجام دیے۔[2]

حبیب حیدرآبادی نے برطانیہ میں قیام کے دوران فروغ اردو کی جو شعوری کوشش کی اس سے وہاں اردو کے مہجری ادب کو پروان چڑھانے میں بھی مدد ملی۔

حبیب حیدرآبادی 29اپریل 1929 کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے وہ متوسط اور ایک شریف گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے،ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد محترم سے حاصل کی، اردو، عربی، فارسی اور دینیات پر عبور رکھتے تھے۔انھوں نے کامرس سے گریجویشن نظام کالج حیدرآباد سے کیا،ان کی شادی اپریل 1952 کو پروفیسر مغنی تبسم کی ہمشیرہ سے انجام پائی انھوں نے 1955 کو ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی، 1957 میں انھوں نے پاکستان سے انگلستان کو ہجرت کی۔انگلینڈ میں انھوں نے اکاونٹس کی تعلیم حاصل کی اور وہیں سکونت اختیار کی حبیب حیدرآبادی نے لندن کی ایک کمپنی میں ڈائرکٹر اور چیف اکاونٹنٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔انگلینڈ میں ابتدائی قیام کا دور ان کی مشکلات سے بھرا رہا،وہ ایک محنتی شخص تھے ابتداء سے ہی وہ سخت محنت کیا کرتے تھے،وہ ایک ملنسار،خوش مزاج،مخلص انسان تھے۔ہر ایک کا درد وغم ان کا اپنا درد ہوتا تھا،بڑوں سے ادب اور چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آتے دوستوں سے ہمیشہ خوش مزاجی اور گرم جوشی سے ملا کرتے تھے۔ان کے ادبی سفر کا آغاز 12 سال کی عمر سے ہوا،ابتداء میں وہ ایک روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔بچپن سے ہی شعروادب سے لگاؤ رہا اس سے متعلق عوض سعید نے اپنی تصنیف خاکے میں لکھا ہے کہ:

”آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ حبیب صاحب نے آنجہانی مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کی شعری محفلوں میں شرکت کی ہے انھیں کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ جب یہ باتیں حبیب صاحب مجھے سنا رہے تھے تو میں فرط حیرت میں ڈوبا ہوا تھا،اس وقت آپ کی کیا عمر رہی ہوگی۔میرے سوال پر حبیب صاحب نے کہا 'یہی کوئی پانچ برس'[3]

حبیب حیدرآبادی نظام کالج کی اردو میگزین 'نظام ادب' کے مدیر بھی رہے ہیں، حیدرآباد دکن میں بچوں کی ادبی کانفرنس 1948 میں انھوں نے خصوصی طور پر منعقد کی۔ان کی نگرانی میں حیدآباد میں کئی کل ہند مشاعروں کا انعقاد بھی عمل میں آیا تھا۔حبیب حیدرآبادی کو اپنے استاد محترم ڈاکٹر محی الدین قادری زور سے بڑا گہرا لگاؤ رہا۔ اس عرصے میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے بچوں کے لیے رسالہ 'سب رس' جاری ہوا تو اس کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے خدمات انجام دیں، انھوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی سے بھی استفادہ کیا 1967 میں وہ اپنے دورہ حیدرآباد کے موقع پر مخدوم محی الدین،سلیمان اریب،ڈاکٹر وحید اختر،شاذ تمکنت،عوض سعید،مغنی تبسم اور زبیر رضوی سے خصوصی ملاقات کی ان لوگوں نے بھی حبیب حیدرآبادی کا استقبال کیا۔

حبیب حیدرآبادی نظام کالج کی اردو میگزین 'نظام ادب' کے مدیر بھی رہے ہیں، حیدرآباد دکن میں بچوں کی ادبی کانفرنس 1948 میں انھوں نے خصوصی طور پر منعقد کی۔ ان کی نگرانی میں حیدآباد میں کئی کل ہند مشاعروں کا انعقاد بھی عمل میں آیا تھا۔حبیب حیدرآبادی کو اپنے استاد محترم ڈاکٹر محی الدین قادری زور سے بڑا گہرا لگاؤ رہا۔ اس عرصے میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے بچوں کے لیے رسالہ 'سب رس' جاری ہوا تو اس کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے خدمات انجام دیں، انھوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی سے بھی استفادہ کیا 1967 میں وہ اپنے دورہ حیدرآباد کے موقع پر مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، ڈاکٹر وحید اختر، شاذ تمکنت، عوض سعید، مغنی تبسم اور زبیر رضوی سے خصوصی ملاقات کی ان لوگوں نے بھی حبیب حیدرآبادی کا استقبال کیا۔

برطانیہ میں حبیب حیدرآبادی کے ایام مشکلات بھرے رہے وہ کئی دنوں تک غم روزگار سے پریشان رہے، جب ان کے حالات زندگی میں کچھ اطمنان آیا تو انھوں نے برطانیہ میں اردو زبان وادب کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔انھوں نے ناٹنگھم میں اپنی نوعیت کی پہلی اردو لائبریری قائم کی۔ 1966 میں انھوں نے ناٹنگھم میں اردو کا پہلا آل انگلینڈ مشاعرہ منعقد کیا۔اس کے بعد ناٹنگھم میں مشاعروں کا باضابطہ آغاز ہوگیا اور ہر سال مشاعرہ کا پابندی سے انعقاد عمل لایا جاتا رہا انھوں نے ڈارٹ فورڈ میں اکیڈیمی آف اردو اسٹڈیز قائم کی۔ان کا سرطان جیسے موذی مرض سے لڑتے ہوئے 7 مارچ 1989 میں انتقال ہوگیا۔

جب ایک فرد اپنے وطن عزیز سے ذریعے معاش یا حالات کی پریشانی کے باعث ہجرت کرتا ہے تو ہمیشہ اس کا دل وطن کی یاد اور تڑپ میں سرگرداں رہتا ہے۔ہجرت کوئی معمولی بات نہیں ہے جب کسی نئے مقام پر ہم ہجرت کرتے ہیں تو وہاں ہمارا کوئی مددگار نہیں ہوتا ہر مسئلہ کا حل ہم کو ہی تلاش کرنا ہوتا ہے،اس کرب کو حبیب حیدرآبادی نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔

حبیب حیدرآبادی نے اپنی کتاب 'انگلستان میں' برطانیہ میں اپنے ابتدائی ایام کے بارے میں لکھا ہے جس سے ان کے کرب بھرے حالات زندگی کا اندازہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں ”یہاں آنے کے بعد بڑے پاپڑ بیلنے پڑے،مزدوری کرنی پڑی،گوداموں میں کام کرنا پڑا،بس کنڈیکٹری کی،ٹیکسی چلائی،کوئی کام ایسا نہیں ہوگا جو میں یہاں آنے کے بعد نہ کیا ہو،صبح چار بجے سے رات کے بارہ بجے کئی کئی مہینوں مسلسل کام کرنا پڑا،موزوں مکان آسانی سے نہیں ملتے تھے اور اگر ملتے بھی تھے تو ان کا کرایہ میری استطاعت سے بہت زیادہ ہوتا تھا“[4]

حبیب حیدرآبادی نے اپنی کتاب میں ان پر ہونے والے جان لیوا حملہ کا ذکر بھی کیا ہے۔جس میں ایک انگریز نے سفر کے دوران ٹرین میں ہندوستانی ہونے کے ناطے حملہ کردیا اس کا منشا تھا کہ ٹرین سے ان کو پھینک دیں لیکن حبیب حیدرآبادی نے اپنا دفاع اچھے سے کیا اور ٹرین کی چین کھینچنے میں کامیاب ہوگئے۔اس واقعہ کو عوض سعید نے اپنی کتاب خاکے میں نقل کیا ہے۔حبیب حیدرآبادی اپنے ایک انشائیہ 'ہماری ہجرت' میں برطانیہ کے ماحول اور صحافت کے رویہ سے متعلق لکھتے ہیں:

”انگلستان میں ہم گزشتہ تیس برس سے ہیں،سوٹ پہنتے ہیں،ٹائی باندھتے ہیں،کبھی کبھی چھری کانٹے اور چمچے کا بھی استعمال کرتے ہیں،مقامی لوگوں کی بری باتوں کو زیادہ اور اچھی باتوں کو کم اپنائے ہوئے ہیں پھر بھی یہاں کی صحافت ہم کو مہاجر سے مخاطب کرتی ہیں۔[5]

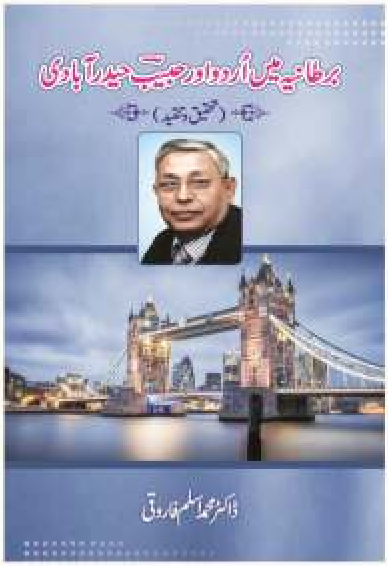

حبیب حیدرآبادی کی پہلی کتاب 'انگلستان میں' کی اشاعت کے دشوار مراحل کا ذکر کرتے ہوئے وطن عزیز میں اس کی اشاعت سے متعلق لکھتے ہیں''انگلستان میں کتابت وطباعت کی دشواریوں کی وجہ سے اس کتاب کو حیدرآباد دکن میں چھپوانا پڑا،کسی بھی کتاب کی اشاعت کے لیے جن دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ان سے دور دور تک بھی میری آشنائی نہیں،اس جان لیوا کام کے لیے میں نے اپنے عزیز ترین دوست اور میری رفیق حیات صدیقہ کے بڑے بھائی ڈاکٹر مغنی تبسم کا انتخاب کیا جو ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔''[6]

حبیب حیدرآبادی کی پہلی تصنیف 'انگلستان میں' کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں مضامین،انشائیے اور شاعری کا انتخاب شامل ہے۔اس کے علاوہ ان کے انشائیوں کا مجموعہ'رہ رسم آشنائی'، برطانوی اقتدار کے بارے میں معلوماتی کتاب'برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ' اور ایک کتاب'محمد الرسول اللہؐ' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے حبیب حیدرآبادی کی دیار غیر میں اردو خدمات کو بیان کرتے ہوئے عوض سعید لکھتے ہیں:

''حبیب صاحب جملے بازی کے دوش بہ دوش لطیفے بازی پر اتر آتے ہیں تو سامع کے ساتھ ساتھ لطیفہ کا انگ انگ بھی ہنسنے لگتا ہے میں یہ یہاں کہہ کران کے رتبے اور مرتبے کو کم کرنا نہیں چاہتا کہ وہ محض ایک لطیفہ باز آدمی ہیں وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔انگلینڈ کے سارے ادبی ماحول کو سنوارنے اور بگاڑنے میں ان کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔کتنے ایسے انگریز تھے جنھوں نے حبیب صاحب سے اردو سیکھی اور اپنی مادری زبان بھول بیٹھے، اردو کی اس سے بڑی اور کیا خدمت ہوسکتی ہے''[7]

حبیب حیدرآبادی نے ہماری ہجرت کے عنوان سے ایک انشائیہ لکھا تھا جس میں اپنے وطن سے محبت اور وطن کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے اپنے وطن میں ہمارا اپنا مکان تھا، ملازمت تھی، ماں باپ، بھائی بہن، رشتہ دار، دوست احباب ہم کو قرض دے کر ہم سے دعوتیں کھانے والے، ہم سے قرض لے کر ہم سے روپوش ہونے والے۔ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر ہم لندن جیسی اجنبی سرزمین پر پہنچ گئے۔جو ہمارے لیے ایک تاریک کنویں کے برابر ثابت ہوئی۔ یہاں کی مشکلات کا علم ہمیں یہیں آنے کے بعد ہوا۔[8]

حبیب حیدرآبادی نے مضمون نگاری، انشائیہ، سیرت نگاری، مزاح نگاری،تنقید،خاکہ نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے شاعری بھی کی ہے ان کا کوئی دیوان تو شائع نہیں ہوا لیکن ایک شعری مجموعہ جو ان کی تصنیف 'انگلستان میں' کے آخر میں میری شاعری کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے،جس میں چند ایک غزلیں،نظمیں، قطعات شامل ہیں۔حبیب حیدرآبادی کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیہ صدیقہ بھی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔حبیب حیدرآبادی کی شاعری میں ایک طرف وطن سے محبت کا اظہار دکھائی دیتا ہے تو دوسری جانب کرب کا احساس بھی ہے۔

حبیب حیدرآبادی کی شاعری میں ایک طرف تو انگلستان کا ذکر نظر آتا ہے وہیں وطن کی یاد بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔یہ دو شعر ملاحظہ کریں:

شام لندن ہو یا صبح دکن
یادان کی بہت ستاتی ہے
مشینی زندگی میں بھی ہے باقی زندگی دل کی
ہم انگلستان میں شعر وسخن کی بات کرتے ہیں

حبیب نے غزلیں لکھی ہیں ان کی شاعری میں پختگی نظر آتی ہے ان کا انداز بیان سیدھا سادہ اور اثر دار ہوتا ہے، انھوں نے شاعری میں چھوٹی بحریں بھی استعمال کی ہے۔ ان کے یہ اشعار جس میں زندگی کا فریب،زخموں کا ذکر اور ہجرت کا تذکرہ ملتا ہے دیکھیں:

مسکراتی ہے گیت گاتی ہے
زندگی فریب کیا کھاتی ہے
زخم کچھ اور بڑھ گئے ہیں یہاں
ہم تو آئے تھے کچھ کمی کے لیے

حبیب حیدرآبادی نے خود کے ٹوٹنے بکھرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی کیفیت کو ان اشعار میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہوں:

خود کو تقسیم کر چکا ہوں میں
دل یہ کہتا ہے مر چکا ہوں میں
بٹ چکا ہوں میں کتنے حصوں میں
ایک تھا اب بکھر چکا ہوں میں

بہرحال حبیب حیدرآبادی کی شاعری میں وطن سے محبت اور دیار غیر میں زندگی کا تصور اور کرب کی کیفیت کی نشاندہی ہوتی ہے حبیب حیدرآبادی کی شاعری میں بھی نثر کی طرح ہجرت کا تصور نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں مہجری ادب کا تصور اور اس کے خدوخال سے متعلق کوئی واضح منظر نامہ نظر نہیں آتا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں مہجری ادب پر سنجیدگی سے تحقیق کی جاتے تاکہ مہجری ادب کا مفہوم عام ہو اور وطن سے دور رہنے والے شعراء وادبا کے مسائل اور وطن کی یاد میں لکھا جانے والا ادب منظر عام پر آئے۔

کریں ہجرت تو خاک شہر بھی جزدان میں رکھ لیں
چلیں گھر سے تو گھر کی یاد بھی سامان میں رکھ لیں
(اقبال کوثر)

حوالے:
1۔ اشفاق احمد ندوی،جدید عربی ادب کے ارتقا میں مہجری ادبا کی خدمات،ص 38,39
2۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی،برطانیہ میں اردو اور حبیب حیدرآبادی،ص 12
3۔ عوض سعید،خاکے،حبیب حیدرآبادی،ص 130
4۔ حبیب حیدرآبادی،انگلستان میں،ص 51
5۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی،برطانیہ میں اردو اور حبیب حیدرآبادی،ص 54
6۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی،برطانیہ میں اردو اور حبیب حیدرآبادی،ص 67
7۔ عوض سعید،حبیب حیدرآبادی،ص 126,127
8۔ ڈاکٹر اسلم فاروقی،برطانیہ میں اردو اور حبیب حیدرآبادی،ص 98

■

Dr. Azeez Sohail
Lecturar, M V S Govt Degree
w P G College Mahboob Nagar

ماجد الہ آبادی
شخصیت و شاعری

ندیم احمد

ماجد الہ آبادی کا اصل نام سید ماجد علی تھا۔ ان کی پیدائش 1888 میں الہ آباد میں ہوئی۔ ان کے والد محترم سید صاحب علی ایک طبیب تھے۔ جن کا انتقال اس وقت ہوا جب ماجد کی عمر صرف 5 سال تھی لہٰذا ماجد کی پرورش کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی اور بڑی بہن پر عائد ہوگئی جسے دونوں نے مل کر بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا۔ 1902 میں ماجد انگریزی اسکول میں داخل کرائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے 1912 میں بی اے اور 1914 میں وکالت کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ وکالت مکمل کرنے کے بعد ایک سال تک وہ اپنے بڑے بھائی سید عابد علی کے ساتھ کام کرتے رہے مگر 1915 سے انھوں نے آزادانہ طور پر خود وکالت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور ماجد کو اس پیشہ میں اتنی کامیابی نصیب ہوئی کہ آپ 1929 میں الہ آباد کی ذیلی عدالت میں سرکاری وکیل مقرر ہوگئے اور تاحیات اسی عہدہ پر فائز رہے۔ مئی 1935 میں حکومت کی جانب سے آپ کو 'خاں صاحب' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اس وقت آپ یورپ کے سفر پر تھے اور 9 جولائی 1935 کو ہندوستان لوٹنے پر آپ نے اپنے کام کو اور بھی تیز کر دیا مگر اسی سال 12 اگست کو آپ اچانک اس قدر علیل

ماجد نے صرف ایک دیوان 'یادگار ماجد' کے نام سے چھوڑا ہے جس میں ان کی 148 غزلیں، چند قصائد کے علاوہ کچھ نظمیں اور ایک مرثیہ شامل ہے اسے انڈین پریس الہ آباد نے بڑی آب وتاب کے ساتھ ان کے انتقال کے فوراً بعد شائع کیا تھا۔

ہوئے کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکے، طبیعت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی اور ہائی بلڈ پریشر کے موذی مرض نے 25 مئی 1936 کو رات ایک بج کر 47 منٹ پر اس اہم شاعر کو موت کے آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پہنچا دیا۔

ماجد نے صرف ایک دیوان یادگار ماجدؔ کے نام سے چھوڑا ہے جس میں ان کی 148 غزلیں، چند قصائد کے علاوہ کچھ نظمیں اور ایک مرثیہ شامل ہے اسے انڈین پریس الہ آباد نے بڑی آب وتاب کے ساتھ ان کے انتقال کے فوراً بعد شائع کیا تھا۔

ماجد الہ آبادی کے بارے میں یہ بات بھی کافی مشہور ہے کہ وہ غضب کا حافظہ رکھتے تھے کالج کے زمانے میں وہ جماعت میں دیے جانے والے لیکچر کو نوٹ بک میں کبھی تحریر نہیں کرتے تھے بلکہ یوں ہی ذہن نشین کر لیا کرتے تھے اور امتحان میں جواب لکھتے وقت اسی مواد کو جوں کا توں لکھ دیا کرتے تھے اور اس میں ایک لفظ کا بھی فرق نہیں ہوتا تھا۔ شاعری میں بھی ان کا یہی حال تھا وہ 100 سے زائد اشعار کی نظمیں حسب معمول سامعین کو بغیر رکے یوں ہی سنا دیا کرتے تھے۔

آپ کا غزل لکھنے کا طریقہ بھی کافی جداگانہ تھا۔ کبھی کبھی تو اسی مشاعرے میں بیٹھ کر ہی وہاں سنانے کے لیے پوری کی پوری غزل یا کئی قطعات بھی لکھ ڈالتے تھے اور کبھی مشاعرے کے لیے جاتے ہوئے راستے ہی میں کئی شعر کہہ ڈالتے اور انھیں جا کر ایسے ہی پڑھ دیتے تخیل کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ لکھنا یا پڑھنا ہوتا ایک آدھ گھنٹے میں تیار کر لیتے۔

ابتدا میں وہ 'میر علی عباد نیساں' سے اصلاح لیا کرتے تھے مگر بعد میں خود ہی مشق سخن جاری رکھا اور باکمال ہوگئے۔ ماجد نے اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1914 میں مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد کے ایک مشاعرے میں پڑھی اپنی اس غزل سے کیا تھا جس کا یہ شعر الہ آباد کے لوگوں کو عرصہ دراز تک زباں زد رہا۔

یہ کس نے چاندنی کی سیر میں رخ سے نقاب الٹی
چکوروں کی پھری جاتی ہیں نظریں ماہ کامل سے

اسی نوعیت کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے جس میں انتظار کی کیفیت کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سانس بھی جیسے ہو تھمی، تارے بھی جیسے ہوں رکے
آہ! کچھ ایسی کیفیت ہوتی ہے انتظار میں

ماجد بنیادی طور پر حسن وعشق کے شاعر ہیں جو محبوب کے

حسن کی جم کر تعریف کرنے کے فن سے بخوبی آشنا ہیں۔ ساتھ ہی معاملات عشق سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی ان کی باریک بیں نگاہ جیسے ٹکی رہتی ہے۔ وہ عشق سے متعلق ہر ہر کیفیت سے لطف حاصل کرتے ہیں اور قاری کو بھی لطف بہم پہنچاتے ہیں۔

سارا جہان ان کو ازل سے عطا ہوا
اور ایک دل ملا ہمیں، سب کے جواب میں
کیا بات تھی معلوم نہیں ان کی نظر میں
اک پھانس سی چبھتی ہے اسی دن سے جگر میں
وہ لڑکپن کا تھا حسن اور یہ جوانی کی بہار
تل یہی پہلے بھی تھا رخ پر مگر قاتل نہ تھا
تمنائے دل وحشی کی اپنے بس یہی حد ہے
کہا کرتے ہم اپنا حال دل اور تم سنا کرتے
پیشوائی کو بڑھاجاتا ہے اپنا درد دل
خانہ دل میں جو آمد ہے تمہارے تیر کی
منزل عشق وہ منزل ہے کہ اس میں ماجد
ایک بس درد جگر راہ نما ہوتا ہے

ان اشعار کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاعر عشق کی لذتوں کو حاصل کرنے میں کس قدر اپنے تخیل وتفکر کا استعمال کررہا ہے ساتھ ہی عشق کے حقائق اور اس کے نتائج سے وہ کس قدر آشنا ہے۔

علاوہ ازیں ماجد کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں 'صیاد' اور 'آنکھ' جیسے الفاظ کا استعمال کرکے اشعار میں فکری شان، معنویت اور خوبصورتی پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کی ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں درجنوں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں آنکھ اور صیاد کا ذکر ہے۔

رات کو میں نے قفس میں چونک کر فریاد کی
کروٹیں بدلا کیا، نیند اڑگئی صیاد کی
صیادمیرے پر بھی رکھ دے وہیں تو جاکر
جس جا چمن میں کچھ کچھ اٹھتا ہوا، دھواں ہو
تو کیا جانے بھلا صیاد قدر ان چار تنکوں کی
میری آنکھوں میں مرتے دم تک بھی مرا آشیاں ہوگا
ملاکر آنکھ جس کو تم اک نظر دیکھ لیتے ہو
وہ کہتا ہے قیامت تک یہی تصویر دیکھیں گے
آنکھوں سے جب قفس میں ٹپکنے لگا لہو
سمجھے یہ ہم کہ آگیا موسم بہار کا
نگاہ ناز کے جلوے سمائے ایسے آنکھوں میں
کوئی محفل بھی ہو، ہم تیری ہی محفل سمجھتے ہیں

ماجد کے نزدیک آنکھ ایک طرف تو محبوب کے حسن اور اس کی جلوہ گری کی علامت ہے اور دوسری طرف زندگی کے غموں اور مسرتوں کو عیاں کرنے کا اہم وسیلہ بھی ہے۔ جبکہ زندگی کو وہ ایک قید سے تعبیر کرتے ہیں جس میں صیاد کا وجود خالق کائنات نے الگ الگ صورتوں میں علیحدہ علیحدہ کام لینے کے لیے پیش کیا ہے۔

ماجد کی نظموں کے بیشتر اشعار میں انانیت سے متعلق موضوعات کی بھی کثرت رہی ہے مگر ان کی یہ انانیت کسی قسم کا کوئی متند دعوی پیش نہیں کرتی لیکن ان کی شاعرانہ عظمت اور صاف گوئی کی جانب ہماری توجہ ضرور مبذول کراتی ہے ساتھ ہی ان کے شعروسخن کو ادبی معیاروتناظر کے تحت باریک بینی سے مطالعہ کرنے کی مسلسل ترغیب بھی دیتی ہے۔

مختصر لفظوں میں کہہ دینا تیرا ہی کام تھا
بات بھی ہوتی تھی اور پیغام کا پیغام تھا
لوگ آیا کرتے تھے تجھ ہی سے سننے کے لیے
جوکہا تونے زباں سے وہ صلائے عام تھا
یوں تو کل دیوان گویا ایک سراپا درد ہے
سمجھے گا اتنا وہ جس کے دل میں جتنا درد ہے
لوگ سب چیزوں سے پیاری جانتے ہیں جان کو
جان سے بڑھ کر وہ جانیں گے تیرے دیوان کو

ماجد نے فارسی میں بھی چند غزلیں کہی ہیں اور ایک نظم بعنوان 'منصوری' لکھی ہے۔ ان کے فارسی کلام میں بھی وہی سادگی، سلاست وروانی موجود ہے جو ان کی اردو شاعری میں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی فارسی نظم کے یہ اشعار دیکھیے۔

چوں ابر گہہ گریاں، چوں برق گہہ خنداں
لغزیدہ قدم آید دیوانہ بہ کوے تو
ازہستی عالم چیز نہ جبر دارم
قلب من دیار تو، چشم من وروے تو
بہ نازاں چوں سربالیں من بے آمد دوست
دہن ہستم وہر موے راز داں کردم

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ماجد کی شاعری حقیقی معنوں میں پر اثر شاعری ہے۔ حالانکہ ان کے یہاں موضوعاتی طور پر فلسفیانہ یا پھر حکیمانہ نقطہ نظر کا فقدان تو ہے مگر پھر بھی ماجد نے اپنی غزلوں اور نظموں میں فنی اعتبار سے لکھنؤ کے روایتی اور قدیم شعرا کی پاسداری کی ہے۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی ماجد نے بہت ہی موثر انداز میں کی ہے۔ انسانی جذبات ونفسیات پر ان کی گہری نظر ہے آپ کی زبان صاف ستھری اور شائستہ ہے جو لگاوٹ وبناوٹ سے عاری ہے۔ تشخص الفاظ کا ہنر وہ بخوبی جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں میں نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ ماجد ایک بے باک شاعر تھے جس نے کبھی صنعتی بازی گری سے کام نہ لیا اور نہ ہی شعر میں خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے وہ مشکل زمینوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر شاعری مرصع سازی سے باز رہی مگر آپ نے وزن وتاثر کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ آخر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ماجد کی شاعری پر لکھنوی رنگ کا اثر ہونے کے باوجود بھی یہ موضوعاتی طور پر اپنے معاصرین سے منفرد ہے۔ انھوں نے اپنی مشاہدانہ کاوش اور فنکارانہ بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے شاعری میں مقبول ہونے کا وہ فارمولہ یا طریق کار بہت پہلے ہی سیکھ سمجھ لیا تھا جس سے کبھی میر اور نظیر نے شاعری کے میدان میں پذیرائی حاصل کی تھی یعنی سادگی اور روانی کے ساتھ مقامی رنگ کو یکجا کرکے عوام کے لیے شاعری کرنا۔ لہٰذا ماجد نے بھی عوام کی نبض، اس کی پسند، اس کی نفسیات اور اس کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اپنی شاعری کو موضوعاتی اور فنی اعتبار سے آسان ہی نہیں بلکہ آسان تر بنادیا جسے ان کی شاعری کا جزو اعظم اور مقبولیت کا ضامن قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنی انھیں شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر وہ اردو کے کامیاب شعرا کی صف میں شامل کیے جاتے رہے ہیں اور آئندہ بھی شامل کیے جاتے رہیں گے۔

"ماجد کی شاعری پر لکھنوی رنگ کا اثر ہونے کے باوجود بھی یہ موضوعاتی طور پر اپنے معاصرین سے منفرد ہے۔ انھوں نے اپنی مشاہدانہ کاوش اور فنکارانہ بصیرت کا استعمال کرتے ہوئے شاعری میں مقبول ہونے کا وہ فارمولہ یا طریق کار بہت پہلے ہی سیکھ سمجھ لیا تھا جس سے کبھی میر اور نظیر نے شاعری کے میدان میں پذیرائی حاصل کی تھی یعنی سادگی اور روانی کے ساتھ مقامی رنگ کو یکجا کرکے عوام کے لیے شاعری کرنا۔ لہٰذا ماجد نے بھی عوام کی نبض، اس کی پسند، اس کی نفسیات اور اس کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے اپنی شاعری کو موضوعاتی اور فنی اعتبار سے آسان ہی نہیں بلکہ آسان تر بنادیا جسے ان کی شاعری کا جزو اعظم اور مقبولیت کا ضامن قرار دیا جاسکتا ہے۔"

■

Dr. Nadeem Ahmad
C-36/5, Lane No:2, R.K. Marg
Chauhan Banger
Delhi - 110053 Mob:9136162160
Email: nadeemahmad_162@yahoo.co.in

سیدہ جبینفر رضوی

دبستانِ مرشد آباد

اردو زبان و ادب کا ایک حسین گہوارہ

اردو زبان وادب کی اشاعت میں لکھنؤ، دہلی، دکن کے ساتھ ساتھ مرشد آباد کا رول بھی کم اہم نہیں ہے۔ جبکہ مرشد آباد اور اس کے اطراف میں بنگلہ زبان بولی جاتی تھی مگر بیرونی افراد کی آمد ورفت اور نوابین مرشد آباد کی علم دوستی کی وجہ سے اردو کو مرشد آباد میں پروان چڑھنے کا بہترین موقع ملا۔ شعروسخن اور علم وادب کی دلچسپی کی وجہ سے مرشد آباد کا دربار دور دراز کے علماء وشعرا سے بھرا رہتا تھا۔ انہی شعرا اور ادبا کی کاوشوں سے اردو بنگال کے اطراف تک پہنچی۔

اٹھارہویں صدی میں بنگال میں مرشد آباد اور ڈھاکہ اردو کے دو مرکز تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے ڈھاکہ کے مقابلے میں مرشد آباد کو زیادہ ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دہلی اور لکھنؤ کی محفلیں ویران ہوئیں تو اکثر شعرا نے مرشد آباد کا رخ کیا اور یہیں سکونت پذیر ہوئے۔

مغلیہ عہد میں بھی مرشد آباد کی ادبی محفلیں روشن تھیں۔ خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں کے شاگردوں نے یہاں اردو کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ مخلص مرشد آبادی میر کے ہم نوا اور ہم عصر شاعر تھے۔ تذکرہ نگاروں نے مخلص مرشد آبادی کو میر کا ہم پلہ بھی قرار دیا۔ دبستانِ مرشد آباد کے کئی ایسے شاعر ہیں جنھیں اردو ادب میں غالب، آتش اور میر کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

اردو کا مرشدآباد سے تعلق و رشتہ

ناطق لکھنوی کے لفظوں میں ''اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور کیجیے جو شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا، دہلی میں آکر دریا بنا اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں ایک بنگال کو گئی، ایک بہار کو، ایک اودھ کو اور ایک گجرات کو۔ یہ تمام شاخیں دکن میں جا کر سمندر بن گئی۔'' (نظم اردو ص15)

بنگال میں سلطان حسین شاہ بڑا علم دوست اور زبان وادب کا قدرداں تھا۔ اس کی حکومت میں اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں نے خوب ترقی کی۔

اس کے دربار کا ایک بڑا مشہور شاعر قلنس مصنف برگاؤنی تھا۔ اس کا کلام ابھی تک موجود ہے۔

شیخ نورالحق پنڈویؒ نے اردو زبان کو دعوت وتبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ ان کے صوفیانہ کلام اور اقوال سب اردو میں پائے جاتے ہیں۔

اردو کا بنگال اور مرشد آباد کی سرزمین سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ بادشاہوں سے لے کر صوفیائے کرام تک نے بنگال میں اردو کی ترویج واشاعت میں حصہ لیا۔ شعرا و ادبا نے اپنی شاعری وکمال کے ذریعے اردو کو سب سے مقبول اور پسندیدہ زبان بنادیا تھا۔

دبستان مرشدآباد کے ممتاز و نامور شعرا و ادبا :

دبستانِ مرشد آباد کو علمی وادبی سطح پر جن شعرا وادیبوں نے شناخت دلوائی اور صدیوں یہاں کی علمی فضا کو روشن کیے رکھا ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں:

میر امانی اسد: آپ کا پورا نام میر امانی اور اسد تخلص تھا۔ آبائی وطن شاہ جہاں آباد تھا۔ انھوں نے مرزا رفیع سودا کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں اہل دلی پر جب زمین تنگ ہو رہی تھی تو اسد نے بھی اسی دور میں دلی کو خیر آباد کہا اور مرشد آباد کی راہ لی۔

اس زمانے میں میر محمد جعفر خان بنگال کے صوبہ دار تھے۔ میر امانی اسد کو نواب کی سرپرستی حاصل ہوئی اور انھوں نے باقی زندگی مرشد آباد ہی میں بسر کی اور یہیں پر پیوندِ خاک ہوئے۔

پی کر شراب دُرد تہہ جام دے گیا   وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا

صاحب میر الم: نام صاحب میر اور الم تخلص تھا۔ اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر خواجہ میر درد کے صاحبزادے ہیں۔ 1774 میں مرشد آباد تشریف لائے۔

الم مرشد آباد کی محفل ادب میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُس وقت میر جعفر خان کے چھوٹے لڑکے مبارک الدولہ مرشد آباد میں مسند نشین تھے۔

دبستان دہلی کے کہنہ مشق استاد میر درد کے لڑکے ہونے کی وجہ سے مرشد آباد کی ادبی محفلوں میں الم کی بڑی عزت تھی۔ وہ خود بھی ایک باکمال شاعر تھے۔

ان کے نمونہ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ الم پر دبستان دلی کا اثر غالب ہے۔ فارسی کے الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور مشکل قوافی میں اپنے فن کا کمال دکھاتے ہیں۔

جب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو   مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر
آ جاتا ہے دکھ درد بھلانے کو الم یاں   کیا اس سے مزاحم ہوا اٹھاتے بھلا لڑ کر

خواجہ امانی: آپ کا پورا نام میر امانی اور تخلص بھی امانی تھا۔ خواجہ برہان الدین آثمی ان کے والد کا نام تھا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کی وجہ سے بہت سارے اہل فن بنگال کے صوبائی مرکز مرشد آباد میں آکر بس رہے تھے اور نوابان بنگالہ کی سرپرستی حاصل کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں آپ بھی مرشد آباد آ کر بسے۔

خواجہ امانی بھی انھیں اہل فن میں سے تھے جو 1181ھ میں دلی سے کوچ کرکے نواب میر محمد جعفر خان کے دور حکومت میں مرشد آباد آ بسے تھے۔ ان کا شمار اس دور کے بلند مرتبہ شاعر اور ایک عظیم مرثیہ گو میں ہوتا ہے۔ ایام محرم میں منبر پر مرثیہ پڑھتے ہوئے شدت کے ساتھ گریہ کرتے تھے اور ایام محرم شدت کرتے ہوئے بیہوش ہو کر اس نیا

سے رخصت ہو گئے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف نے خواجہ امانی کی دلی سے مرشد آباد کی روانگی کا سال 1181ھ اور سال وفات 1187ھ لکھا ہے جب کہ 'سخن شعرا' میں امانی کے مرشد آباد پہنچنے کا سال 1177ھ لکھا ہے اور ان کا تخلص امانی لکھا ہے۔

راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل   آنکھیں تو پتھرا گئیں پر وہ نہ آیا سنگ دل
گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا   اے نالہ دل وقت ہے فریاد رسی کا
چاہ میں کس کے دل ڈبو بیٹھے   آہ ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل   کفِ افسوس اب ملو بیٹھے

سید عبدالولی عزلت: نام سید عبدالولی تخلص عزلت تھا۔ مشہور صوفی زاہ سعداللہ سورتی کے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش 1692 میں سورت میں ہوئی۔ ان کی پرورش ان کے چچا نے کی۔ عزلت نواب علی وردی خاں کے مہابت کے دور میں مرشد آباد تشریف لائے تھے۔ اس وقت بنگال میں نواب علی وردی خاں صوبے دار تھے۔

'دیوان عزلت' کے مرتب عبدالرزاق قریشی، عزلت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دہلی سے عزلت مرشد آباد گئے۔ یہ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ کا زمانہ تھا۔ انھوں نے ان کی قدر کی اور لطف و کرم سے پیش آیا۔ 1755 میں ان کا انتقال ہو گیا تو حیدر آباد چلے گئے .... عزلت نے محمد فقیر درد مند کے مشہور ساقی نامہ کے جواب میں ایک ساقی نامہ بھی لکھا تھا جس میں 231 اشعار تھے۔ یہ ساقی نامہ انہوں نے ایک دن میں کہا تھا۔ اس کا تاریخی نام 'بیان ظہور' (1147ھ/ 1760) ہے۔''

عزلت کی وفات 1755 میں حیدر آباد میں ہوئی۔

ہیبت قلی خان حسرت: آپ کا پورا نام میر محمد حیات تھا۔ ہیبت قلی خاں لقب، حسرت تخلص تھا۔ مظہر ضانِ جاناں کے شاگرد تھے۔ ''صاحب مسرت افزا نے انھیں مرشد آبادی بتایا ہے۔'' حسرت نواب علی وردی خان کے نواسے شوکت جنگ کی ملازمت میں تھے۔ 1756 میں جب علی وردی خان کا انتقال ہوا تو تخت نشینی کی جنگ نواب سراج الدولہ اور نواب شوکت جنگ کے درمیان ہوئی تھی اور شوکت جنگ اسی جنگ میں مارے گئے تھے۔ 1195ھ میں سراج الدولہ کے وقت مرشد آباد پہنچے اور اس کے بعد حسرت نے نواب سراج الدولہ کی سرکار میں داروغہ اور عرض بیگی کی ملازمت حاصل کی تھی اور مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھے۔ حسرت اپنے دور کے بڑے عالم ہی نہیں بلکہ اردو کے بلند مرتبہ صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔

حسرت کا شمار بنگال کے نامور و مقبول ترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ وہ اردو اور فارسی کے ایک بڑے عالم اور بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ اپنی حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ ان کے'' دیوان کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں محفوظ ہے۔ جن میں تقریباً دو ہزار اشعار موجود ہیں۔ حسرت محمد حسین یاد اور زادہ مخلص کے استاد تھے۔ 1795 میں نواب ببر علی خان کے عہد نظامت میں حسرت مرشد آباد ہی میں فوت ہوئے

قفس میں ہمیں رہنے دے صیاد   کہاں اب اڑ سکیں جب بال و پر گئے
ہو جاوے اک توجہ ادھر بھی اگر کبھی   اتنا بڑا یہ کام ترے رو برو نہیں
یک بیک یاد تمہاری جو مجھے آتی ہے   جی ہی جانے ہے جو کچھ دل پہ گزر جاتی ہے
میری بات سنتا ہے اس طور سے   کہ کہتا ہوں گویا کسی اور سے
سنا ہے آج میخانہ میں جام مے پہ مستوں نے   لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں
لب بام آ کے یہ تیرا کھڑے رہنا تو الفت ہے   سوا نیزے پہ گویا آفتاب آیا قیامت ہے

حسرت اردو ادب کے ان اہم ستونوں میں ہیں جن کی ادبی خدمات نے اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں مرشد آباد کو ملک گیر شہرت بخشی تھی اور مشرقی ہند کا ایک عظیم ادبی مرکز بنایا تھا۔

سید محمد فقیہ درد مند: مرشد آباد کو ادبی دنیا میں ایک اہم مقام عطا کرنے والوں میں ایک خاص نام سید محمد فقیہ درد مند کا ہے۔ درد مند حیدر آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی دور میں انہوں نے شاہ ولی اللہ اشتیاق کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو مظہر جان جاناں کی شاگردی اختیار کر لی۔ ''مرزا جان جاناں مظہر کی اصلاح نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔'' مرزا جان جاناں نے خود ان کی مدح سرائی کی ہے۔

غافل مباش مظہر از احوال درد مند   لعلیست آں کہ در گرۂ روزگار نیست

نوازش محمد خان کی سرپرستی میں درد مند نے اپنی تمام عمر مرشد آباد ہی میں گزاری اور یہیں 1763 میں پیوند خاک ہو گئے۔ نوازش محمد خان، ناظم بنگالہ نواب علی وردی خان کے بڑے داماد تھے اور موتی جھیل کے محل میں رہتے تھے۔ جہاں تقریباً ہر شام ادبی نشست منعقد ہوا کرتی تھی۔

درد مند فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ اردو میں ان کی مثنوی 'ساقی نامہ' ہے جو کہ غیر معمولی شہرت کی حامل رہی ہے۔ درد مند اردو کے بھی باکمال شاعر تھے لیکن ان کے اردو دیوان کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا ہے۔

مختلف اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنے کمال کا جوہر دکھایا ہے۔ زبان میں صفائی اور اشعار میں روانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرشد آباد کی تاریخ ادب میں ان کا نمایاں مقام ہے اور یہ بعد کے شعرا کے لیے پیش رو ثابت ہوئے

کہسار میں جا گرا ہے ناحق کے تئیں   پرویز سے جا بھڑا ہے ناحق کے تئیں
کوئی فکر پہاڑ سے لیتا ہے   فریاد کا سر پھرا ہے ناحق کے تئیں
پڑی اس کی خوبی کی از بس کہ دھوم   لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم

نواب میر محمد شرف: میر جعفر کے دور میں نواب میر محمد شرف مشہور شاعر تھے جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ غالباً میر جعفر کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ نواب سیدّ جعفر خاں صوبیدار مرشد آباد سب کے سب تلف ہو گئے۔ ان کی ایک رباعی زبان زد عام ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ یہ رباعی ان کی خوشحال زندگی کی آئینہ دار ہے:

قزاق نہیں کہ لوٹ لاتے ہیں ہم   مزدور نہیں کہ روز پاتے ہیں ہم
کیا پوچھتے ہو یارو حقیقت اپنی   اللہ دیتا ہے بیٹھے کھاتے ہیں ہم

شیخ فرحت اللہ فرحت: ان کا نام شیخ فرحت اللہ اور فرحت تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ اسد اللہ تھا۔

فرحت اللہ غالباً نواب میر جعفر کے عہد نظامت میں مرشد آباد آئے تھے۔ فرحت کا انتقال نواب مبارک الدولہ کے عہد نظامت میں 1777 میں ہوا تھا۔ نساخ نے اپنے تذکرہ سخن شعرا میں انہیں بہادر علی خان کے رفیقوں میں شمار کیا ہے۔ بہادر علی خان اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ناظم بنگالہ کی سرکار میں داروغہ توپ خانہ تھے۔ فرحت اردو کے ایک باکمال صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔

فرحت ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کی زبان میں سادگی اور سلاست ہے۔

زندگی میں تو رہے صدمے دل غمناک پر   بعد میرے دیکھیے کیا ہو قیامت خاک پر
مرنے کے بعد مجھ پر کیا کیا ستم نہ ہوں گے   دیکھیں گے غیر تجھ کو اور ہائے ہم نہ ہوں گے
کھولے وہ اگر زلفِ گرہ گیر ہوا پر   بندھ جائے ابھی صورت زنجیر ہوا پر
آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم   ہر گز نہیں ہے دل پر کچھ اختیار اپنا

مرزا اشرف علی خان فغاں: نام مرزا اشرف علی خان کا تخلص فغاں تھا۔ فغاں اکبر قلی کے پوتے محمد ایراج خان کے بھتیجے اور مرزا علی خان کے بیٹے تھے۔

فغاں عاقل وظریف تھے۔فن لطیفہ گوئی میں کمال حاصل تھااور دہلی میں احمد شاہ بادشاہ کے دربار میں عزت سے گزارا کرتے تھے مگر بادشاہ احمد شاہ کے بعد فغاں کو دلی سے نکلنا پڑا اور اپنے چچا ایراج خان کے پاس مرشدآباد پہنچے اس وقت بنگال کے ناظم علی وردی خان تھے۔ فغاں مرشدآباد میں اپنے چچا کے ساتھ عیش وآرام کے ساتھ ایک مدت تک رہے اور پھر اپنے چچا کے انتقال کے بعد عظیم آباد گئے اور وہیں 1772 میں انتقال کیا۔

فغاں جس دور میں مرشدآباد میں مقیم تھے اردو ادب کی تاریخ میں وہ مرشدآباد کا زریں دور کہا جاتا ہے۔

فغاں کو علی قلی خان ندیم سے شرف تلمذ تھا انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔اپنے عہد کے بلند پایہ انشا پرداز اور ایک باکمال شاعر تھے۔اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ان کو فن غزل گوئی سے بھی دلچسپی تھی۔

فغاں کا اردو دیوان غالباً 1950 میں انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کیا ہے۔ فغاں نے اپنی طویل مدت قیام میں دبستان مرشدآباد کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا خاص کر غزل کو ایک اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

دل بستگی قفس کی یہاں تک ہوئی مجھے　　گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا
کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں　　یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا
خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں　　لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
قاصد جو نا امید پھرا کوے یار سے　　خفت مجھے ہوئی دل امیدوار سے
کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے فغاں تنہا　　کہ اس سرا کے مسافر تو گھر گئے اپنے
شب فراق نہ تنہا مجھے رلاتی ہے　　یہ صبح وصل بھی آنسو سے منہ دھلاتی ہے
اٹھ چکا دل مرا زمانے سے　　اڑ گیا مرغ آشیانے سے
جاگا نہ کوئی خواب عدم سے کہ پوچھتے　　آسودگان خاک میں بیدار کون ہے
میں مر گیا پہ آہ نہ پوچھا فغاں مجھے　　درد جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

فغاں کی شاعری اپنے عہد کی اعلیٰ فن کاری کا نمونہ ہے اور غزل کی دنیا میں اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔

میر ماشاء اللہ خان مصدر: مصدر ناظم بنگالہ نواب علی وردی خان مہابت جنگ کے دور حکومت میں مرشدآباد تشریف لائے۔ علی وردی خان علما، فضلا، شعرا اور اہل رائے حضرات کی دل سے قدردانی کرتا تھا اور اپنے دربار میں اعزاز واکرام کے ساتھ رکھتا تھا۔ ہر روز اہل علم کی صحبت میں بیٹھتا تھا اور ان سے فیضیاب ہوتا تھا۔ مصدر دلی میں شاہی طبیب رہ چکے تھے۔ علی وردی خان نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وظیفہ مقرر کیا۔ ان کے بعد نواب سراج الدولہ کے عہد حکومت میں بھی بڑی شان سے زندگی گزاری۔

خدا کرے کہ مرا مجھ سے مہرباں نہ پھرے　　پھر جہاں سے تو پھرے پر وہ جانجاں نہ پھرے
کافر ہو سوا تیرے کرے چاہ کسو کی　　صورت نہ دکھائے مجھے اللہ کسو کی

خواجہ فدائے علی ثبت: پورا نام خواجہ فدائے علی تھا اور تخلص ثبت تھا۔ان کا وطن مرشدآباد تھا۔ نواب میر بیر علی خان اور نواب والا جاہ کے عہد نظامت میں ثبت مرشدآباد کی شاعرانہ فضا میں پروان چڑھے تھے۔ ان کا شمار مرشدآباد کے اوسط درجہ کے شاعروں میں کیا جاسکتا ہے۔

کاکلیں آپ جو آئینہ میں سلجھاتے ہیں　　موبمو پیچ میں خوبان حلب آتے ہیں
صدقے ہو جاؤں میں اللہ رے یہ بھولا پن　　گالیاں دیتے ہیں اور آپ ہی شرماتے ہیں

آسماں قدر سید اسدعلی میرزا ثریا: نواب آسماں قدر سیّد اسدعلی میرزا تخلص ثریا آخری ناظم بنگالہ نواب سیّد منصور علی خان فریدوں جاہ کے لڑکے تھے۔23 نومبر 1855 میں مرشدآباد قلعہ نظامت میں پیدا ہوئے۔ ناظم بنگالہ منصور علی خان کے دربار میں اہل فکر وفن کی خاصی تعداد موجود تھی۔ شرف النساء جیسی شاعرہ نواب کے محل میں موجود تھیں اور مرشدآباد کی ادبی فضا میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ لہٰذا ثریا کو اندرون و بیرون محل میں علم وادب اور شعروسخن کا ایک ایسا سازگار ماحول ملا کہ شاعری ان کی فطرت میں رچ بس گئی۔

ان کی شاعری میں منظرکشی نمایاں خصوصیت رکھتی ہے۔ شگفتگی، درد واثر، فصاحت وروانی ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ثریا صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ ان کا دیوان پروفیسر ڈاکٹر جاوید نہال کے پاس محفوظ ہے۔

1922 میں ثریا کا مرشدآباد میں انتقال ہوا اور مرشدآباد کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ثریا اپنے عہد کے ایک صاحب دیوان شاعر ہی نہیں بلکہ ادب کے سرپرست اور قادر الکلام شاعر گزرے ہیں۔

درد و غم سے نکل کر مجھے تو کچھ نہ ملا　　خوشی کا بھیس بدل کر مجھے تو کچھ نہ ملا
یہ اور بات ہے اوروں کے گھر ہوئے روشن　　تمھاری بزم میں آکر مجھے تو کچھ نہ ملا
جب سے دل کو ہوئی اس غنچہ دہن کی خواہش　　سیر دریا کی ہوس ہے نہ چمن کی خواہش
رخ پر نور پہ زلفوں کو جو بکھراتے ہیں　　آج شاید ہے انہیں چاند گہن کی خواہش

کیوں مرے اہل وطن روک رہے ہیں مجھ کو
جب کہ دیوانہ ہوں کیونکر نہ ہو بن کی خواہش

ثریا مرشدآباد کے ایک باکمال شاعر گزرے ہیں ان کے دیوان کے پہلے چند اوراق موجود نہیں ہیں۔ دیوان بارہ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا ہے اس میں 77 اوراق ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔

شاہ حمزہ رند: شاہ حمزہ علی نام اور رند تخلص تھا۔ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ مجبوراً وطن ترک کرنا پڑا اور روزگاری کی تلاش میں مرشدآباد پہنچ گئے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ رُباعیاں بھی کہی ہیں۔ بنی نرائن جہاں اپنے تذکرہ 'دیوان جہاں' میں ان کے متعلق رقم طراز ہیں:

''رند تخلص، نام رائے تھیم نرائن مہاراجہ بچھی نرائن کے پوتے، عمدہ روزگار، رہنے والے دلّی کے اور اب ہوگلی تشریف رکھتے ہیں۔''

(دیوان جہاں، از: بنی نرائن جہاں، قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی، ص 67)

'دیوان رند' میں ان کی دس رباعیاں ملتی ہیں۔ دو رباعیاں نذر قارئین ہیں۔

گر اس فقیر کے آنے سے منہ پھرا بیٹھے　　تو کہتے اپنا منہ کے لیے دور جا بیٹھے
وہ دن گئے کہ نہ اٹھتا تھا میری صحبت سے　　زمانہ اور ہوا اب تیری بلا بیٹھے

حوالہ

- بنگال میں اردو زبان وادب: شانتی رنجن بھٹاچاریہ
- بنگال میں اردو: وفا راشد
- میر باقر تخلص مرشدآباد: ڈاکٹر عبدالرؤف 1982
- بنگال کا اردو ادب: جاوید نہال
- روح ادب: مغربی بنگال کا اردو ادب نمبر شمارہ 004
- بنگال میں اردو نثر کی تاریخ: سالک لکھنوی
- بنگال میں غالب شناسی: کلیم سہرامی
- تذکرہ گلزار ابراہیم: محمد ابراہیم خلیل
- تذکرہ گلشن ہند: مرزا علی لطف
- تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن
- عبدالغفور نساخ کا تذکرہ سخن الشعرا
- عیار الشعرا: خوب چند ذکا
- شمع فروزاں: بزم ارباب ادب مرشدآباد کا ترجمان

Syeda JenifarRezvi
Research Scholar
Dept. of Arabic, Persian, Urdu & IslamiStudies
Visva-Bharati, Bhasha-Bhavana, Santiniketan,
Mob.-7872873542
Email-syedarezvi@yahoo.com

پرویز اشرفی

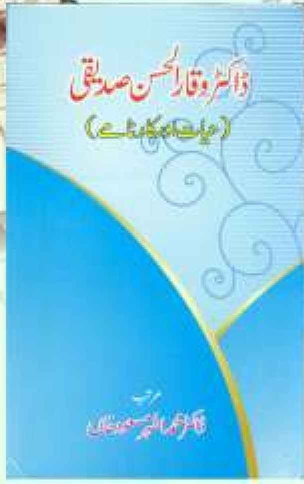

رامپور رضا لائبریری کا ایک فرشتہ صفت نگہبان

وقار الحسن صدیقی

تاریخ کے صفحات میں بڑی بڑی شخصیتیں، فرماں روا، فاتحین، فلسفی، شعراء، ادبا اور فنکار محفوظ ہیں جن کے احترام سے آج بھی سینے معمور ہیں۔ شخصیتوں کی عظمت کے اعتراف سے تاریخ کی یہ حقیقت بھی پوری طرح ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتوں کے متعلق ہم بہت کچھ جاننے کے باوجود بہت ہی کم جانتے ہیں۔ نہ جانے کتنے عظیم انسان ایسے ہیں جن کے نام تاریخ میں محفوظ نہیں رہے اور جن عظیم شخصیتوں کے حالات ملتے ہیں وہ کتنے مختصر، ناکافی اور ادھورے ہیں، لیکن بعض شخصیات اتنی پُرکشش ہوتی ہیں جن کے بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور یہی چاہت بڑھتے بڑھتے ملاقات کے دروازے پر دستک دینے لگتی ہے۔ آج میں دورِ جدید کی اس تاریخ ساز شخصیت اور اس کی خدمات پر قلم اٹھا رہا ہوں، جس کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

میں 2001 میں رامپور کے قدیمی تعلیمی ادارے مرکزی درس گاہ اسلامی جونیئر ہائی اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اسی درمیان سرزمین رامپور کی معروف علمی و ادبی شخصیت جناب مرتضیٰ ساحل تسلیمی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ آپ کے ساتھ اکثر رضا لائبریری کے کسی سمینار یا اہم پروگرام میں جانے کا موقع ملا، وہاں جناب وقار الحسن صدیقی صاحب جو رضا لائبریری کے افسر بکارِ خاص تھے، اُن کو سننے کا موقع ملا۔ دل میں ان سے ملاقات کرنے کی خواہش نے کروٹ لی لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔

ایک بار رضا لائبریری میں رمضان المبارک کے موقع پر قرآن کریم کے نادر نسخوں کی نمائش کا انعقاد ہوا۔ اس وقت میں اپنے والد محترم جناب حاجی عبد الرحمٰن صاحب کو اس نمائش میں لے گیا۔ واپسی پر جناب وقار الحسن صدیقی صاحب سے رسمی ملاقات ہوئی۔ آپ بڑے خلوص سے ملے اور فرصت میں ملنے کی دعوت دی۔ ان مختصر لمحوں میں میرے والد محترم وقار صاحب سے بے حد متاثر ہوئے اور مشورہ دیا ''بیٹا! وقار صاحب بڑے خلیق انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اندازِ گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک شخص نہیں بلکہ علم کا سمندر ہیں، میری بات مانو تم اس علمی شخصیت سے ضرور ملاقات کرو۔'' والد کا حکم اور وقار صاحب کی پُرکشش شخصیت نے مجھے بے چین کر دیا کہ کوئی موقع ہو اور میں ان سے ملاقات کرکے اپنی علمی پیاس بجھاؤں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے وہ وقت میرے حصے میں عطا فرمایا جب میں بچوں کے ایک رسالہ کے لیے ان سے انٹرویو لینے پہنچ گیا۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی صاحب سابق ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ ہند اور افسر بکارِ خاص رامپور رضا لائبریری، ہندوستان کی ان مایہ ناز اور ممتاز شخصیات میں تھے، جن کی ذات ملک و قوم کے لیے سرمایہ صد افتخار، خاندانوں کے لیے باعث فخر اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ ہندوستان کے ماہر آثار قدیمہ، بیدار مغز، ذہین مورخ، ماہر علم کتبات اور سکہ شناس تھے۔ علاوہ ازیں ایک اچھے ادیب اور باشعور شاعر بھی تھے۔ آپ نے آگرہ، فتح پور سیکری، سلطنت گجرات، سلطنت قطب شاہی، گول کنڈہ دکن اور ہندوستانی مسلمانوں کے فن نقاشی اور فن تعمیرات پر جو اہم کام کیا ہے اسے دور دور تک سراہا گیا۔ وہ ایسے شخص تھے جنھوں نے جنوبی دہلی میں باغ تغلق کا پتہ چلایا۔ جس سے جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کے آرائشی باغات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ قومی آثار و عمارات خصوصاً کمبوڈیا کے مشہور انگور واٹ مندر کو جدید سائنسی تحقیق کے ذریعہ محفوظ کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔

وقار الحسن صدیقی نے UNESCO کی متعدد کانفرنسوں میں شرکت کی۔ ہند اور بیرون ہند میں تاریخ اور آثار قدیمہ سے متعلق ہونے والے بین الاقوامی سمیناروں میں شریک ہونے کے لیے روس، امریکہ، عراق، پاکستان، سعودی عرب، ملیشیا، مالدیپ، کمبوڈیا، سری لنکا، ویتنام اور نائیجیریا کا سفر کیا۔

ان سمیناروں میں ٹھوس معلوماتی اور بصیرت افروز تحقیقی و علمی مقالات پڑھے، جنھیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کے ساتھ UNESCO کے SILK ROUTE پروجیکٹ کے سلسلے میں 1985 میں الماتا (قزاقستان) میں نائب صدر کے عہدے کے لیے منتخب

کیے گئے۔

تاریخ سے متعلق وقارالحسن صدیقی صاحب کا کہنا ہے:

''تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے اور لکھنے کے لیے مؤرخ کو نہ صرف گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ وسیع النظری اور وسیع القلبی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کے سبب تاریخ داں کسی بھی طرح کے تعصب سے اجتناب کرتا ہے۔'' (پیش لفظ: تاریخ روہیلہ)

آپ کے تحریر کردہ تقریباً 200 علمی مقالات جو تاریخی اور آثار قدیمہ ہند و پاک کے موضوعات پر مشتمل ہیں، ملک و بیرون ملک کے مؤقر جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ رضا لائبریری رامپور سے شائع ہونے والی تمام کتابوں پر مؤثر پیش لفظ تحریر کیے جن سے ان کی اس متعلقہ موضوع سے دلچسپی اور معلومات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی کو اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کے علاوہ مراٹھی، گجراتی، سنسکرت، جرمن اور فرانسیسی زبان کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی کی شخصیت میں سادگی تھی، ذہن ہر طرح کے مذہبی، مسلکی اور علاقائی تعصبات سے پاک تھا۔ دل شیشے کی طرح صاف و شفاف تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ موصوف کی شخصیت میں خاص قسم کے اچھوتے پن کا احساس ہوتا تھا۔

ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی نے اپنے بے لوث قومی و ملکی جذبے کے تحت رضا لائبریری رامپور کی وہ خدمات انجام دیں جو ناقابل فراموش ہیں۔ آپ نے رضا لائبریری رامپور نامی ایک پودے کو اپنی محنت اور خلوص نیت و محبت سے ایک سدابہار تناور درخت بنا دیا ہے۔ وقارالحسن صدیقی نے لائبریری کے ہر شعبہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کی مثال رضا لائبریری کی تاریخ میں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

وہ سرزمین رامپور جسے مرزا غالب نے دارالسرور کا لقب دیا تھا، وہ رامپور جو اردو کا شہر ہے۔ جہاں اردو زبان خون بن کر رگوں میں دوڑتی ہے، وہ رامپور جہاں آج بھی مسلم تہذیب و ثقافت کی وراثت نہایت آب و تاب کے ساتھ قائم و محفوظ ہے۔ اس رامپور کی رضا لائبریری میں ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی نے نشر و اشاعت کا شعبہ قائم کر کے لائبریری کے علمی وقار کو بلندی عطا کی۔ ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ رضا لائبریری کے لیے اپنی کارکردگی سے سالانہ گرانٹ میں معقول اضافہ کرایا اور متعدد نئے شعبہ جات کھول کر رضا لائبریری کو شہرت عام بخشی۔ انٹرویو لیتے وقت میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے تاریخی عمارات سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''آثار قدیمہ کی تعمیرات و سروے کے دوران، میں راجستھان کے شہر جودھ پور گیا۔ وہاں کے لوگ یہ کہتے تھے کہ آپ اپنا برتن خود اپنے ہاتھوں سے دھویے تو ہم آپ کو کھانا کھلائیں گے۔ اس پر میں نے کہا کہ ایسی جگہ جہاں ایک انسان کو دوسرے انسان سے کمتر درجہ کا سمجھا جائے، میں وہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بائیس دنوں تک میں نے پکا ہوا کھانا نہیں کھایا اور صرف بریڈ اور انڈوں پر اکتفا کرتا رہا۔''

انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا:

''اپنی تہذیب و ثقافت کی معلومات تاریخ ہی سے ہوتی ہے۔ دوسری بات، کوئی غلط کام جو ہو چکا ہو اسے دہرانا نہیں چاہیے۔''

پھر وہ بولے:

''انسان کو انسانیت سے Define کیا جانا چاہیے۔ تاریخ خشک مضمون کبھی نہیں رہا۔ ریاضی سے زیادہ خشک کوئی مضمون نہیں اور تاریخ (History) تو بڑا ہی دلچسپ اور سبق آموز مضمون ہے، جو ہمیں بتاتا ہے کہ گزرے ہوئے وقت میں کیا کیا ہو چکا ہے۔؟''

ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی اب اس دنیا میں نہیں، لیکن اُن کے کہے ہوئے وہ مذکورہ بالا الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں، کیونکہ ان سے مل کر اس احساس کے ساتھ لوٹا تھا کہ انھوں نے نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی اور ثقافتی امور پر بھی بہت کام کیا ہے۔ بالخصوص رامپور رضا لائبریری ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

موجودہ دور میں بچوں کی تعلیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''بچوں کے لیے دینی و عصری دونوں طرح کی تعلیم ضروری ہے۔ کوئی اسکول کس معیار کا ہے یہ دیکھنے کے بجائے وہاں کیسی پڑھائی ہوتی ہے، یہ دیکھا جائے تو بہتر ہوگا۔''

اسی ضمن میں انھوں نے مسلم بچوں کو شروع کے دو چار سال مدرسہ میں تعلیم دینے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ مسلم بچے دینیات سے واقف ہو سکیں کیوں کہ جب تک ان کے ذہن میں توحید کا تصور قائم نہ ہو جائے، اللہ کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو سمجھ نہ لیں اس وقت تک انھیں دوسری تعلیم نہ دینی چاہیے۔ اس لیے کہ بغیر دین کے دنیا بے معنی ہے۔ لہٰذا دنیا اور آخرت دونوں کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی اب اس دنیا میں نہیں، لیکن اُن کے کہے ہوئے وہ مذکورہ بالا الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں، کیونکہ ان سے مل کر اس احساس کے ساتھ لوٹا تھا کہ انھوں نے نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی اور ثقافتی امور پر بھی بہت کام کیا ہے۔ بالخصوص رامپور رضا لائبریری ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے شیخ سعدیؒ نے فرمایا تھا:

خیر کن اے عزیز غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

سرزمین رامپور کی رضا لائبریری کے موجودہ در و بام اور علمی سرمائے میں اضافے کو دیکھتے ہوئے اقبال کا یہ شعر لب پر آ جاتا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

■

Parwez Alam
D-321, Dawat Nagar
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob:9990129128
Email: Perwezashrafi1955@gmail.com

ترنم جبیں

سارا شگفتہ

برصغیر کی سلویا پلیتھ

سارا شگفتہ کا شمار اردو کی جدید شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ 31 اکتوبر 1954 کو گوجرانوالہ، پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ اردو اور پنجابی میں معتد بہ نظمیں تخلیق کیں۔ نظمیہ شاعری کے لیے انھوں نے نثری نظم کا پیرایہ اختیار کیا۔ غریب اور ان پڑھ خاندانی پس منظر کے باوجود وہ پڑھنا چاہتی تھیں مگر میٹرک بھی مکمل نہ کر سکیں۔ ان کی سوتیلی ماں، کم عمری کی شادی اور پھر مزید تین شادیوں نے انھیں سخت ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا۔ نتیجتاً انھیں دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں انھوں نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ خودکشی کی یہ کوشش مختلف موقعوں پر چار بار دہرائی گئی۔ ان کی پنجابی شاعری کے مجموعے 'بلدے اکھر'، 'میں ننگی چنگی' اور 'لکن میٹی' اور اردو شاعری کے مجموعے 'آنکھیں' اور 'نیند کا رنگ' کے نام سے شائع ہوئے۔ 4 جون 1984 کو انھوں نے کراچی میں ٹرین کے نیچے آ کر جان دے دی۔ ان کی ناگہانی موت نے ان کی زندگی اور شاعری کے مطالعے کو ایک نئی جہت عطا کی۔ وفات کے بعد ان کی شخصیت پر پنجابی کی مشہور شاعرہ اور ناول نگار امرتا پریتم نے 'ایک تھی سارہ' اور انور سن رائے نے 'ذلتوں کے اسیر' کے نام سے کتاب تحریر کی اور پاکستان ٹیلی ویژن نے ایک ڈرامہ سیریل پیش کیا جس کا نام 'آسمان تک دیوار' تھا۔ ہندوستان میں دانش اقبال نے 'سارا کا سارا آسمان' کے عنوان سے ڈراما لکھا جسے طارق حمید کی ہدایت میں ملک کے مختلف حصوں میں متعدد دفعہ پیش کیا گیا۔ شاہد انور نے بھی سارا کی زندگی سے متاثر ہو کر 'میں سارا' نام سے ایک ڈراما لکھا تھا جو مہیش دتانی کی ہدایت میں پیش کیا گیا تھا۔ سارا نے محض تیس برس کی عمر میں اپنی نظموں کا مجموعہ 'آنکھیں' کا مسودہ تیار کر کے دنیا سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا تھا۔ مبارک احمد کی توجہ سے احمد ہمیش کے ادارے تشکیل پبلشرز، کراچی سے جنوری 1985 میں 'آنکھیں' کا مسودہ کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کا دیباچہ امرتا پریتم نے 'برا کیتو ای صاحباں' کے عنوان سے لکھا تھا۔ تاثراتی نوعیت کا یہ دیباچہ دونوں کے تعلقات کی شدت کا زندہ مظہر ہے۔ سارا کی وفات کے بعد کراچی میں سارا اکیڈمی کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اسی اکیڈمی نے ان کا دوسرا، اردو شعری مجموعہ 'نیند کا رنگ' شائع کیا تھا۔

سارا شگفتہ کو برصغیر کی Sylvia Plath کہا جاتا ہے۔ سارا کی داستان حیات زمان و مکان کی سرحدوں سے پرے اس دھرتی پر عورت کے دکھوں کا تازیانہ ہے۔ چودہ برس کی عمر میں ان کا پہلا نکاح ہوا، لیکن ازدواجی زندگی کا سکھ ان کے مقدر میں تھا ہی نہیں۔ پہلے بچے کی موت کے بعد انھوں نے پہلی نظم لکھی۔ اس طرح ان کی نظم کی پہلی اینٹ دکھ کے سینے پر رکھی گئی اور بقول امرتا پریتم: ''اس وقت سارا شاید یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک دن اس کی نظموں کو پڑھتا ہوا وقت حیرت میں آ جائے گا۔'' (ایک تھی سارا، ص:10) امرتا پریتم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ''شاعری کی تاریخ میں سارا کی نظمیں ایک کنواری ماں کی حیرتیں ہیں۔'' (ایک تھی سارا، ص:10) مرد اساس سماجی نظام اور معاشرتی ڈھانچے نے ان کی انا کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان کی تخلیقات وقت کی ساری زنجیروں کو توڑ دیتی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اپنے دم خم پر کیا، اس گھڑی اور اس مقام پر کیا، جہاں علم پر مردوں کا مکمل اجارہ تھا۔ ان کے بے باک، باغیانہ اور منطقی افکار کے نتیجے میں اندھے سماج نے انھیں پاگل قرار دے کر قید کر دیا تھا۔ انھوں نے تو دنیا کو سمجھ لیا تھا لیکن دنیا انھیں سمجھنے میں ناکام رہ گئی۔ آج بھی ناکام ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں سارا شگفتہ نسوانی احتجاج کی سب سے طاقتور آواز ہیں۔ پروین شاکر کے یہاں رومانی لہجہ غالب رہتا ہے جبکہ سارا کا بیانیہ ادھورا، ان کہا، ان چھوا، چبھتا، سسکتا، مچلتا ہوا ذات کی شناخت پر اصرار میں سراپا احتجاج نظر آتا ہے۔ ان کے سفاک اسلوب نے ان کی فکر کو اور مضبوط کر دیا ہے۔ پروین شاکر نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان پر ایک مکمل نظم تخلیق کی ہے جس میں ان کی شخصیت کے اجزائے پریشاں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم کا عنوان ہے 'ٹماٹو کیچپ'۔ اس نظم کا شمار پروین شاکر کی خوبصورت نظموں میں کیا جاتا ہے۔ عذرا عباس نے بھی ایک نظم میں سارا کو خراج محبت پیش کرتے ہوئے انھیں کبھی نہ ختم ہونے والا سفر قرار دیا تھا۔

اردو شاعری کی تاریخ میں سارا شگفتہ نثری نظم کا سب سے نمایاں کردار ہیں۔ سارا نے نثری نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ ان کی ذات کا بکھراؤ نظم و ضبط کی پابندی کیسے کر سکتا تھا؟ پابند شعری روایت کے اصولوں میں جکڑ کر اوزان و بحور، ردیف و قوافی اور سکہ بند تلازمات سے ہم آہنگ ہونا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ تو ہر اصول کو توڑ دینا چاہتی تھیں۔ پدری نظام نے ادب کے جو اصول بنائے ہیں، وہ انھیں قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ نظم کے روایتی نظام کو رد کرتے ہوئے انھوں نے ایک نظم میں اپنا تصور شعر واضح کیا ہے:

شاعری جھنکار نہیں جو تال پر ناچتی رہے/ گیا وقت/ جب خواجہ سرا ٹوٹی کمان ہوتے تھے/ اور موت پر تالیاں پیٹا کرتے تھے/ پازیب پہن کر میدان میں نہیں بھاگ سکتے/ یہ کہیں بھی ساتھ چھوڑ سکتی ہے/ غار میں چپی چنائی جگہ/ دار ہے، بامشقت قیدی ہے/ لیکن نظم میں نہ غار ہے/ نہ دار ہے، نہ مشقت/ پھر بھی ایک قید ہے... / جب ہم زمینوں کو پڑھنے نکلتے ہیں/ تو چرند، پرند کی ضرورت نہیں رہتی/ انسان کی پہلی آنول نال اذیت ہے/ کھیل تو کھلنڈرا ہی کھیلتا ہے [نثری نظم]

سارا کی فکریات اور اسلوبیات اسی کھلنڈرے پن سے عبارت ہے۔ اس کھلنڈرے پن نے نظم کے روایتی آہنگ سے اپنی برأت کا اعلان کر دیا ہے۔ ان کے معاصرین میں پروین شاکر اور ثروت حسین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پروین شاکر ایک سڑک حادثے کا شکار ہو گئی تھیں جبکہ ثروت حسین نے خودکشی کر لی تھی۔

شاعری کے غالب رجحان نے خواتین کی آواز کو نمایاں ہونے کا موقع بہت بعد میں دیا۔ ادب کی دنیا میں عورت کی خاموشی ساعت پر سب سے گراں گزرنے والی صداقت ہے۔ اس مابعد جدید عہد میں مرکز کی مرکزیت کو ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آج عورت کو مرکز میں لاکر اس کا مطالعہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔ جدید مطالعات میں تانیثی قرأت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سارا شگفتہ کی نظمیں تانیثی قرأت کو نہ صرف جواز عطا کرتی ہیں بلکہ اُس کی پرزور تائید بھی کرتی ہیں۔ ان کی غیر معمولی تخلیقی زبان تفصیلات، درجہ بندی، منطقی ربط اور زبان کے مرد اساس اقتداری حوالوں سے تقریباً آزاد ہے۔ ان کی نظمیں ایک مخصوص عورت کی زندگی کی تخلیقی روداد بیان کرتی ہیں۔ اس روداد کا یہ وصف ہمارے لیے باعث دلچسپی ہے کہ یہ روداد جنس کی بنیاد پر متعین کردہ صنف کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔

سارا شگفتہ کی موت کے بعد امرتا پریتم نے 'ایک تھی سارا' کے عنوان سے ان پر بھرپور کتاب تحریر کی تھی۔ بعد میں پنجابی سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں امرتا پریتم نے سارا کی زندگی کے حالات و واقعات کی کڑیوں کو جوڑتے ہوئے ان کی زندگی کا دلچسپ خاکہ مرتب کیا ہے۔ سارا، امرتا پریتم کو اکثر خطوط لکھا کرتی تھیں۔ امرتا پریتم کے کہنے پر انھوں نے اپنی درد بھری روداد قلم بند کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ جو کچھ لکھتیں امرتا پریتم کو بھیج دیتیں۔ سارا کی اچانک موت کے بعد انھوں نے ان خطوط کو یکجا کیا۔ ماضی کے جھروکوں سے رشتے کی تخلیقیت کو داد، دینے کے لیے انھوں نے 'ایک تھی سارا' کے عنوان سے ناقابل فراموش کتاب لکھ ڈالی۔ اس کتاب کے نصف حصے کو سارا کی خودنوشت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ سارے اعترافات اور حقائق خطوط سے حاصل کیے گئے ہیں۔ سارا سے ان کی ایک ملاقات تھی۔ اس ملاقات اور کچھ مخصوص افراد کی آرا سے اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے۔ سارا کے سوانح کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر حوالہ نہیں ہوسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ 'ذلتوں کے اسیر' سارا شگفتہ کی زندگی پر لکھا ہوا سوانحی قسم کا ناول ہے۔ اس کی اشاعت 1998 میں ہوئی۔ اس ناول میں سارا کی زندگی کو تخلیقی رنگ دیتے ہوئے اس عہد کے سماجی سروکار اور تہذیبی اقدار کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول نگار نے سارا کو علامت میں ڈھال کر عورت پر ہورہے ظلم و زیادتی کی روداد کو تخلیقی خراج پیش کیا ہے۔ 2007 میں صفیہ عباد نے 'ادیبوں میں خودکشی کے محرکات' کے عنوان سے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے مقالہ داخل کیا تھا۔ اس مقالے کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں سارا شگفتہ پر ایک ذیلی باب موجود ہے۔ اس باب میں سارا کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خودکشی کے محرکات پر منطقی انداز میں غور کرنے کے بعد نتائج نکالے گئے ہیں۔ نئی نسل کے سات پاکستانی شاعروں پر آصف فرخی نے An Evening of Caged Beasts کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں سارا شگفتہ بھی شامل ہیں۔ جرمن مصنفہ کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ لکھا ہے۔ انھوں نے اس تبصرے میں سارا کے کلام پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

قمر جمیل پہلے ناقد ہیں جنھوں نے سارا شگفتہ کے کمالات کا اعتراف کیا تھا۔ ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کا زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے خود بہت اچھی نثری نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اس صنف کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انھوں نے سارا کو داد سے نوازا ہے۔ انھوں نے ان کے بارے میں کسی فیشن میں کوئی بات نہیں کہی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تک نثری نظموں کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کیا جارہا تھا۔ جب صنف کی قبولیت ہی سب سے بڑا مسئلہ تھی تو شاعری کا اعتراف بھی آسان نہ تھا۔ ایسے میں انھوں نے سارا کے بارے میں کہا کہ ان کی شاعری کی رسائی ان حقیقتوں تک ہوتی ہے جہاں تک ہمارے نثری نظم لکھنے والوں کی رسائی کبھی نہیں ہوئی۔ ''وہ اعلیٰ ترین ذہنی اور شعری صلاحیتوں کی مالک ہے، انسانی نفس کے ادراک میں جو قدرت اسے حاصل ہے وہ ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں۔'' ('آنکھیں'، فلیپ کی رائے)۔ سارا کے کمالات کا اس قدر بھرپور اعتراف اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ سلیم احمد بھی سارا کی شاعری کو پسند کیا کرتے تھے لیکن تحریری اعتراف کا موقع کبھی نہیں آیا۔ قمر جمیل نے نئی نسل کے شعرا پر مضمون لکھا، اور سارا کی زندگی میں لکھا۔ اس مضمون میں سارا کا ذکر دیگر شعرا کے ساتھ ہوا ہے لیکن قمر جمیل نے سارا کو سرفہرست رکھا ہے۔

سارا کی شاعری پر مبارک احمد اور احمد ہمیش کی رائے 'آنکھیں' کے فلیپ پر ملتی ہے۔ مبارک احمد نے معاصرین میں سارا کو سرفہرست رکھتے ہوئے انھیں بطور 'سپر پوئٹس' اور 'کوئن آف پوئٹس' معجزہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری مغرب کی ارفع سطح کی شاعری سے کم نہیں۔ یہ شاعری مربوط نہیں لیکن اثر انگیزی میں اعلیٰ سطح کی مربوط شاعری کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ یہ شاعری غالب کے پوئٹک پیریڈز کو کراس کر کے نئی شعری روایت کو جنم دیتی ہے۔ احمد ہمیش اعتراف کرتے ہیں کہ اب تک دیانت داری کے ساتھ سارا کے مرتبے کا تعین نہیں کیا جاسکا ہے جبکہ 1984 تک گزشتہ تین دہائیوں میں خلق کی گئی نثری نظموں سے ان کی شاعری بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی ساخت بے مثل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''کم از کم برصغیر میں سارا شگفتہ کے سوا کوئی ایسی عورت نظر نہیں آتی، جس نے شعروادب کے میڈیم سے اس انتہا پر سچ بلکہ برہنہ سچ بولا ہو...... کہ اس سے اُس کی ذاتی دیومالا Self-Myth بن گئی ہو۔'' ('آنکھیں'، فلیپ کی رائے)

قاضی افضال حسین نے 'میں سچی ننگی بھلی' کے عنوان سے سارا شگفتہ پر باقاعدہ تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں جدید ادبی نظریات اور ان کے اطلاق کی روشنی میں سارا کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ پہلے انھوں نے تانیثی ڈسکورس قائم کیا ہے۔ پھر سارا کی شاعری کو اس کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں جدید تصور لسان کو مرکز عطا کر کے پہلی بار یہ احساس کرایا گیا ہے کہ سارا کی شاعری نئی لسانی تشکیلات کا مظہر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اردو میں سارا شگفتہ تنہا شاعرہ ہے جس نے ایک طرف تو زبان کو اس کی روایتی نحوی وصرفی پابندیوں سے آزاد کیا اور دوسری طرف زبان کے معنیاتی اقتداری نظام کو تہہ و بالا (Subvert) کیا۔ تخریب سے تعمیر کی طرف اس قدم میں پہلی منزل تو روایتی آہنگ سے آزادی ہے۔'' (تحریر اساس تنقید، ص: 165) یعنی سارا نے سب سے پہلے شاعری کے لیے یہ اصول قائم کیا کہ ''شاعری جھنکار نہیں جو تال پر ناچتی رہے۔'' اس نے ذات کے کھلنڈرے پن میں اپنا فن تلاش کیا۔ روایتی آہنگ سے نجات کے نتیجے میں لسانی شگفتگی کی عملی صورتیں نمودار ہوئیں۔ قاضی صاحب نے نئی لسانی تشکیلات کو موضوع بنایا اور اخیر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ ''معاصر تنقید کے پاس وہ معیار ہی نہیں جو سارا شگفتہ جیسی شاعرہ کے تعین قدر کی اہل ہو۔ حالانکہ مابعد جدید تناظر میں تانیثیت پر گفتگو سے رفتہ رفتہ یہ احساس عام ہونے لگا ہے کہ سارا شگفتہ نے اپنے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی تخلیقی زبان دریافت کرلی تھی جو تعقل، درجہ بندی اور زبان کے مردانہ اقتداری حوالوں سے تقریباً آزاد ہے۔'' (ایضاً، ص: 181) قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں جدید تصور لسان، مرد اساس لسانی نظام اور تانیثی ڈسکورس کے ضمن میں انتہائی اہم سوالات اٹھائے ہیں لیکن ایک مضمون میں ان سوالات پر سیر حاصل گفتگو ممکن نہیں۔

■

Tarannum Jabeen
123, Shipra Hostel, JNU
New Delhi - 110067 Mob.:9870522513
Email: tarannumjnu123@gmail.com

سعد بن ضیاء

پرندوں کی تعداد پر مادّی ترقی کے منفی اثرات

بلاشبہ انسان نے آج مادی طور پر بے تحاشہ ترقی کر لی ہے۔ بر و بحر کی عمیق گہرائیوں سے وہ نایاب خزانوں کو دریافت کر لیے ہیں جن کا تصور ناممکن ہے۔ خلا و سماء میں موجود اجرامِ فلکی کو تسخیر کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قوتیں صرف کر رہا ہے۔ یہ سب مادی ترقی کے ہی ثمرات ہیں کہ آج ہمیں زندگی بسر کرنے کی آسائشیں میسر ہیں۔ مگر اس مادی ترقی کا منفی پہلو یہ بھی ہے کہ انسانی اقدار پامال ہو رہے ہیں اور انسان نفسی نفسی تک ہی محدود ہو گیا ہے۔ اُسے اپنی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے سارے رشتے داؤں پر لگانے کے لیے تیار ہے۔ اُسے اپنے ماحول کی ذرہ برابر بھی فکر نہیں۔ وہ ماحول کو آلودہ کرنے کی نت نئی ترکیبیں ایجاد کر رہا ہے جس سے اس کرۂ ارض پر بسنے والے چرند، پرند، حیوانات اور نباتات بُری طرح متاثر ہو رہے ہیں اور اُن کی تعداد میں مسلسل تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ بلکہ بعض تو صفحۂ ہستی سے ہی مٹ گئے ہیں۔

خالق کائنات کی بے شمار مخلوقات میں سے ایک نہایت ہی دلکش مخلوق پرندے ہیں۔ پرندوں کا نام آتے ہی ذہن میں ایسی دیدہ زیب مخلوق کی شکل اُبھر آتی ہے جو نہ صرف یہ کہ ہماری آنکھوں کی راحت کا سامان ہوتی ہے بلکہ ہمارے ماحول کو بھی صاف ستھرا اور صحت مند رکھنے میں بھی معاون و مددگار ہوتی ہیں۔ قدرت نے نہ جانے کتنے ہی انواع و اقسام کے پرندوں کو پیدا کیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں تقریباً 200 سے 400 بلین پرندے پائے جاتے ہیں۔ مگر افسوس صد افسوس کہ انسان کی خود غرضانہ مادی ترقی کے سبب پرندوں کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اسی رفتار سے پرندوں کی تعداد میں کمی آتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب پرندے اس دنیا سے ختم ہی ہو جائیں۔ 15 ویں صدی عیسوی سے اب تک پرندوں کی تقریباً 500 اقسام فنا ہو چکی ہیں جبکہ تعداد میں 25-20 فی صد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ انسانوں کے ذریعہ اپنے مادی فائدے کے لیے پیڑوں کی بے دھڑک کٹائی، جنگلات کی کٹائی، آبی آلودگی، ماحولیاتی آلودگی، پراگندہ پانی، ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے پرندے اپنا قدرتی مسکن کھو رہے ہیں نتیجتاً اُن کی تعداد میں بہت تیزی سے گراوٹ آ رہی ہے۔ اب تک پرندوں کی 129 اقسام فنا ہو چکی ہیں۔ Bird Life International کی ایک رپورٹ کے مطابق گزشتہ دو صدیوں میں انسان کی مادی کارستانیوں کے سبب پرندوں کی 100 اقسام فنا ہو چکی ہیں۔ جبکہ مزید 1200 گویا کہ زمین پر بسنے والے 12-10 فیصد پرندے بہت جلد فنا ہونے کی کگار پر کھڑے ہیں۔

شمالی امریکہ میں چالیس برس قبل کوئی ساڑھے گیارہ بلین پرندے ہوا کرتے تھے جو اب گھٹ کر محض دس بلین رہ گئے ہیں۔ ماہرین کے مطابق امریکہ میں پائی جانے والی پرندوں کی ساڑھے چار سو اقسام میں سے 86 اقسام پر خطرے کی گھنٹی ہے۔ Environment and Climate Change کے جائزے کے مطابق 1970 سے 2014 تک کے عرصے میں بعض پرندوں جیسے Sprague's pipit، Bobolink, The Oak Titmouse, اور اُلو کی آبادی میں عالمی سطح پر تقریباً 64 فی صد تک کمی آئی ہے۔ Chimney swifts، گوریا، اور چھوٹے اُلو کی تعداد تقریباً آدھی ہو گئی ہے۔ امریکہ اور

کناڈا میں بجلی کے تاروں، عمارتوں اور گاڑیوں سے ٹکرانے کے نتیجے میں ہر سال تقریباً 900 پرندے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ محض مادی ترقی پرندوں کے قدرتی مسکن پر قبضہ، ماحولیاتی تبدیلی، پرندوں کا شکار، کان کنی، گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں، سمندروں میں Toxic Industrail, Oil Spills Wastes وغیرہ نے پرندوں کی تعداد پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ یورپ میں انسان کی مادی ترقی کا سب سے زیادہ اثر Bustard پرندے پر پڑا ہے۔ اس خوبصورت پرندے کی گھٹتی آبادی پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے 18 ویں صدی میں Oliver Goldsmith نے لکھا تھا:

''آج یہ پرندہ یعنی Bustard جتنی پائی جاتی ہے اُس سے کہیں زیادہ اس قبل پائی جاتی تھی۔ لیکن حال میں بڑھتی زراعت، اور اس کے ذائقے دار گوشت کے سبب اس کا بے دھڑک شکار کی وجہ سے Bustard چڑیا کی تعداد میں بے تحاشہ کمی واقع ہوئی ہے۔ اور آنے والے وقت میں جب یہ معدوم ہو جائے گی تو ہمیں تعجب ہوگا کہ اتنا قد آور پرندہ ہمارے بیچ تھا'' اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ 19 صدی آتے آتے Oliver Goldsmith کی پیشین گوئی واقعی سچ ثابت ہوئی اور Bustard پرندہ اس کرۂ ارض سے فنا ہو گیا۔

بارن اُلو ایک ایسا پرندہ ہے جو کہ زراعت میں مفید ہے۔ کیوں کہ اس کی خوراک کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں

لہٰذا یہ فصلوں کو کیڑا لگنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح مہنگی جراثیم کُش ادویہ سے بچا جا سکتا ہے اور یہ ماحولیات دوست طرزِ عمل بھی ہے۔ کرۂ ارض کے وہ خطے جہاں انسان کی مادّی ترقی اپنے عروج و شباب پر ہے یعنی شمالی امریکہ، برطانیہ، کناڈا اور دیگر ممالک میں مطالعات سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں بارن اُلوؤں کی تعداد میں اچھی خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کی اصل وجہ ترقی کے نام پر زرعی زمینوں پر تعمیرات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ ان تعمیرات کی وجہ سے بارن اُلوؤں کا قدرتی مسکن ختم ہو گیا۔ جس کے سبب اُن کو آپس میں جنسی تعلق پیدا کرنے کے مواقع نہیں مل سکے لہٰذا بارن اُلوؤں کی تعداد میں بتدریج کمی واقع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ فصلوں اور کھیتوں میں بارن اُلو مستی سے گھومتے پھرتے ہیں اور لکڑی کے بنے خاص ڈبوں میں جنسی عمل کر کے اپنی نسل کی افزائش کرتے ہیں۔ مگر آج کے اس ترقی یافتہ دور میں انسان نے لکڑی کے ڈبوں کی جگہ اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے دربے خانے رکھ دیے ہیں۔ اور بدقسمتی سے بارن اُلوؤں کو اسٹیل کے ان چھوٹے دربہ خانوں میں جنسی عمل کر کے اپنی نسل کو آگے بڑھانا کافی دشوار ہو رہا ہے۔ امریکی ریاست فلوریڈا میں کھیتوں میں آبکاری کے لیے پمپ ہاؤس ہوا کرتے تھے جہاں بارن اُلو رہتے تھے اور افزائش نسل کرتے تھے۔ مگر آج کے اس تکنیکی دور میں آبکاری خودکار ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے پمپ ہاؤس ختم ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی بارن اُلوؤں کا محفوظ مسکن بھی ختم ہو گیا ہے۔ اس ٹکنالوجکل ترقی نے بے شک انسان کو بہت راحت پہنچائی ہے مگر دوسری جانب بارن اُلوؤں کی تعداد پر منفی اثرات بھی مرتّب کیے ہیں۔

2016 میں شائع ہوئی ایک رپورٹ کے مطابق 1966 سے اب تک پرندوں کی تعداد میں خطرناک گراوٹ آئی ہے۔ 2015 میں International Union for Conservation of Nature (IUCN) نے ایک لال فہرست جاری کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ 2014 میں 173 پرندوں کی اقسام پر خطرہ تھا اور 2015 میں اس میں اضافہ ہو کر یہ اب 180 تک پہنچ گئی ہے۔ دراصل مادی ترقی کی وجہ سے فطرت میں انسانی دخل اندازی کے سبب پرندوں کو مختلف النوع پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جن مسائل سے پرندے دوچار ہیں اُن میں سب سے اہم مسئلہ پرندوں کے قدرتی مسکن کا بہت تیزی سے ختم ہونا، ماحولیاتی آلودگی، چراگاہوں اور آبی ذرائع کا ختم ہونا، جنگلات کو کاٹ کر تعمیرات کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ مثلاً Red Knot پرندہ جو کہ بالعموم ساحلی علاقوں اور ریگستانی بیچوں میں پایا جاتا ہے اُس کو ساحلی اکوسسٹم کے خراب ہونے سے اور اراضی بحالی ہونے کی وجہ سے جینا دشوار ہو گیا ہے۔ آبی ذرائع میں خرابی پیدا ہوتی جا رہی اور وہ Great Knot کی بقاء کے لیے دن بہ دن ناموزوں ہوتے جا رہے ہیں۔ Curlew Sandpiper پرندہ بھی زندہ رہنے کی تگ و دو میں ہے کیوں کہ اس کے قدرتی مسکن کو نمک بنانے والی کمپنیاں اپنے مفاد کے لیے برباد کر رہی ہیں جس کے نتیجہ میں بارش کا اوسط گرتا جا رہا ہے۔

سائنس کو نہ صرف انسان بلکہ اس زمین پر بسنے والی ہر مخلوق کی حیات کی بقا و تحفظ کا ضامن تصور کیا جاتا ہے۔ یقیناً انسان نے سائنسی بنیادوں پر آج ایسی ایسی دوائیں بنالی ہیں جن سے مہلک سے مہلک تر امراض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر مقامِ افسوس ہے کہ اس نوبل کاز میں بھی انسان کی مادّی جبلّت غالب ہے۔ اور اُس نے فلاح کے پہلو کو پس پُشت ڈال کر اپنے مادّی مفاد کو فوقیت دی۔ نتیجتاً ایسی اینٹی بایوٹک وجود میں آ رہی ہیں جن سے نفع کم اور نقصانات زیادہ ہو رہے ہیں۔ اسی طرح کی اینٹی ان فلیمٹری دوا Diclofenac ہے جس کا استعمال نہ صرف انسانوں میں بلکہ پرندوں میں بھی درد کے علاج کے لیے ہوتا ہے۔ یونائٹڈ کنگڈم کی تنظیم رائل سوسائٹی فار پروٹکشن آف برڈز، ممبئی میں واقع بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی، اور صوبہ اُتر پردیش میں واقع انڈین ویٹرنری انسٹی ٹیوٹ کے مشترکہ مطالعہ میں اس امر کا انکشاف ہوا کہ دراصل Steppe چیل کی تعداد میں کمی کی بہت اہم وجہ ویٹرنری Diclofenac دوا کا بے دریغ استعمال ہے۔ North American Bird Conservation Initiative کے سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے 2014 میں 33 اقسام کے پرندوں کی نشاندہی کی تھی جن کی تعداد بہت تیز رفتار سے تنزل پذیر ہے۔ Costa Rica, Carribea اور میکسکو میں جنگلات کی بے تحاشہ کٹائی کی وجہ سے کیڑے کھانے والی چھوٹی چڑیا، پیلے گلے والی چھوٹی مہاجر چڑیا، میٹھی اور سریلی آواز والی چھوٹی کالی سفید چڑیا، ٹوپی دار چڑیا تو جناب صفحۂ ہستی سے بالکل مٹ گئی ہیں۔ مادّی ترقی پرندوں کے لیے موسمِ سرما گزارنے، افزائش نسل کے عمل کے دوران، ہجرت کے دوران، اور چارے کی تلاش اور چارہ چگنے کے دوران پریشانیاں پیدا کرنے کا اہم سبب ہے۔

برطانوی تنظیم Royal Society for Preservation of Birds نے گوریا کی نشاندہی کی ہے کہ اگر فوری طور پر اقدامات نہیں کیے گئے تو گوریا تو بس ختم ہی ہے۔ ہماری آئندہ آنے والی نسل تو گوریا کے دیدار سے بالکل محروم ہو جائے گی۔ شمالی امریکہ میں پرندوں کے تحفظ کے لیے کام کر رہے ادارہ The Institute for Bird Populations 150 پرندوں کے متعلق مختلف اعداد و شمار فراہم کیے ہیں اور پرندوں کی تعداد میں تغیرات پر مسلسل نظر رکھتا ہے۔ Mel White نے National Geographic Channel کے لیے جون 2013 میں تحریر کردہ ایک مضمون میں پرندوں کی کم ہوتی تعداد کی چار اہم وجوہات بیان کی تھیں جن میں گلوبل وارمنگ، قدرتی مسکن کا ختم ہونا، ہوائی ٹربائن اور بلّیاں شامل ہیں۔ دراصل ہوائی ٹربائن کے بہت بڑے بڑے بلیڈس ایک طرح سے دودھاری تلوار کا کام کرتے ہیں۔

مادّی ترقی کا بہت ہی شاندار مظہر اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ مگر یہ عمارتیں جہاں ہمیں محفوظ مسکن عطا کرتی ہیں وہیں پرندوں کے لیے موت کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ امریکی فش اور وائلڈ لائف سروے کے مطابق عمارتوں میں موجود کھڑکیوں سے ٹکرانے کے سبب ہر سال تقریباً 1000 ملین پرندے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ مواصلات اور ٹیلی مواصلات میں Communication Towers کا کلیدی رول ہے۔ جہاں یہ ہمارے لیے پیغام رسانی میں مدد کرتے ہیں وہیں پرندوں کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ Communication Towers سے ٹکرانے کی وجہ سے کوئی 500 ملین پرندے مرتے ہیں جبکہ High Tension Lines کے قریب اُڑنے سے ہر سال 180 ملین پرندے مر جاتے ہیں۔ کار کی زد میں آنے سے ہر سال 60 ملین پرندے مرتے ہیں۔ جراثیم کُش دواؤں میں مہلک اشیاء سے ہر سال 75 ملین پرندے مر جاتے ہیں۔ سمندروں میں تیل کے رساؤ سے ہر سال سیکڑوں ہزاروں پرندے مرتے ہیں۔

مادّی ترقی کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ مگر اس کے قطعاً یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دوسری مخلوقات کو مصیبت میں ڈال دیں۔ ہماری خودغرضانہ مادّی ترقی پرندوں کے لیے آفتِ جاں نہ بن جائے۔ ہم خود اپنی زندگی کی آسائشوں کے حصول کے لیے پرندوں کی زندگیوں کو داؤں پر نہ لگائیں۔ آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ آج سے بلکہ ابھی سے ہم پرندوں کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہم ہر وہ قدم اُٹھائیں گے جو پرندوں کے حق میں بہتر ہو۔

■

Dr. Saad Bin Zia
Hamdard Nagar 'B' Jamalpur
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:8860612267
Email: drsaadbinzia@gmail.com

محمد نذرالہدیٰ

غیر منظم خوردہ فروش ادارے میں مسلمان خواتین کے مسائل

خوردہ فروش لفظ فرنچ زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ جو انگریزی زبان کے Retail لفظ کا مترادف ہے۔ یہ Retail لفظ فرنچ زبان Retailier سے ماخوذ ہے۔ جس کے لغوی معنیٰ چھوٹے ٹکڑے کرنا یا تھوک کو توڑنا ہے۔ اس طرح سے غیر منظم خوردہ فروش ایسا ادارہ ہے جو بغیر کسی قواعد وضوابط کے یا بغیر اصول کے خوردہ فروش کے کام کو انجام دیتا ہے۔ یوں تو یہ ادارہ ملک کے لیے بہت اہم ہے اور ملک کی معیشت میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس ادارہ کی کوئی مختص شکل نہیں ہوتی ہے۔ اس میں کام کرنے والوں، کی ملازمت غیر متعین اور جزوی ہوتی ہے۔ ان کی تنخواہ وغیرہ کے لیے کوئی خاص قاعدہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ ادارہ عام طور پر اشیا کی پیداوار اور خدمات کی نمائندگی کرتا ہے۔ مرکزی شماریات تنظیم کے مطابق سبھی بغیر کارپوریٹ ادیموں اور گھریلو صنعتوں (منظم کے علاوہ) جو قانون کے ذریعہ عام طور پر عمل نہیں کرتے اور نہ ہی سالانہ اکاؤنٹس یا بیلنس شیٹ کو برقرار رکھنے کے لیے اسے ایک ترتیب سے تشکیل دیتے ہیں۔ وہ سب غیر منظم خوردہ فروش ادارے کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ روزگار تربیت کے ناظم اعلیٰ کے مطابق بے ترتیب لازمی رجسٹریشن کے، مزدوری معیار کے قواعد وضوابط کے بغیر ادارہ کی شناخت غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کی جاتی ہے۔ اس ادارہ کی درجہ بندی آجر، از خود روزگار اور مزدوروں کی اجرت کے نکات سے کی گئی ہے۔ اس مضمون میں ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ٹھیلا پر سبزی بیچنے والی مسلمان خاتون، کرانہ دکان چلانے والی خاتون، گھریلو خادمائیں وغیرہ کے مسائل اس زمرے میں آتے ہیں۔

حکومت ہند کی وزارت مزدور کی جانب سے اس ادارہ کی افرادی قوت کی درجہ بندی میں ملازمت، روزگار کی نوعیت، خاص طور پر پریشان زمرہ وخط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والی خواتین وخدمات کے زمرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کے لیے قومی کمیشن کی ذیلی کمیٹی کے تازہ تخمینہ کے مطابق GDP کی شراکت تقریباً 50 فیصد ہے۔ اس میں افرادی قوت کا قومی پیمانہ پر غیر رسمی کارکن کا قبضہ کم وبیش 90 فیصد ہے۔

بین الاقوامی مزدور تنظیم کے اعداد وشمار کے مطابق 1995 سے 2000 کے درمیان خواتین کی شراکت میں صنفی فرق 3.5 فیصد اور صنفی تنخواہ میں بھی فرق پایا گیا ہے۔ اس ادارہ میں مسلمان خواتین کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خواتین کو کام کی جگہ پر استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاندانی ذمہ داری کا بھی بوجھ ہوتا ہے۔ عرصہ دراز سے غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین ہندوستان میں محرومیت کی شکار ہیں۔ بجٹ میں ان کا حصہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ اقتدار کی ہر سطح پر ان کے ساتھ امتیازی سلوک جاری ہے۔ معاشرے میں مسلمان خواتین کی زندگی کے تمام پہلوؤں، آمدنی، ملازمت، تحفظ، نکاح کے قواعد، طلاق کا حق، نان ونفقہ وغیرہ سماجی مسائل بن گئے ہیں۔ مارتھا چین کے مطابق اس ادارہ میں خواتین کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ خواتین خام مال سے مال تیار کرتی ہیں اور کچھ فروخت بھی کرتی ہیں۔ وہ سب زری کا کام، سر کے بال کا چٹا تیار کرنا، کپڑے بنا، دھوپ سے بچنے کے لیے چھاتا بنانا، چھڑی جیسا رولر بنانا، سگریٹ رولر بنانا، کاغذات رکھنے کے لیے بیگ بنانا، کھانا پکانا وغیرہ جیسے کام کرتی ہیں۔ یہ خواتین اقتصادی طور پر بہت کمزور ہوتی ہیں۔ اس بات کو سچر کمیٹی نے بھی تسلیم کیا ہے اور اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان خواتین کی زیادہ تعداد ناخواندہ

ہونے کی وجہ سے ترقی کی راہ میں کافی پیچھے ہے۔

سیما قاضی Minorities Rights Group International کے حوالے سے کہتی ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے 65 سال گزرنے کے باوجود غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین کے مسائل یکساں ہیں۔ اس ملک میں مسلمان خواتین سب سے بڑی اقلیت میں رہنے کے باوجود سماجی و اقتصادی مسائل میں مبتلا ہیں۔

مختلف تحقیقات کے ذریعہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس ادارے میں کام کرنے کی نوعیت میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی ہے۔ ان میں خواتین کے مسائل آج بھی برقرار ہیں۔ اے سوراتی نے ٹیکسٹائل صنعت میں کام کرنے والی خواتین کی بہبود، سہولیات، طبّی مسائل، فیصلہ سازی میں خواتین کی حصہ داری، ذہنی ہراسانی وغیرہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ خواتین گھر سے سیدھا نکل کر کمانے کی غرض سے صنعت یا فیکٹری میں جاتی ہیں۔ یہ خواتین اپنے خاندان کے لیے واحد کمائی کا سہارا ہیں۔ خاص طور سے بے روزگار شوہروں کے لیے۔ ان میں سے زیادہ تر خواتین گھر کے مسائل سے دو چار ہیں اور کچھ خواتین انفرادی و سماجی مسائل سے دو چار ہیں۔ زیادہ تر خواتین کو صحت مند پایا گیا۔ ان میں سے کچھ سانس، بینائی، بہرا پن، بلڈ پریشر، کھانسی اور جوڑوں کے درد جیسے مسئلے سے پریشان ہیں۔

جی شری کانت کے مطابق سبزی فروش خواتین کو سماجی و معاشی حیثیت سے کم تر ہونے کی وجہ سے مختلف مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً سبزی فروخت

مختلف تحقیقات کے ذریعہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس ادارے میں کام کرنے کی نوعیت میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی ہے۔ ان میں خواتین کے مسائل آج بھی برقرار ہیں۔ اے سوراتی نے ٹیکسٹائل صنعت میں کام کرنے والی خواتین کی بہبود، سہولیات، طبّی مسائل، فیصلہ سازی میں خواتین کی حصہ داری، ذہنی ہراسانی وغیرہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ خواتین گھر سے سیدھا نکل کر کمانے کی غرض سے صنعت یا فیکٹری میں جاتی ہیں۔ یہ خواتین اپنے خاندان کے لیے واحد کمائی کا سہارا ہیں۔

کرنے والی خواتین کو پولیس یا قانونی حکام ان کے کام کرنے میں رخنہ ڈالتے ہیں۔

ابوصالح شریف اور مہتاب الاعظم نے بتایا کہ ہندوستان کے سارے مذاہب کی خواتین کی معاشی میدان میں نمائندگی مردوں کے مقابلے میں کم ہے۔ لیکن مسلمانوں میں یہ فرق دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کے شمال اور مشرقی حصے میں مسلمان خواتین کی صورتحال دیگر حصوں سے بدتر ہے۔

آمنہ تحسین نے اپنی کتاب 'مطالعات نسواں' کے حوالے سے عورتوں کے ساتھ حقوق کی پامالی، استحصال، انسانیت سوز رسم و رواج، جہیز، غربت اور جہالت پر کھلے الفاظ میں بحث کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے خواتین کی تاریخی، تہذیبی و سماجی حیثیت کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عورتوں کے ساتھ ہر سطح پر عدم مساوات و صنفی تفریق قائم رکھا گیا ہے۔ نتیجتاً خواتین اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہو کر مظلوم و کمتر طبقہ بن کر رہ گئی ہیں۔ عورتوں کو گھریلو فرائض تک محدود رکھا جاتا ہے۔ دن رات اسے ہراساں کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں خواتین کے ماضی و حال کے اقتصادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔

ممتاز فاطمہ نے اپنے مضمون 'غریب گھریلو خادمائیں اور ان کے مسائل' کے حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں آج بھی غریبی، جہالت اور بے روزگاری پائی جاتی ہے۔ ملک کی آبادی کا بڑا حصہ غربت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی غذائی ضروریات کی تکمیل بھی نہیں کر سکتے۔ اس پس منظر میں خواتین کے مسائل کا جائزہ لیا جائے تو یہ مردوں کے مقابلہ میں کم تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ غریبی اور بے روزگاری کا گراف مردوں کے مقابلہ میں ان میں زیادہ ہوتا ہے۔ چوں کہ اکثر خواتین کم تعلیم یافتہ ہوتی ہیں اور بہتر ہنر سے کم ہی واقف ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں گھریلو مسائل کو کم کرنے اور دو وقت کی روٹی کا انتظام کرنے کے لیے خواتین گھریلو خادماؤں کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ خواتین کی بڑی تعداد غیر منظم ادارہ میں کام کرتی ہیں۔ غیر منظم ادارہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہم ان مزدوروں میں سب سے آخری درجہ پر گھریلو خادماؤں کو پائیں گے۔ انھیں زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ خواتین ایک طرف بھوک، افلاس اور بے روزگاری سے پریشان ہیں تو دوسری طرف آجرین کے ہاتھوں ہراسانی اور استحصال کا شکار ہیں۔ سماج میں ان کی عزت نہیں ہوتی، انھیں نوکرانی کہا جاتا ہے۔ انھیں عام مزدوروں کی طرح کوئی رعایتیں نہیں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ سماج میں انھیں بہت ہی چھوٹے درجے کا تصور کیا جاتا ہے۔ شہری ترقی کی وجہ سے خواتین گزشتہ دو دہوں سے ملازمت کرتی ہیں۔ اور باقی خواتین اپنے گھریلو کاموں کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ملازمائیں رکھتی ہیں۔ یہ خواتین جنھیں عام فہم زبان میں نوکرانی کہا جاتا ہے۔ گھریلو کام جیسا کہ جھاڑو پوچھا لگانا، برتنوں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی، پکوان اور مالکوں کے بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ خواتین اپنا زیادہ تر وقت آجرین کے گھروں میں گزارتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے مسائل ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور ان کے حقوق کی بات ہم شاید ہی کرتے ہیں۔

جہاں ملازمائیں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں، انھیں بہت کم اجرت پر کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر اجرت بڑھانے کے لیے اصرار کرتی ہیں تو انھیں نوکری سے ہاتھ دھونے کا خطرہ رہتا ہے۔ کیوں کہ کم اجرت پر کام کرنے والی کئی خادمائیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ وہ اسی پر اکتفا کرتی ہیں۔ بعض لوگ گھریلو خادماؤں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں، انھیں گھر کا بیت الخلا استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ وہ روزمرہ میں استعمال کیے جانے والے برتنوں میں کھا نہیں سکتی ہیں اور انھیں اقل ترین اجرت تک نہیں دی جاتی ہے۔ اتفاقاً

اگر وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جاتی ہیں تو کسی طرح کی کوئی مالی و طبی امداد نہیں دی جاتی ہے۔ علاج و معالجات کے اخراجات وہ خود ہی برداشت کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ خواتین شہر کے پچھڑے ہوئے علاقوں میں رہتی ہیں۔ جہاں سے کام کے مقام تک پہنچنے میں کافی وقت، رقم و توانائی صرف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا گھر میں فرصت کے لمحات گزارنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ اگر خادمائیں حاملہ ہوں یا ان کے کم عمر بچے ہوں تو ان کی مصیبتیں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ کام کے مقام پر ان کے بچوں کی دیکھ بھال کی کوئی سہولت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا شدید مجبوری کے سبب وہ کام پر نہیں جا سکتی ہیں۔ مہینہ میں ایک بھی چھٹی نہیں ملتی ہے۔ اگر طبی مسائل کی بنا پر ایک یا دو دن کی چھٹی لی جائے تو تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے۔ جبکہ ہفتہ میں چھٹی ان کا حق ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ عیدین کے موقع پر بھی انھیں کام پر بلاتے ہیں۔ آجرین کو سوچنا چاہیے کہ ان خواتین کا بھی گھر ہے جہاں انھیں عید کی تیاری کرنی ہوتی ہے۔ لیکن عید کے دن انھیں کام میں مصروف رکھ کر انھیں عید کی خوشیوں سے محروم رکھنا انسانی ہمدردی اور حقوق کے خلاف ہے۔ ہر انسان چاہے وہ کسی عمر کا بھی ہو کسی نہ کسی مرض کا شکار ہو سکتا ہے یا بیمار پڑ سکتا ہے۔ اسی طرح گھروں میں کام کرنے والی خواتین بھی انسان ہیں۔ انھیں بھی کوئی بیماری لاحق ہو سکتی ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ہمیں دوسرے انسان کا دکھ سمجھنا چاہیے، نہ کہ ان کی مشکلات میں مزید اضافہ کریں۔ جو خواتین ناخواندہ ہوتی ہیں اور دوسرے کام کا تجربہ نہ رکھتی ہوں تو ان کے لیے سب سے مناسب کام یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی گھر میں بہ حیثیت گھریلو ملازمہ کام کریں۔ غیر ہنر مند اور نا تجربہ کار ہونے کی وجہ سے آجروں کے استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔

منظم خوردہ فروش ادارہ کی بہ نسبت غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والے کارکنان کی حیثیت کمتر ہوتی ہے۔ مسلمان خواتین کی حالت صنفی امتیازات و ناخواندگی کے سبب مرد کارکنان سے بھی کمتر ہوتی ہے۔ ان کے تعلیمی فقدان کی وجہ سے بیداری نہ ہونے پر از خود خواتین حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں سے استفادہ نہیں کرسکتی ہیں۔ زمانہ کے لحاظ سے ان کی پریشانی ختم تو نہیں ہو رہی ہے۔ مگر ان کے مسائل کی نوعیت میں تبدیلی ضرور ہو رہی ہے۔ ان اداروں میں خواتین کے کچھ مسائل یکساں ہیں تو کچھ مسائل کام، زبان، علاقہ، مذہب وغیرہ کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ آج کے جدید دور میں سائنس و ٹکنالوجی کے باوجود ان خواتین میں تبدیلی لانا اتنا آسان نہیں ہے خاص کر کے مسلمان عورت میں۔

غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین کے مسائل کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو ہر ادارہ میں ان کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کچھ ایسے مسائل ہیں جو ہر ادارہ کے لیے مساوی ہیں۔ اس ادارہ میں ناخواندہ مسلمان خواتین کی تعداد سب سے زیادہ اور تکنیکی ہنر سب سے کم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناخواندگی کی وجہ سے بیداری میں کمی ہے اور خواتین کے کام کرنے کا طریقہ تقریباً آج بھی روایتی ہے۔ اس میں نوجوان خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کام میں جسمانی طاقت کی بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں عمر دراز خواتین کے کام کا تناسب سب سے کم ہے۔ یعنی عمر رسیدہ خواتین کام کے بوجھ کو زیادہ برداشت نہیں کرسکتی ہیں۔ اس میں کام کرنے والی خواتین کی حیثیت مختلف پائی گئی ہے۔ کچھ خواتین مزدور کی حیثیت سے، کچھ سپروائزر کی حیثیت سے اور کچھ دیگر حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مزدور خواتین کی حیثیت سب سے کمتر مانی جاتی ہے۔ ان کو جسمانی محنت زیادہ کرنی ہوتی ہے اور تنخواہ کا تناسب دوسرے عہدوں کے مقابلہ میں سب سے کم ہوتا ہے۔ ان کے خاندان کا رویہ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواتین کے حق میں اخلاقی حمایت سب سے کم ہے۔ اکثر کام کرنے والی خواتین گھر کے افراد کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ پاتی ہیں اور دوہری ذمہ داری نبھانے میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرتی ہیں۔ کام کی جگہ پر مشکلات کا سامنا کم آمدنی کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ معاشی حالت خستہ ہونے کی وجہ سے کام کی جگہ پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا مجبوری بن جاتا ہے۔ زیادہ تر خواتین کو تنخواہ سے متعلق پریشانی بھی درپیش ہے۔ ان میں سے کسی کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی، تو کسی کی تنخواہ میں سے زیادہ کٹوتی کی جاتی ہے۔ کسی کو بالکل نہیں ملتی تو کسی کے تھوڑے پیسے کم کر دیے جاتے ہیں۔

منظم خوردہ فروش ادارہ کی بہ نسبت غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والے کارکنان کی حیثیت کمتر ہوتی ہے۔ مسلمان خواتین کی حالت صنفی امتیازات و ناخواندگی کے سبب مرد کارکنان سے بھی کمتر ہوتی ہے۔ ان کے تعلیمی فقدان کی وجہ سے بیداری نہ ہونے پر از خود خواتین حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں سے استفادہ نہیں کرسکتی ہیں۔

اس ادارہ میں کام کرنے والی خواتین کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہے۔ حکومت کے ذریعہ بنائے گئے قوانین، پالیسیاں و پروگرام وغیرہ کے بارے میں ان خواتین میں بیداری نہیں ہے۔ جس کی کئی وجوہات ہیں۔ اس میں سے اصل وجہ تعلیمی فقدان ہے۔ ان کے لیے نہ تعلیم گاہ اور نہ ہی تربیت گاہ موجود ہے۔ مطالعہ کرنے پر یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہے کیوں کہ ان میں تعلیم و ہنر کا فقدان ہے۔ جس کے سبب ان کی افرادی قوت کی شراکت زیادہ ہے اور آمدنی بہت کم ہے۔

سفارشات :

غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والی خواتین خاص طور پر مسلمان خواتین کی زندگی بہتر ہو سکے اور ہراسانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اس کے لیے کچھ سفارشات کو ذیل میں پیش کیا گیا ہے:

- غیر منظم خوردہ فروش ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین کے لیے ناخواندگی یا تعلیمی فقدان کو دور کرنے کے لیے حکومت کو جز وقتی تعلیمی سہولیات مہیا کروانا چاہیے۔
- ہر بلدیہ میں حکومت کی جانب سے ایک خواتین سیل قائم کیا جانا چاہیے۔ جس میں مسلمان خواتین کی بھی شراکت ہو تاکہ اس ادارہ میں کام کرنے والی مسلمان خواتین کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔
- ہر وارڈ میں ایک کاؤنسلنگ مرکز ہونا چاہیے تاکہ ان خواتین کو درپیش معاشی و دیگر پریشانیوں کا حل آسانی سے نکالا جا سکے۔
- ہر وارڈ میں خواتین کے لیے کم از کم ایک طبی مرکز قائم کیا جانا چاہیے۔ جس میں مسلمان خواتین ڈاکٹر کی بھی شراکت ہو۔ جس سے اس ادارہ میں کام کرنے والی خواتین کی صحت کی حفاظت ہو سکے۔
- سماجی نظام و صنفی مساوات کو برقرار رکھنے کے لیے خواتین و حضرات کے لیے انسانی حقوق کے تعلق سے بیداری پروگرام چلانا چاہیے۔

■

Mohammad Nazrul Hoda
Ph.D Research Scholar
Department of Social Exclusion and Inclusive Policy,
Maulana Azad National Urdu University,
Hyderabad - 500032.
Contact: +91-8143432087/9494002442

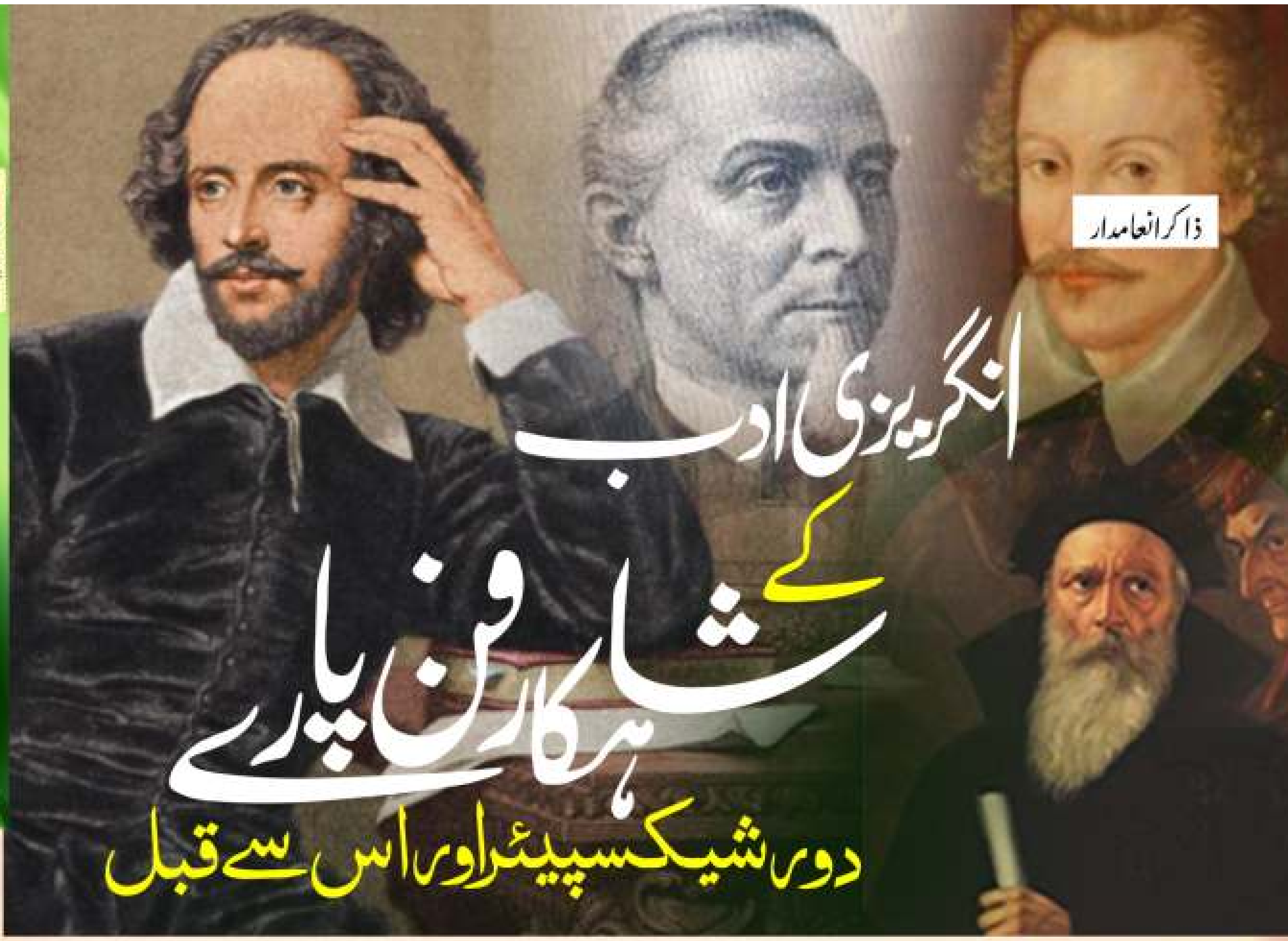

ڈاکٹر انعامدار

انگریزی ادب کے شاہکار فن پارے

دورِ شیکسپیئر اور اس سے قبل

انگریزی ادب کا شمار دنیا کے قدیم ادبی ذخیروں میں ہوتا ہے۔ انگریزی انگلستان کے عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور میں ایک جرمن قبیلے 'اینجلس' کی زبان کے طور پر سامنے آئی جو پانچویں صدی عیسوی میں جرمنی سے نقل مکانی کر کے انگلستان کے کسی علاقے میں آباد ہوا تھا۔ انگلینڈ کی دفتری اور سرکاری زبان کے طور پر اس کا ارتقا ہوا اور جب سترہویں صدی سے بیسوی صدی کے وسط کے دوران کرۂ ارض کا ایک بڑا علاقہ برطانوی سامراج کے زیرنگیں آگیا تو یہ زبان بھی دنیا کے ایک بڑے حصے تک پھیل گئی۔ اقوام متحدہ کی چھ دفتری زبانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ باقی پانچ زبانیں عربی، چینی، فرانسیسی، روسی اور اسپینی ہیں۔ انگریزی رابطہ عامہ کی زبان ہے۔ چودھویں صدی عیسوی سے انگریزی ادب میں اہم تخلیقات کے نمونے ملتے ہیں۔ ملکہ الزبیتھ اول کا دور انگریزی ادب کا دور زریں سمجھا جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم انگریزی ادب کے اہم فن پاروں کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

کینٹر بری ٹیلس (Canterbury Tales):

کینٹر بری ٹیلس کا شمار انگریزی ادب کے اولین فن پاروں میں ہوتا ہے۔ یہ 1387 سے 1400 کے درمیان لکھی گئی۔ اس کا مصنف جیفری چاسر تھا۔ 'چاسر' کو بابائے انگریزی ادب کہا جاتا ہے۔ وہ دور وسطیٰ کا عظیم شاعر تھا وہ اپنے دور کا عظیم ادیب، فلسفی اور ہیئت داں تھا۔ چاسر کا دور دو اہم واقعات کے لحاظ سے انگریزی ادب میں شہرت رکھتا ہے، پہلا 'سو سالہ جنگ' جو انگلستان اور فرانس کے درمیان لڑی گئی اور دوسرا 'بلیک ڈیتھ' جس میں پلیگ جیسی وبائی بیماریوں سے انگلستان اجڑ گیا تھا۔ چاسر کو 'نشاۃ الثانیہ کی صبح کا ستارہ' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ مشہور اطالوی مفکرین پیٹرارچ اور بکاشیو سے اس کی ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ چاسر نے بکاشیو کی 'ڈیکا میرین' سے متاثر ہوکر 'کینٹر بری ٹیلس' لکھی جس کا مطالعہ وہ اپنے اٹلی کے پہلے سفارتی دورے کے دوران 1772 میں کر چکا تھا۔ انگریزی ادب میں کینٹر بری ٹیلس کو اس لیے بھی خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس کتاب نے اپنے دور کے رواج کے برعکس ادب کے لیے اطالوی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں کو چھوڑ کر دیسی انگریزی زبان کو ترجیح دی۔ اس دور کے لحاظ سے یہ ایک انقلابی قدم تھا جس میں چاسر کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ ٹھیک ویسی ہی بات ہوئی جیسا ولی دکنی کے دیوان کو دلی پہنچنے کے بعد وہاں لوگوں کو پتہ چلا کہ شاعری اور ادب صرف فارسی میں ہی نہیں اردو میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور لوگ فارسی چھوڑ کر اردو میں شاعری کرنے لگے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ چاسر کے ہم عصر جان گوور، ولیم لینگ لینڈ، جولین آف نارویچ نے بھی اہم ادبی تخلیقات انگریزی میں لکھی۔ یہ چوبیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جو سترہ ہزار سطروں پر مشتمل ہے۔ اکثر کہانیاں منظوم ہیں کچھ نثر میں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس کی ابتداء کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ 29 زائرین 'سینٹ تھامس بکیٹ' کے مزار کی زیارت کے لیے جو کینٹر بری کیتھڈرل میں ہے ایک ساتھ سفر کے لیے نکلتے ہیں۔ سفر سے ایک دن قبل وہ سب 'ٹیبارڈ ان' نامی سرائے میں جو ساؤتھ وارک میں واقع تھا جمع ہوتے ہیں اور وہاں ان کا میزبان کہانیوں کے مقابلے کا اعلان کرتا ہے۔ کہانی گوئی کے اس مقابلے میں ہر ایک کو چار چار کہانیاں سنانی تھیں۔ دو کہانیاں سفر کے دوران جاتے وقت اور دو واپسی کے سفر میں اور سب سے اچھے کہانی گو کو واپسی میں اسی سرائے میں مفت کھانے کا انعام مقرر کیا جاتا ہے۔ چاسر چاہتا تھا کہ اس کتاب میں کل 120 کہانیاں لکھے لیکن 24 کہانیاں ہی لکھ پایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ کینٹر بری ٹیلس میں جو چوبیس 24 کہانیاں ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

1: نائٹ کی کہانی
2: کارخانے کے مالک کی کہانی
3: صدر بلدیہ رحاکم شہر کی کہانی
4: خانساماں کی کہانی

5: قانون داں کی کہانی
6: وائف آف باتھ کی کہانی
7: راہب کی کہانی
8: کاہن کی کہانی
9: منشی کی کہانی
10: تاجر کی کہانی
11: زمیندار کی کہانی
12: نو دولتیے زمیندار کی کہانی
13: طبیب کی کہانی
14: معافی دینے والے راہب کی کہانی
15: جہاز راں کی کہانی
16: کلیسا کی صدر راہبہ کی کہانی
17: چاسر کی سرٹوپاس کی کہانی
18: میلیبی کی کہانی
19: سنیاسی کی کہانی
20: راہبہ کی کہانی
21: دوسری راہبہ کی کہانی
22: کیتھولک چرچ کے نمائندے کی کہانی
23: داروغہ کی کہانی
24: گرجا کے پادری کی کہانی۔

چاسر نے ان کہانیوں کے پس منظر میں اس وقت کے حالات خاص طور سے مذہبی پیشواؤں کے ذریعے عوامی استحصال اور گرجا گھروں کی اخلاقی گراوٹ پر شدید تنقید کی ہے۔ چاسر کے انداز بیان کی جدت نے اسے نہ صرف انگریزی ادب بلکہ عالمی ادب میں بے مثال داستان گو کی حیثیت عطا کردی۔

یوٹوپیا (UTOPIA):

سر تھامس مور کے ذریعہ تصنیف شدہ یہ کتاب 1516 میں لکھی گئی۔ تھامس مور انسان دوستی اور انسانیت نوازی کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس نے اپنے خوابوں کی ایسی سلطنت کا نقشہ کھینچا جس کا قیام اس کرۂ ارض پر عملی طور پر ممکن نہیں تھا۔ اس کتاب میں سر تھامس مور نے ایک ایسے تصوراتی سماج کا خاکہ پیش کیا ہے جو مثالی ہو۔ ایک افسانوی جزیرے کے مثالی سماج کا اس کتاب میں تصور پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ لاطینی زبان میں لکھی گئی کتاب ہے، جس کا بعد میں اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کے اہم کرداروں میں پہلا کردار خود مصنف کا ہے دوسرا کردار پیٹر گلس جو مصنف کا دوست ہے اور تیسرا کردار رافیل ہائیتھلوڈے ایک پرتگیزی مسافر ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے کتاب کے پہلے حصے میں اس کا مرکزی کردار رافیل ہائیتھلوڈے اپنے سمندری سفر کا احوال بیان کرتا ہے جو اس نے امریگو کے ساتھ کیا تھا۔ اور دوسرے حصے میں وہ یوٹوپیا دیش کے بارے میں بیان کرتا ہے۔

یوٹوپیا دیش کی اہم خصوصیات:

(1) یہ ایک جمہوری ملک ہے۔
(2) یہ ایک ایسا سماجی معاشرہ ہے جہاں دولت پر عوامی کنٹرول ہے۔
(3) جہاں مذہبی رواداری ہے۔
(4) معاشی برابری ہے۔
(5) جہاں امن اور خوش حالی ہے۔
(6) جہاں فطرت سے لگاؤ ہے۔
(7) جہاں لوگ حسن کے دلدادہ ہیں۔
(8) جہاں عام انسانوں سے پیار ہے۔
(9) جہاں انسانی عزت و وقار کا احترام ہے۔

جس وقت تھامس مور نے یہ کتاب لکھی یورپ کا وہ دور تھا جب یورپ میں نشاۃ الثانیہ اپنے پورے بہار پر تھی۔

گاربوڈیک (Gorboduc):

یہ تھامس نارٹن اور تھامس ساکول کے ذریعے پیش کردہ ایک المیہ ڈرامہ ہے جو 1562 میں پہلی بار ملکہ الزابیتھ اول کی موجودگی میں اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ ولیم شیکسپیر کی پیدائش سے دو سال قبل یہ المیہ ڈرامہ دور نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ نگاروں کے لیے ایک مثالی نمونہ بن گیا۔

اس ڈرامے کے اہم کردار:

(1) بادشاہ گاربوڈیک (2) بڑا شہزادہ فیرکس
(3) چھوٹا شہزادہ پوریکس (4) رانی ویڈینا
(5) راجا اور رانی کے قاتل (6) امراء و شرفاء
(7) عوام

یہ ڈرامہ پانچ مناظر پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامہ کا مرکزی تھیم 'جذبہ انتقام' ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ راجا اپنی سلطنت کو دونوں شہزادوں کے درمیان برابر تقسیم کر دیتا ہے۔ دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہوجاتی ہے اور پوریکس کے ہاتھوں بڑے بھائی فیرکس کا قتل ہو جاتا ہے ملکہ کو بڑے شہزادے سے بہت محبت تھی جس کی وجہ سے وہ پوریکس کو قتل کر دیتی ہے۔ لوگ بغاوت کرتے ہیں اور راجا اور رانی دونوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ بعد میں امراء قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں جنھوں نے راجا اور رانی کا قتل کیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں خانہ جنگی شروع ہوجاتی ہے اور ہر طرف بدنظمی اور انتشار پھیل جاتا ہے۔

اسٹروفیل اور اسٹیلا (Astrophel and Stella)

یہ سر فلپ سڈنی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ سر فلپ سڈنی کی حیثیت ایک شاعر سے زیادہ ایک نقاد کی ہے۔ جب گوسن نے 'اسکول آف ابیوز' کے عنوان سے شاعری پر حملے کیے تو اس کے جواب میں سر فلپ سڈنی نے 'ڈیفنس آف پوئٹری' لکھ کر ان حملوں کا موثر جواب دیا تھا۔ فلپ سڈنی کی یہ کتاب انگریزی ادب میں تنقید کا اہم نمونہ تصور کی جاتی ہے۔ شاعری کی حیثیت سے بھی سڈنی کو انگریزی ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ اس

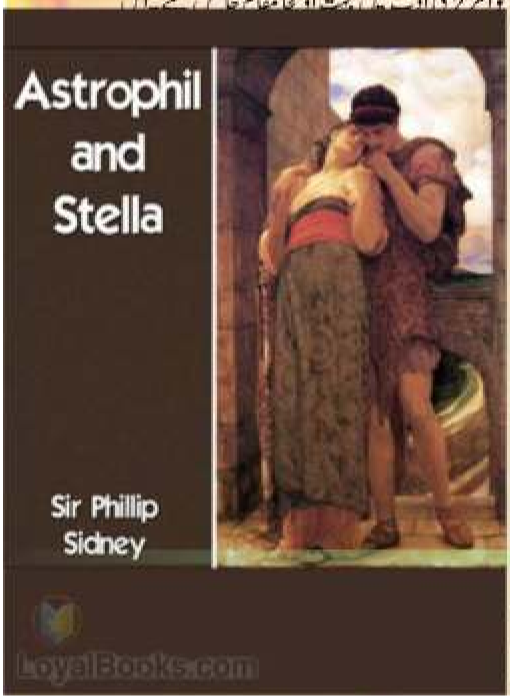

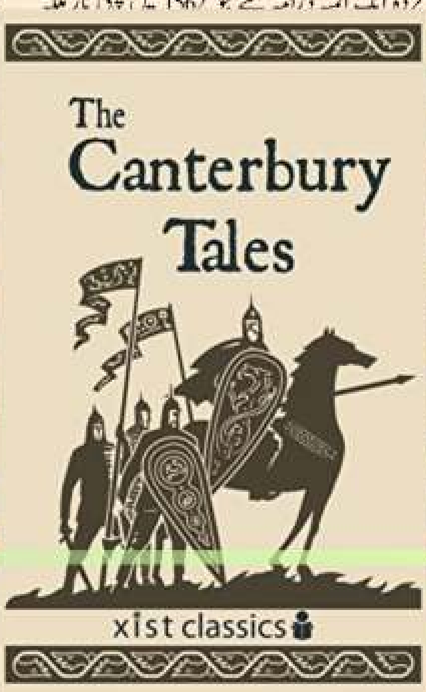

کی شاہکار تخلیق 'اسٹروفیل اور اسٹیلا' ہے جو 1591 میں شائع ہوئی۔ جس میں 108 سانیٹ اور 11 گیت ہیں۔

اسٹروفیل ستاروں کا عاشق ہے جو خود سڈنی ہی ہے اور اسٹیلا اس کا ستارہ ہے۔ جس کی نسبت پینی لوپ کی طرف کی جاتی ہے۔ سڈنی، پینی لوپ سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی شادی 1581 میں کسی رئیس سے ہوگئی۔ اسی اظہار محبت کو سڈنی نے اپنی ان سانیٹ کی شکل میں پیش کیا جو بعد از مرگ 1591 میں شائع ہوئی۔ یہ فن پارہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ انگریزی ادب کی اولین تخلیق ہے، جس میں شاعر نے اپنے ذاتی تجربات کو پیش کیا ہے۔ سڈنی نے اپنے عشق کی داستان پیش کرنے کے لیے ستاروں کا سہارا لیا اور حسن اتفاق سے ٹھیک اسی دور میں اردو کے قرون اولیٰ کے شاعر ملا اسداللہ وجہی نے قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق 'قطب مشتری' مثنوی کی شکل میں تخلیق کی جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام ہی کردار ستاروں اور سیاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر فاسٹس (Doctor Faustus):

'ڈاکٹر فاسٹس' کا شمار انگریزی ادب کے اولین المیہ ڈراموں میں ہوتا ہے۔ اس ڈرامہ کا پورا نام 'ڈاکٹر فاسٹس کی حیات اور موت کی المیہ تاریخ' ہے۔ جسے مختصراً 'ڈاکٹر فاسٹس' کہا جاتا ہے۔ یہ دور الزابیتھ کا المیہ ڈرامہ ہے، جس کا مصنف کرسٹوفر مارلو ہے۔ یہ 1592 میں پیش کیا گیا۔ ابتدا میں فاسٹس مختلف تعلیمی شعبوں مثلاً منطق، طب، قانون، مذہبی علوم وغیرہ کو پرکھنے کے بعد آخر کار اس نے طلسم رجادو کو اختیار کیا۔ تب ایک نیکی کا فرشتہ اور ایک بدی کا فرشتہ ظاہر ہوتے ہیں۔ نیکی کے فرشتے نے اسے طلسمی کتابوں کے مطالعے پر خبردار کیا اور مقدس کتابیں پڑھنے کی تلقین کی لیکن بدی کے فرشتے نے جادو کی کتابیں پڑھنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جب دونوں فرشتے غائب ہوجاتے ہیں تو فاسٹس خود کلامی کے انداز میں جادوئی کتابوں کے مطالعے کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔ اور ویلڈس کے مشورے پر فاسٹس روحوں کو بلانے کے لیے غیر آباد جنگل میں چلا جاتا ہے۔ ویلز اور کارنیلیوس دو دانشور عالم فاسٹس کی تلاش میں آتے ہیں۔ فاسٹس درختوں کے جھنڈ میں ایک جگہ گھیرا ڈال کر منتر پڑھتا نظر آتا ہے۔ نیکی اور بدی کے فرشتے پھر سے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اصرار کرتا ہے کہ وہ خدا کی طرف پلٹ جائے جبکہ دوسرا اسے بے انتہا دولت، عزت، علوم اور طاقت کا بھروسہ دلاتا ہے۔ فاسٹس اپنے منتروں کے زور سے ایک بد روح 'میفسٹو فلیس' کو بلاتا ہے۔ اور اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی جنوں کے شہزادے لوسی فر کا غلام ہے۔ فاسٹس 'میفسٹو فلیس' کے ذریعے لوسی فر سے ایک معاہدہ کرتا ہے۔ جس کی رو سے وہ اپنی زندگی کے 24 سال لوسی فر کو اس زمین پر رہنے کے لیے اپنا جسم دے دے گا لیکن ایک خاص مدت تک 'میفسٹو فلیس' کو اس کے تابع کر دیا جائے اور دونوں کے درمیان یہ معاہدہ طے ہوجاتا ہے جو فاسٹس کے خون سے لکھا جاتا ہے۔ 'میفسٹو فلیس' اسے جادو کی ایک کتاب دیتا ہے، جس میں انسان اور اشیا پر قابو کا علم ہوتا ہے۔ نیکی کا فرشتہ پھر سے اصرار کرتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں پر توبہ کرلے اور ندامت اختیار کرلے۔ لیکن بدی کا فرشتہ اسے متنبہ کرتا ہے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو چیر کر رکھ دیا جائے گا۔ اس طرح سے وہ اپنے جادو اور طلسمی طاقتوں کی بدولت دنیا بھر میں عزت اور شہرت حاصل کرتا ہے۔ لیکن جب اس کا وقت قریب آتا ہے اور معاہدہ کے لحاظ سے اسے اپنی زندگی سونپنی پڑتی ہے تو بدروحیں اسے کھینچ کر جہنم میں لے جاتی ہیں۔

اوتھیلو (Othello)

ولیم شیکسپیئر کے نام کے بغیر انگریزی ادب کی کوئی بھی تاریخ ادھوری ہی کہلائے گی۔ شیکسپیئر انگریزی ادب کے آسمان پر چمکنے والا سب سے تابدار ستارہ ہے جو انگلینڈ کا 'قومی شاعر' کہلاتا ہے۔ انگریزی زبان میں دنیا کے عظیم ترین مصنفین اور ڈرامہ نگاروں میں ولیم شیکسپیئر کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک عظیم ڈرامہ نگار، شاعر اور اداکار تھا۔ اس کی پیدائش 1564 میں ہوئی اور وفات 1616 میں ہوئی۔ اس کی تصانیف میں 38 ڈرامے 154 گیت اور دو طویل نظمیں ہیں۔ اس کے ڈراموں کے دنیا کی سبھی بڑی زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔

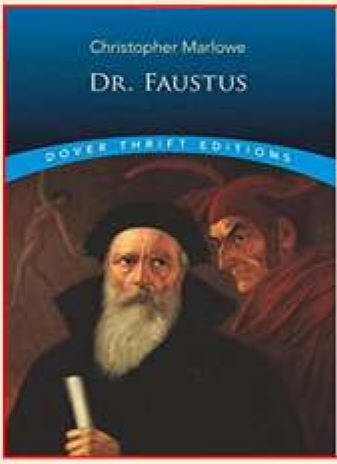

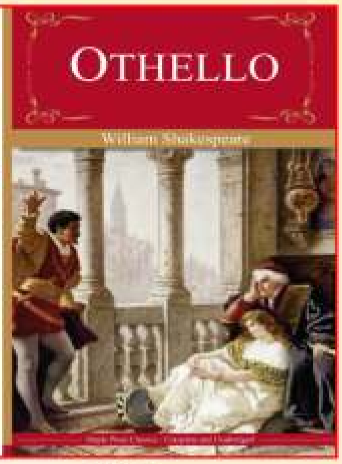

اوتھیلو ولیم شیکسپیئر کا 1603 میں لکھا ہوا المیہ ڈرامہ ہے۔ جس کی بنیاد 'ایک بربر کپتان' نامی کہانی پر رکھی گئی ہے جسے بوکاشیو کے شاگرد 'ینتھیو' نے 1565 میں لکھا تھا۔ اوتھیلو کی کہانی اس کے دو مرکزی کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ اوتھیلو جو بربر سردار ہے اور وینس کی فوج کا سپہ سالار ہے جبکہ لاگو اس کا بھروسے مند لیکن حاسد اور غدار علم بردار ہے۔ کہانی میں نسل پرستی، حمیت، رقابت، دھوکہ، انتقام، توبہ سے بھرپور جذبات کی عکاسی ہے۔ روڈرگو ایک مالدار اونچے خاندان کا بدچلن شخص تھا۔ جو اپنے دوست لاگو سے شکایت کرتا ہے کہ اس نے برین ٹیو کی بیٹی ڈیسڈومینو اور بربر جنرل اوتھیلو کی خفیہ شادی کی خبر اسے نہیں دی۔ روڈرگو مغموم ہے کیونکہ وہ ڈیسڈومینو سے محبت کرتا تھا اور اس نے برین ٹیو سے اس کا ہاتھ مانگا تھا۔ لاگو، اوتھیلو سے اس لیے نفرت کرتا ہے کہ اس نے ایک نوجوان کیسیو کو اس پر ترجیح دی جسے بطور سپاہی وہ اپنے سے کم تر سمجھتا تھا۔ لاگو، ریڈریگو کو اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ وہ برین ٹیو کو اس کی بیٹی کے بھاگنے کی اطلاع دے۔ ریڈریگو برین ٹیو کو اکساتا ہے اور وہ غصے میں کہتا ہے '' جب تک اوتھیلو کا سر قلم نہیں کرونگا آرام سے نہیں بیٹھوں گا''۔ لیکن جب وہ اوتھیلو کی رہائش گاہ پر پہنچتا ہے تو وہاں، ڈیوک (امیر رحاکم) کے سپاہی موجود ہوتے ہیں۔ وینس سے یہ خبر آتی ہے کہ ترک سائپرس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے اوتھیلو کو ڈیوک کے پاس مشورے کے لیے طلب کیا جاتا ہے۔ اس لیے مجبوراً برین ٹیو کو بھی ڈیوک کی رہائش گاہ پر جانا پڑتا ہے۔ جہاں برین ٹیو اوتھیلو پر اپنی بیٹی کو کالے جادو کے ذریعے ورغلانے اور دھوکہ دینے کا الزام لگاتا ہے۔ اوتھیلو اپنی صفائی پیش کرتا ہے۔ جب ڈیسڈی مینو، اوتھیلو سے محبت کا اقرار کرتی ہے تو تمام سینٹر اوتھیلو کی باتوں سے مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اوتھیلو وینس سے وداع ہوتا ہے تاکہ ترک فوج کے مقابلے وینس کی فوج کی قیادت کرسکے۔ اس کے ساتھ میں لاگو، کیسیو، ڈیسڈمینو اور امیلیا بھی ہوتے ہیں۔ سائپرس جانے پر پتہ چلتا ہے کہ ترک فوج کا بحری

بیڑہ طوفان کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ وینس کی فوج جشن مناتی ہے اس دوران لاگو،کیسیو اور ریڈرگو کے درمیان جھگڑا کرادیتا ہے۔ جب اوتھیلو واپس آتا ہے تو اس بات سے ناراض ہوکر کیسیو کے رتبہ کو گھٹادیتا ہے۔ لاگو،کیسیو کو اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ وہ اوتھیلو کی بیوی کو سفارش کے لیے کہے۔ اس طرح لاگو کیسیو اور ڈیسڈی مینو کے بارے میں اوتھیلو کو شک میں مبتلا کردیتا ہے۔ لاگو ان کے درمیان ایسے حالات پیدا کردیتا ہے کہ اوتھیلو اپنی بیوی کو قتل کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور لاگو سے کہتا ہے کہ وہ کیسیو کو قتل کردے۔ اوتھیلو وینس کے شرفا کی موجودگی میں اپنی بیوی کو مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ لاگو ریڈریگو کو پھنسانے کے لیے کیسیو پر حملہ کرواتا ہے۔ اوتھیلو کو آخر اپنی بیوی کی بے گناہی کا احساس ہوتا ہے جب امیلیا اپنے شوہر کے راز فاش کرتی ہے۔ اوتھیلو خود کشی کرلیتا ہے۔ کیسیو کو اوتھیلو کا جانشین مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اس سے لاگو کو سزا دینے کے لیے کہا جاتا ہے۔

میک بیتھ (Macbeth):

ولیم شیکسپیئر کا 1606 میں لکھا ہوا ایک المیہ ڈرامہ ہے جو ایک بہادر اسکاٹش جنرل میک بیتھ کا المیہ ہے۔ میک بیتھ کو تین کاہن جادوگرنیاں پیشن گوئی کرتی ہیں کہ وہ ایک دن اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ بنے گا۔ اپنے بلند عزائم سے مغلوب ہوکر اور اپنی بیوی کی حوصلہ افزائی پاکر وہ اسکاٹ لینڈ کے راجا ڈنکن کا قتل کردیتا ہے۔ اور اسکاٹش تخت وتاج پر قبضہ کرلیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ندامت اور جنون کی وجہ سے برباد ہوجاتا ہے۔ شک اور شبے کی بنیاد پر وہ بے دریغ قتل کیے چلا جاتا ہے۔ اور ایک ظالم حکمران بن جاتا ہے۔ خون کی اس ہولی کی وجہ سے خانہ جنگی پھیل جاتی ہے اور میک بیتھ اور لیڈی میک بیتھ کو قتل کردیا جاتا ہے۔

ڈرامہ اس طرح ہے: میک بیتھ گلیمس کا حاکم ہے۔ اور اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ ڈنکن کی فوج کا سپہ سالار رہا تھا۔ ڈرامہ کے آغاز میں میک بیتھ دوسرے جنرل بانکو کے ساتھ کاڈر کے حاکم کی بغاوت کچلنے کے بعد واپس ہوتا ہے۔ واپسی کے دوران ان کی ملاقات تین کاہن عورتوں سے ہوتی ہے۔ جن میں سے ایک میک بیتھ کو کاڈر کا حاکم کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ میک بیتھ ان سے یہ پیشن گوئی سن کر خوش ہوجاتا ہے کہ وہ اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ بنے گا اور اس کے کچھ دیر بعد میک بیتھ کو اس بات کی اطلاع ملتی ہے کہ اسے اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ نے کاڈر کا حاکم مقرر کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے میک بیتھ کو کاہنوں کی پیشن گوئی کے سچ ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔ اسے بادشاہ بننے کی چاہت اور خواہش اس قدر ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسری پیشن گوئی بھی بہت جلد پوری ہوجائے۔ بادشاہ ڈنکن میک بیتھ کو اعزاز بخشنے کے لیے اس کے قلعہ میں جانا چاہتا ہے۔ اسی دوران میک بیتھ اپنی بیوی کو بذریعہ خط کاہنوں کی پیشن گوئی کی خبر پہنچاتا ہے۔ لیڈی میک بیتھ کو اپنے شوہر سے زیادہ تجسس ہوتا ہے کہ وہ راجا بن جائے۔ جیسے ہی میک بیتھ گھر پہنچتا ہے اس کی بیوی بادشاہ ڈنکن کو قتل کرکے بادشاہ بننے کی پیشن گوئی پورا کرنے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ میک بیتھ تھوڑا ہچکچاتا ہے۔ بادشاہ میک بیتھ جوڑے کے استقبال سے خوش ہوجاتا ہے اور گھر کے پرسکون ماحول سے متاثر ہوکر ایک رات وہیں گذارنے کا ارادہ کرتا ہے۔ لیڈی میک بیتھ کا اصرار بڑھتا جاتا ہے اور

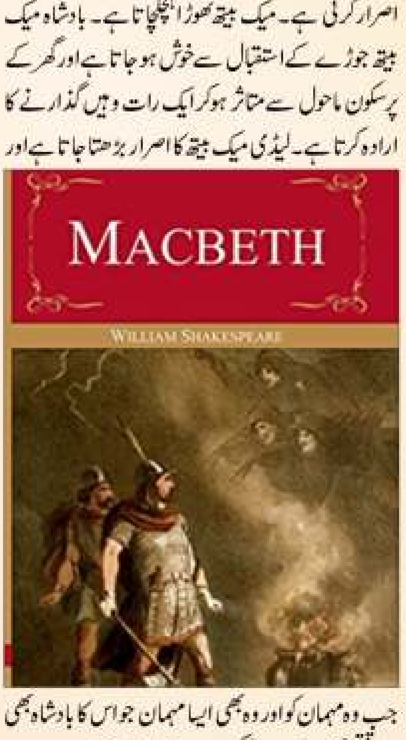

جب وہ مہمان کو اور وہ بھی ایسا مہمان جو اس کا بادشاہ بھی ہے، قتل کرنے سے ہچکچاتا ہے تو لیڈی میک بیتھ اسے بزدل کہہ کر خود ہی اسے قتل کے لیے جاتی ہے لیکن راجا کا چہرہ اسے اپنے باپ کی طرح نظر آتا ہے تو واپس آجاتی ہے۔ آخر میک بیتھ راجا کے کمرے میں جاکر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا ہے۔ اور اپنی بیوی کو اس کی اطلاع دیتا ہے۔ اسی وقت ایک آواز آتی ہے کہ "میک بیتھ اب آگے کبھی سو نہیں پائے گا"۔ اور ڈر اور خوف اس پر طاری ہوجاتا ہے۔ لیڈی میک بیتھ اس موقع پر ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے وہ خنجر نکال کر محافظوں کے پاس رکھ دیتی ہے اور خون کے چھینٹے بھی ان پر ڈال دیتی ہے تاکہ ان پر الزام لگایا جاسکے۔ دروازے پر دستک دینے پر جیسے ہی حاجب دروازہ کھولتا ہے بادشاہ کے دو مصاحب بادشاہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور اسے مردہ پاتے ہے۔ جیسے ہی یہ خبر میک بیتھ کو پہنچائی جاتی ہے۔ وہ دونوں محافظوں کو قتل کردیتا ہے۔ اور یہ خبر جب اسکاٹ لینڈ میں شہزادوں تک پہنچتی ہے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ جاتے ہیں۔ بڑا شہزادہ ملکم انگلینڈ فرار ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے میک بیتھ اسکاٹ لینڈ کی بادشاہت کا دعوی کرتا ہے۔ اب میک بیتھ کو بانکو کا خوف رہتا ہے کیونکہ کاہنوں نے یہ بھی پیشن گوئی کی تھی کہ بانکو کی نسل سے بھی راجا ہوگا۔ اس لیے میک بیتھ سوچ لیتا ہے کہ وہ نہ صرف بانکو کو قتل کرے گا بلکہ اس کے لڑکے فلینس کو بھی قتل کردے گا میک بیتھ ایک منصوبہ تیار کرتا ہے اور تمام امراء اور شرفاء کو ضیافت پر بلاتا ہے۔ جب بانکو اور اس کا بیٹا میک بیتھ کے قلعے کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو دو فدائین کی خدمت حاصل کی جاتی ہے تاکہ ان دونوں کو راستے ہی میں قتل کردیا جائے۔ اس حملے میں بانکو قتل ہوجاتا ہے لیکن اس کا بیٹا بچ نکلتا ہے۔ ضیافت کے دوران بانکو کا بھوت میک بیتھ کو کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے اور اس بھوت کی سرگوشیاں بھی اسے سنائی دیتی ہیں۔ حاضرین میک بیتھ کے اس عجیب وغریب رویے سے حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھوت غائب ہوجاتا ہے لیکن پھر نظر آتا ہے۔ میک بیتھ پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگتا ہے۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے وہ حاضرین کے درمیان شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میک بیتھ پھر سے کاہنوں کے پاس جاتا ہے جو اسے مزید تین پیشن گوئیاں کرتے ہیں۔ (1) میک بیتھ، میک ڈف سے چوکنا رہے، (2) کوئی بھی شخص جسے کسی عورت نے جنم دیا ہو وہ میک بیتھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا (3) میک بیتھ کو اس وقت تک شکست نہیں ہوسکتی جب تک دنسنین کی اونچی پہاڑی چوٹی سے برنم کے شاہ بلوط کے درخت نہیں آجاتے۔ لیڈی میک بیتھ بہت زیادہ افسردہ اور پریشان ہوجاتی ہے اور خودکشی کرلیتی ہے۔ میک ڈف انگلینڈ فرار ہوجاتا ہے۔ ملکم کے سپاہی برنم کے شاہ بلوط کے درخت لے کر میک بیتھ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ میدان جنگ میں میک بیتھ اور میک ڈف ایک دوسرے کے مدمقابل آتے ہیں۔ جن کے اطراف ان کے سپاہی لڑرہے ہیں۔ میک ڈف کہتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا پیٹ چیر کر نکالا گیا ہے۔ اس بات کو سن کر میک بیتھ اتنا پس ہمت ہوجاتا ہے کہ وہ بغیر لڑائی کے قتل کردیا جاتا ہے۔

■

Dr Zaker Inamdar
Near Ameer Ali Masjid Main Road
Ardhapur Tq Ardhapur
Dist.Nanded maharashtra 431704
Mobile:9860413977
E-mail: zaker.inamdar@gmail.com

ایم ایس۔ورڈ پر کام کرنا
(Working with MS-Word)

دستاویز کو محفوظ کرنا(Saving the Document)

جب تک کسی دستاویز کو کسی ڈسک پر محفوظ نہیں کیا جاتا، تب تک وہ صرف مین میموری میں رہتی ہے اور کسی وجہ سے بجلی کے چلے جانے پر ہمیشہ کے لیے برباد ہوجاتی ہے۔اس لیے ہر ایک دستاویز کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔محفوظ کرنے کے بعد کبھی بھی ٹھیک اسی حالت سے کام شروع کرسکتے ہیں۔جس حالت کو آپ نے محفوظ کیا تھا۔

اگر کوئی دستاویز پہلی بار محفوظ کی جارہی ہے، تو آپ کو اس کا کوئی نام رکھنا ہوگا۔ شروع میں ایم ایس-ورڈ کے ذریعے نئی دستاویزوں کے نام Document 1,2,3 وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔آپ انھیں بدل کر کوئی بھی نام رکھ سکتے ہیں۔محفوظ کرنے کے لیے آفس مینو میں 'Save' ہدایت دیجیے یا کوئک ایکسیس ٹول بار میں 'Save' بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر آپ کی اسکرین پر تصویر WD-2.5 کی طرح 'Save As' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں دستاویز کا نام 'File name' باکس میں اور اس کے فولڈر کا نام سب سے اوپر کے باکس میں دیا جاتا ہے۔ 'Save as type' لسٹ باکس میں فائل کا ٹائپ دیا جاتا ہے۔یہ عام طور پر 'Word Document' ہوتا ہے، جس سے فائل کے نام میں docx ایکسٹینشن جوڑ دیا جاتا ہے۔پہلی بار کوئی فائل محفوظ کرنے کے لیے یہ اطلاعات دینی ضروری ہیں۔یہ باکس بھرنے کے بعد 'Save' بٹن کو کلک کرنے سے فائل (دستاویز) کو محفوظ کردیا جاتا ہے۔

اگر کوئی دستاویز پہلے بھی ایک بار محفوظ کی جاچکی ہے، تو 'Save' ہدایت دینے پر کوئی ڈائیلاگ باکس نہیں دیا جائے گا، بلکہ پہلے ہی دی جاچکی ہے اطلاعات کے مطابق فائل محفوظ کردی جائے گی۔اگر آپ ان اطلاعات میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، جیسے نام

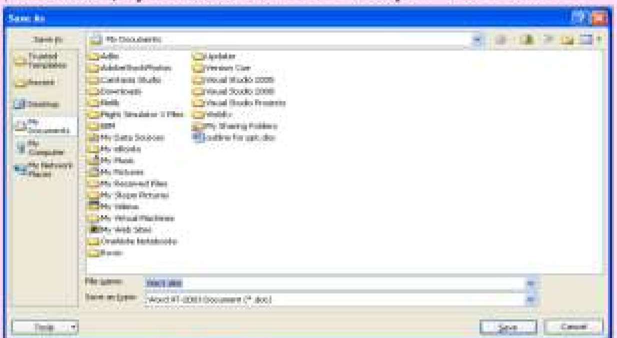

تصویر:WD-2.5:'Save As' کا ڈائیلاگ باکس

بدلنا چاہتے ہیں، تو 'Save' کی جگہ آفس مینو '...Save As' ہدایت دیجیے۔اسے تصویر WD-2.5 کا ہی ڈائیلاگ باکس حاصل ہوگا۔

'...Save As' ہدایت کے ذریعے آپ ورڈ کی ونڈو میں کھلی ہوئی کسی دستاویز کو نئے نام سے محفوظ کرکے اس فائل کی ایک نقل بھی بنا سکتے ہیں۔اس سے بنیادی فائل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اتنا ہی نہیں Save As کے ذریعے آپ دستاویز کو ورڈ کے پرانے ورژن میں بھی محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ایسا کرنے پر آپ کو ٹائٹل بار میں Compatibility Mode لکھا ہوا نظر آئے گا۔

مشق کے لیے اس فائل کو محفوظ کرنے کے لیے Office مینو میں 'Save' یا '...Save As' ہدایت دیجیے۔اس کے جواب میں حاصل ہونے والے ڈائیلاگ باکس میں 'File Name' کے سامنے 'My First Word Document' بھر دیجیے اور 'Save' بٹن کلک کیجیے۔اس سے دستاویز اس نام سے ڈسک پر اسٹور ہوجائے گی اور اسکرین پر بھی ٹائٹل بار میں یہی نام نظر آئے گا۔

ٹیکسٹ کا انتخاب کرنا(Selecting Text)

دستاویز میں کوئی اصلاح کرنے کے لیے، جیسے کسی لفظ یا جملہ کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے یا اس کی نقل کرنے، اس کی شکل وصورت (Format) یا سائز (Size) بدلنے وغیرہ کاموں کے لیے سب سے پہلے اس ٹیکسٹ کو چنا جاتا ہے۔ٹیکسٹ چننے کے لیے عام طور پر ماؤس کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے لیے سب سے پہلے ماؤس پوائنٹر کو وہاں لے جائیے، جہاں سے شروع کرکے ٹیکسٹ کو آپ چننا چاہتے ہیں۔اب ماؤس بٹن کو کلک کرکے پکڑے رکھیے اور اسے دبائے رکھتے ہوئے ماؤس پوائنٹر کو دائیں جانب سرکائیے۔آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے ماؤس پوائنٹر سرکتا ہے، ویسے ویسے اس کے اندر آیا ہوا ٹیکسٹ الٹے رنگ میں نظر آتا رہتا ہے۔اسی طرح سرکاتے ہوئے ماؤس بٹن کو اس ٹیکسٹ کے اخیر میں لے جاکر چھوڑ دیجیے، جہاں تک آپ چننا چاہتے ہیں۔ایسا کرنے پر ان دونوں جگہوں کے درمیان کا سارا مواد (لائنیں، پیراگراف وغیرہ سمیت) چن لیا جائے گا اور وہ حصہ اسکرین پر الٹے رنگ (Reverse Video) میں نظر آئے گا۔

مواد چننے میں اور زیادہ آسانی کے لیے آپ درج ذیل تکنیکوں کا بھی استعمال ضرورت کے مطابق کرسکتے ہیں:

- کسی لفظ کو چننے کے لیے اسے ڈبل کلک کیجیے۔
- کسی جملہ کو چننے کے لیے کنٹرول کنجی (Ctrl) کو دبا کر جملہ میں کہیں کلک کیجیے۔
- کسی لائن کو چننے کے لیے ماؤس پوائنٹر اس لائن کے بائیں جانب کے حاشیے میں لائن کے ٹھیک سامنے کلک کیجیے۔
- کسی پیراگراف کو چننے کے لیے پیراگراف میں ہی کہیں لگاتار تین بار کلک کیجیے یا پیراگراف کے بائیں جانب کے حاشیے میں ڈبل کلک کیجیے۔

ان سبھی تکنیکوں میں آپ ماؤس بٹن کو دبا کر کھینچ لے جاکر (Dragging کرکے) پاس کے دوسرے لفظوں، جملوں، لائنوں یا پیراگرافوں کو بھی چن سکتے ہیں۔

اگر آپ پورے لفظوں کے بجائے صرف ان کے کچھ حصے کو ہی چننا چاہتے ہیں، تو ماؤس کو کلک کرتے اور کھسکاتے وقت آلٹ (Alt) کنجی کو دبائے رکھیے۔

پوری دستاویز کو چننے کے لیے Home ٹیب کے Editing آپشن میں Select مینو کا 'Select All' کمانڈ دیجیے۔

ٹیکسٹ کا انتخاب آپ کی بورڈ کی مدد سے بھی کرسکتے ہیں۔اس کے لیے سب سے

پہلے کرسر (نقطہ شمول) کو اس جگہ پر پہنچائیے، جہاں سے شروع کر کے آپ ٹیکسٹ کو چننا چاہتے ہیں۔ اب شفٹ کنجی کو دبا کر پکڑ لیجیے اور اسے دبائے رکھتے ہوئے تیر کے بٹنوں سے کرسر کو دائیں جانب یا نیچے کی طرف سرکائیے۔ ایسا کرتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ جہاں تک کرسر جائے گا، اس کے ابتدائی مقام سے وہاں تک کا سارا ٹیکسٹ چن لیا جائے گا۔ اس طریقے سے آپ ایک حرف سے لے کر پوری دستاویز تک کو چن سکتے ہیں۔

ہر ایک معاملے میں چنا ہوا ٹیکسٹ یا مواد الٹے رنگ (Reverse Colour) میں دکھایا جاتا ہے۔ چنے ہوئے مواد پر آپ آگے بتائے گئے کام کر سکتے ہیں۔ یہ کام صرف چنے ہوئے مواد پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی چیز چنی ہوئی نہیں ہے، تو یہ کمانڈ نا اہل (Disable) ہو جاتی ہیں۔

مشق کے لیے، اوپر اسٹور کی گئی دستاویز میں ٹیکسٹ چننے کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

(1) ماؤس پوائنٹر کو پہلے پیراگراف میں 'Nobody' پر کہیں بھی لے آئیے اور ڈبل کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ لفظ الٹے رنگ میں آ گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ چن لیا گیا ہے۔ اب ماؤس کو کہیں بھی ایک بار کلک کر دیجیے، جس سے چنا ہوا لفظ پھر سے عام ہو جائے گا۔

(2) 'Nobody' لفظ سے شروع ہونے والا جملہ چننے کے لیے ماؤس پوائنٹر کو اس جملہ میں کہیں لے جائیے اور کنٹرول کنجی کو دبا کر ماؤس بٹن کو ایک بار کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ 'Nobody likes a sick or weak person' - یہ پورا جملہ چن لیا گیا ہے۔

(3) کوئی پورا پیراگراف چننے کے لیے ماؤس بٹن سے لگاتار تین بار کلک کیجیے۔ اس کی مشق کر کے ماؤس بٹن کو کہیں بھی خالی کلک کیجیے۔

(4) ماؤس پوائنٹر کو کسی لائن کے بائیں جانب کے حاشیے میں لا کر ایک بار کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے وہ لائن پوری کی پوری چن لی گئی ہے۔

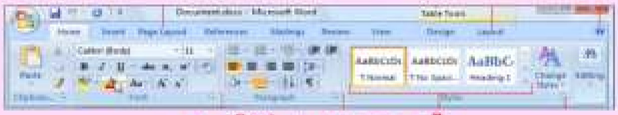

تصویر WD-2.6: ربن کے مختلف ٹیب

(5) ماؤس پوائنٹر کو کسی لفظ پر لے جا کر ماؤس بٹن کو دبا کر پکڑ لیجیے اور اسے دبائے رکھ کر ماؤس پوائنٹر کو آگے اور نیچے سرکائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے ماؤس پوائنٹر آگے چلتا ہے، وہاں تک کا سارا حصہ چن لیا جاتا ہے، چاہے اس میں کتنی بھی لائنیں یا پیراگراف ہوں۔

ہوم ٹیب (Home Tab)

ٹیکسٹ کو ایڈیٹ کرنے میں ہوم ٹیب کے مختلف بٹنوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ٹیب تصویر WD-2.6 میں دکھایا گیا ہے اور اس کے بٹنوں کی طرف نام سے اشارہ کیا گیا ہے۔

ان بٹنوں کو ٹھیک سے پہچان لینا چاہیے، کیونکہ آگے کے صفحات پر ضرورت کے مطابق ان کا حوالہ دیا جائے گا۔ اب ہم ان بٹنوں کی مدد سے ٹیکسٹ کو ایڈیٹ کرنے کے طریقے بتائیں گے۔

ٹیکسٹ ہٹانا (Deleting Text)

دستاویز کے کسی حصہ یا ٹیکسٹ کو ہٹانے کے لیے بتائے گئے طریقے سے اسے چن کر کی-بورڈ پر Delete (یا Del) کنجی دبائیے۔ اس سے وہ ٹکسٹ غائب ہو جائے گا۔ مواد کو چن کر اور Home Tab میں Clipboard کے تحت 'Cut' بٹن (جس پر قینچی ہوتی ہے) کو کلک کر کے بھی آپ اس مواد کو دستاویز سے ہٹا سکتے ہیں۔

نقطہ شمول (یا کرسر) کو ہٹائے جانے والے حصہ میں لے جا کر بیک اسپیس یا Del کنجیوں کا استعمال کر کے بھی آپ ٹیکسٹ کو ہٹا سکتے ہیں۔

مشق کے لیے، اوپر بنائی گئی دستاویز میں 'Nobody likes a sick or weak person' اس جملہ کو چنیے اور 'Delete' یا Backspace کنجی دبائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ فوراً ہی یہ جملہ غائب ہو گیا ہے۔ اسے پھر سے حاصل کرنے کے لیے کوئک ایکسیس ٹول بار میں 'Undo' ہدایت دے دیجیے۔

ٹیکسٹ بیچ میں داخل کرنا (Inserting Text)

کسی ٹیکسٹ کے بیچ میں یا شروع میں نیا ٹیکسٹ ڈالنے کے لیے پہلے نقطہ شمول (|) کو اس جگہ پر لے جائیے اور جو بھی چاہیں ٹائپ کرنا شروع کر دیجیے۔ ایسا کرنے پر آپ جو بھی ٹائپ کریں گے، وہ نقطہ شمول والی جگہ پر داخل ہوتا چلا جائے گا اور اس کے بعد کبھی لفظ، جملے وغیرہ اپنے آپ ہی دائیں جانب سرک کر ٹھیک سے لگتے جائیں گے۔

ٹیکسٹ کی نقل کرنا یا سرکانا (Copying or Moving Text)

کسی ٹیکسٹ کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ پر لے جانے کے دو طریقے ہیں۔

پہلا اور آسان طریقہ درج ہے:

1. سب سے پہلے آپ اس ٹیکسٹ کو بتائے گئے طریقے سے چن لیجیے اور ہٹا دیجیے، یعنی 'Cut' کر دیجیے۔ اگر آپ ٹیکسٹ کی نقل کرنا چاہتے ہیں، تو Cut کے ٹھیک نیچے دیے گئے Copy بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر ہٹایا گیا پورا مواد کلپ بورڈ میں رکھ لیا جاتا ہے۔ کلپ بورڈ میں صرف آخری بار 'Cut' یا 'Copy' ہدایت کے ذریعے ہٹایا گیا مواد ہی رکھا جاتا ہے۔ اس مواد کو آپ کہیں بھی چپکا سکتے ہیں، یعنی Paste کر سکتے ہیں۔
2. چپکانے کے لیے نقطہ شمول کو اس جگہ پر لے جا کر لگائیے، جہاں سے شروع کر کے آپ اسے چپکانا چاہتے ہیں۔
3. اب Home ٹیب میں Clipboard کا 'Paste' بٹن (جس پر گوند کی ڈبی چھپی ہے) کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ آخری بار ہٹایا گیا مواد نقطہ شمول کی جگہ نظر آنے لگا ہے۔ اس طریقے سے آپ کوئی بھی مواد کہیں بھی چپکا سکتے ہیں۔ اس مواد کو آپ متعدد جگہ بھی چپکا سکتے ہیں۔

ٹیکسٹ کو سرکانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس ٹیکسٹ کو چن لیجیے۔ اب چنے ہوئے حصہ میں ماؤس کا دایاں بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر ایک مینو کھلے گا۔ اس میں سے اپنی خواہش کے مطابق Cut یا Copy کلک کیجیے۔ اب نقطہ شمول کو اس جگہ پر لے جائیے، جہاں آپ اسے چپکانا چاہتے ہیں۔ دوبارہ ماؤس کا دایاں بٹن دبائیے اور مینو میں Paste پر کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ پورا منتخب کردہ مواد نئی جگہ پر آ گیا ہے اور دستاویز بھی اسی کے مطابق اپنے آپ سیٹ ہو گئی ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ 'Paste' ہدایت صرف آخری بار 'Copy' یا 'Cut' کیے گئے ٹیکسٹ یا مواد پر ہی نافذ ہوتی ہے۔

ٹیکسٹ بدلنا (Replacing Text)

کسی لفظ، جملہ یا دیگر ٹیکسٹ کو بدلنے کے دو طریقے ہیں۔ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جس ٹیکسٹ کو آپ بدلنا چاہتے ہیں، پہلے اسے بتائے گئے طریقے سے ہٹا دیجیے۔ پھر وہاں نیا ٹیکسٹ ٹائپ کر کے ڈال دیجیے۔

دوسرے طریقے میں ان دونوں کاموں کو ایک ساتھ کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے

بدلے جانے والے ٹیکسٹ کو چن لیجیے، جس سے وہ الٹے رنگ میں دکھائی دے گا۔ اب اس کو ہٹائے بغیر سیدھے نیا ٹیکسٹ ٹائپ کرنا شروع کر دیجیے۔ آپ جو بھی ٹائپ کریں گے، وہ چنے ہوئے حصہ کی جگہ لگ جائے گا۔

کام کو الٹنا (Undo)

اگر کسی وجہ سے آپ اپنے کام کو الٹنا چاہتے ہیں، تو کوئک ایکسیس ٹول بار میں 'Undo' بٹن، جس پر گھڑی کی الٹی سمت میں جاتا ہوا گول تیر بنا رہتا ہے، کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر آپ کے ذریعے کیا ہوا آخری کام الٹ جائے گا، یعنی بیکار ہو جائے گا اور فائل ٹھیک اس سے پہلے والی شکل میں آجائے گی۔ اگر آپ اس سے بھی پہلے کے کاموں کو الٹنا چاہتے ہیں، تو بار بار 'Undo' ہدایت دے کر ویسا کر سکتے ہیں۔

کام کو پھر کرنا (Redo)

اگر آپ 'Undo' ہدایت کے ذریعے پلٹے گئے کام کو پھر سے کرنا چاہتے ہیں تو 'Redo' ہدایت دے کر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ کوئک ایکسیس ٹول بار میں 'Redo' بٹن ("undo" بٹن کی ٹھیک الٹی تصویر) بنا رہتا ہے۔ آپ کئی بار 'Redo' ہدایت دے کر کئی الٹے ہوئے کاموں کو سیدھا کر سکتے ہیں۔

دستاویز کو چھپوانا (Printing a Document)

کوئی بھی دستاویز چھپوانے کے لیے پہلے کسی پرنٹر کو ڈیفالٹ پرنٹر کی شکل میں انسٹال کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کا ڈیفالٹ پرنٹر انسٹال ہو چکا ہے اور آپ کسی کھلی ہوئی دستاویز کے سبھی صفحات کی صرف ایک ایک کاپی چھپوانا چاہتے ہیں، تو آفس مینو میں Print کلک کیجیے۔ اس کے بعد دائیں طرف کھلنے والے مینو میں Quick Print مینو کی 'Pring' ہدایت کا استعمال کیجیے۔ یہ ہدایت دیتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر WD-2.7 کی طرح پرنٹ ڈائیلاگ باکس نظر آئے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں کئی حصے ہیں۔ 'Printer' والے حصہ میں 'Name' لسٹ باکس میں پرنٹر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس باکس کے تیر کے نشان والے چھوٹے بٹن کو کلک کرنے پر آپ کے کمپیوٹر میں انسٹال ہو چکے سبھی پرنٹروں کی فہرست دی جاتی ہے، جن میں سے کسی بھی ایک پرنٹر کو آپ چن سکتے ہیں۔

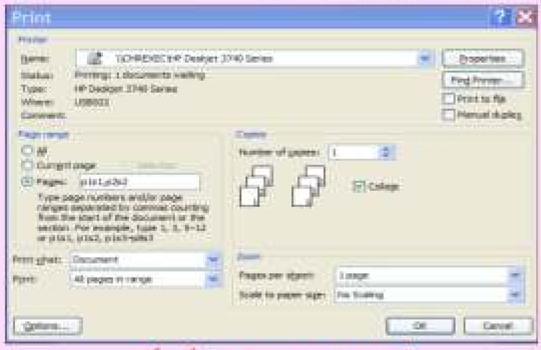

تصویر WD-2.7: پرنٹ کا ڈائیلاگ باکس

'Page Range' والے حصہ میں چھاپے جانے والے صفحات کو بتایا جاتا ہے۔ اگر آپ کھلی ہوئی دستاویز کے سبھی صفحات کو چھاپنا چاہتے ہیں، تو 'All' ریڈیو بٹن کو کلک کرکے سیٹ کر دیجیے۔ اگر صرف موجودہ صفحہ (یعنی دستاویز میں کرسر والے صفحہ) کو ہی چھپوانا ہو، تو 'Current Page' ریڈیو بٹن کو سیٹ کیجیے۔ اگر ان کے علاوہ چند خاص صفحات کو چھپوانا چاہیں، تو پہلے 'Pages' ریڈیو بٹن کو سیٹ کرکے اس کے سامنے کے ٹیکسٹ باکس میں ان صفحات کی تعداد کاما(Comma) لگا لگا کر بھر دیجیے۔ اگر آپ صفحہ نمبر 4,2 سے 14,10,8 سے 16 اور 23 کو چھپوانا چاہتے ہیں، تو باکس میں 14-16, 10,4-8,2 بھرنا چاہیے۔

پرنٹ ڈائیلاگ باکس کے 'Copies' والے حصہ میں چھاپی جانے والی کاپیوں کی تعداد دی جاتی ہے۔ اس کے لیے 'Number of copies' اسپن باکس کی وہ عدد بھر دیجیے یا اسپن بٹنوں کو کلک کرکے صحیح عدد سیٹ کیجیے۔ اسی حصہ میں 'Collate' کا چیک باکس چھپائی کی ترتیب طے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر مان لیجیے کہ آپ کی دستاویز میں 5 صفحات ہیں اور آپ اس دستاویز کی 4 کاپیاں چھپوانا چاہتے ہیں۔ اب اگر آپ نے 'Collate' کو سیٹ کیا ہے، تو پہلے ایک کاپی کے سبھی صفحات چھاپے جائیں گے، پھر دوسری کاپی کے چھاپے جائیں گے وغیرہ، یعنی ہر ایک کاپی الگ الگ سیٹ کی شکل میں چھاپی جائے گی۔ یہ آپشن نہ چننے پر ہر ایک صفحہ کی 4-4 کاپیاں ایک ساتھ چھاپی جائیں گی اور سیٹ آپ کو ہاتھ سے تیار کرنے ہوں گے۔

'Collate' آپشن چننے پر پرنٹر تھوڑا دھیما ہو جاتا ہے، لیکن جدید پینٹیم کمپیوٹروں میں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس ڈائیلاگ باکس میں دستیاب دیگر آپشن اتنے اہم نہیں ہیں۔ ان کا مطلب آپ خود سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

پرنٹ ڈائیلاگ باکس میں سبھی ضروری سیٹنگ کرنے اور پرنٹر میں کاغذ لگا کر آن لائن کرنے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے چھپائی شروع ہو جائے گی۔

چھپائی کو رد کرنا (Aborting Printing)

اگر کسی وجہ سے آپ دستاویز کی چھپائی بیچ میں ہی رد کرنا چاہتے ہیں، تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پرنٹر کو فوراً آف کر دیں۔ آف کرنے سے پرنٹر رک تو جائے گا، لیکن اس کی بفر میموری میں جتنا مواد پہنچ گیا ہے، وہ ختم نہیں ہوگا اور پرنٹر آن کرنے پر پھر سے چھپائی ہونے لگے گی۔ اس لیے پرنٹر کو آف رہنے دیجیے اور تب تک انتظار کیجیے،

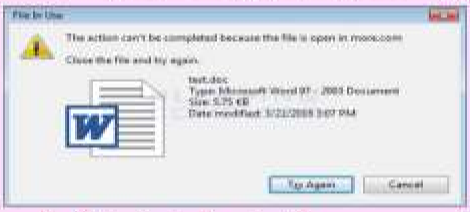

تصویر WD-2.8: چھپائی میں رکاوٹ کی اطلاع کا ڈائیلاگ باکس

جب تک آپ کی اسکرین پر تصویر WD-2.8 کی طرح اطلاع نہ آجائے کہ پرنٹر نہیں چل رہا ہے۔

اس اطلاع کے ڈائیلاگ باکس میں آپ کو دو بٹن دیے جاتے ہیں۔ 'Retry' اور 'Cancel' اگر آپ چھپائی پھر سے شروع کرانا چاہتے ہیں، تو 'Retry' بٹن کو کلک کرکے پرنٹر آن لائن کر دیجیے اور اگر چھپائی واقعی میں روک دینا چاہتے ہیں، تو 'Cancel' بٹن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر پرنٹر کا بفر خالی ہو جائے گا اور آپ نئے سر سے کوئی چھپائی کرا سکیں گے۔

چھپائی کا صفحہ دیکھنا (Print Preview)

ایم ایس-ورڈ میں 'Print Preview' نام کا ایک آپشن موجود ہے، جس سے کسی دستاویز کو چھاپنے سے پہلے ہی اسکرین پر دیکھا جا سکتا ہے کہ چھپنے پر وہ کیسی لگے گی۔ چھاپنے سے پہلے اس طرح دیکھ لینا ہمیشہ اچھا رہتا ہے، تاکہ اگر دستاویز میں حاشیے وغیرہ ٹھیک نہ ہوں، تو پہلے ہی ٹھیک کیا جا سکے۔ اس آپشن میں آپ ایک یا زیادہ صفحات ایک ساتھ بھی دیکھ سکتے ہیں، لیکن اگر زیادہ صفحات دیکھیں گے، تو صرف اندازہ ہی مل پائے

گا، اس لیے ایک بار میں ایک یا دو صفحات دیکھنا ہی اچھا رہتا ہے۔

اس آپشن کے لیے Print مینو کے 'Print Preview' بٹن کو (Quick Print کے نیچے) کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی کھلی ہوئی دستاویز کا موجودہ صفحہ آپ کی اسکرین پر تصویر WD-2.9 کی طرح چھوٹی شکل میں نظر آئے گا۔ اس میں ایک صفحہ اپنے حقیقی سائز کا 34%، یعنی تقریباً ایک تہائی سائز میں نظر آرہا ہے۔ اگر آپ ایک سے زیادہ صفحات ایک ساتھ دیکھیں گے، تو اور زیادہ چھوٹے نظر آئیں گے۔

سکتے ہیں۔

زوم (Zoom): اس آپشن کے ذریعے آپ اپنی دستاویز کو چھوٹا یا بڑا کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں دیے گئے Zoom بٹن کو کلک کرنے پر تصویر WD-2.10 کی طرح زوم ڈائیلاگ باکس کھلے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی دستاویز اس وقت اپنے حقیقی سائز کے 34% سائز میں ہے۔ آپ ریڈیو بٹنوں کے ذریعے اپنی دستاویز کو اس کے حقیقی سائز کے 200% (دوگنا)، 100% (حقیقی) 75% (تین چوتھائی) سائز دیکھ سکتے ہیں، یا Percent اسپن کنٹرول باکس کے ذریعے حسب ضرورت سائز سیٹ کرسکتے ہیں۔ دیگر آپشنز میں Page Width دینے پر کسی صفحہ کے بائیں اور دائیں دونوں کنارے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ یہ آپشن سیدھے Zoom مینو میں دیے گئے Page Width بٹن سے بھی چن سکتے ہیں۔

Zoom ڈائیلاگ باکس میں Text Width دینے پر کنارے نظر آتے ہیں۔ Whole Page چننے پر ایک پورا صفحہ نظر آتا ہے۔ Whole Page بٹن کا استعمال Zoom مینو میں دیے گئے One Page بٹن کی ہی طرح ہے۔ Zoom ڈائیلاگ باکس میں Many Pages چننے سے ساتھ ساتھ کے صفحے دکھائے جاتے ہیں۔ Zoom مینو میں Two Pages بٹن کی مدد سے آپ ساتھ ساتھ کے دو صفحے ایک ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ یاد رکھیں، Zooming کا چھپائی کے سائز پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

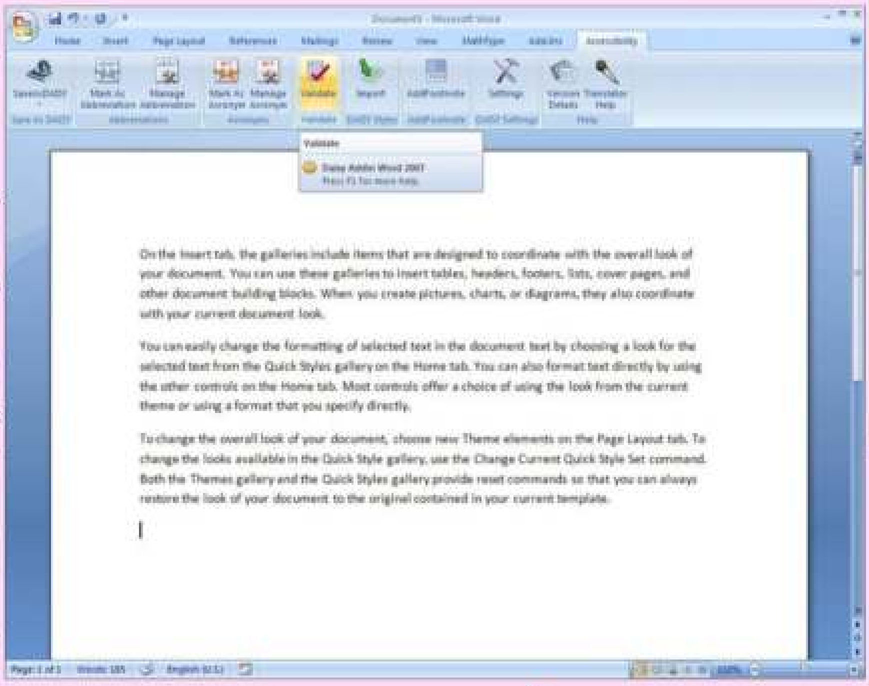

تصویر WD-2.9: پرنٹ پریویو

اس اسکرین میں ایک نیا ٹیب دکھائی دے رہا ہے، جسے پرنٹ پریویو ٹیب کہتے ہیں۔ اس ٹیب میں کئی آپشن اور بٹن ہوتے ہیں، جن کا استعمال درج ذیل ہے:

پرنٹ (Print): اس آپشن میں دیے گئے Print بٹن کے ذریعے آپ سیدھے دستاویز کو چھاپ سکتے ہیں اور Options بٹن کے ذریعے دستاویز میں ڈالی گئی خالی جگہوں (Spaces)، ٹیب، پیراگراف نشان وغیرہ دیکھ سکتے ہیں۔

پیج سیٹ اپ (Page Setup): اس آپشن میں دیے گئے بٹنوں کے ذریعے آپ دستاویز میں حاشیے اور اس کا سائز سیٹ کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ Page Orientation بھی سیٹ کرسکتے ہیں، یعنی دستاویز کو اپنی خواہش کے مطابق لمبائی یا چوڑائی میں چھاپ

پریویو (Preview): اس مینو میں کئی بٹن دیے گئے ہیں۔ Show Ruler میں صحیح کا نشان لگانے سے آپ اپنی ونڈو میں رولر دیکھ سکتے ہیں۔ Magnifier کو کلک کرنے سے آپ کسی بھی صفحہ کا کوئی بھی حصہ بڑے سائز میں دیکھ سکتے ہیں۔ ماؤس بٹن پھر سے کلک کرنے پر اسکرین اپنی سابقہ شکل میں آجاتی ہے۔ Shrink One Page بٹن سے آپ کی دستاویز کا پورا ٹیکسٹ ایک ہی صفحہ میں سیٹ ہوجاتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے ورڈ آپ کے الفاظ کا سائز (Font Size) چھوٹا کردیتا ہے۔ Next Page بٹن سے آپ موجودہ صفحہ سے اگلا اور Previous Page بٹن سے موجودہ صفحہ سے پچھلا صفحہ دیکھ سکتے ہیں۔ Close Print Preview کو کلک کرنے پر پرنٹ پریویو کی ونڈو غائب ہوجاتی ہے اور آپ پھر ایم ایس-ورڈ کی مین ونڈو میں آجاتے ہیں۔

اگر آپ دستاویز سے مطمئن ہیں، تو 'Close' بٹن کو کلک کرکے واپس مین ونڈو میں آکر دستاویز میں ضرور اصلاح کرنی چاہیے اور حاشیے وغیرہ ٹھیک کرنے چاہئیں۔ مطمئن ہونے پر 'Print' بٹن کو کلک کرکے آپ دستاویز چھاپ سکتے ہیں۔

تصویر WD-2.10: زوم ڈائیلاگ باکس

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015،
ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

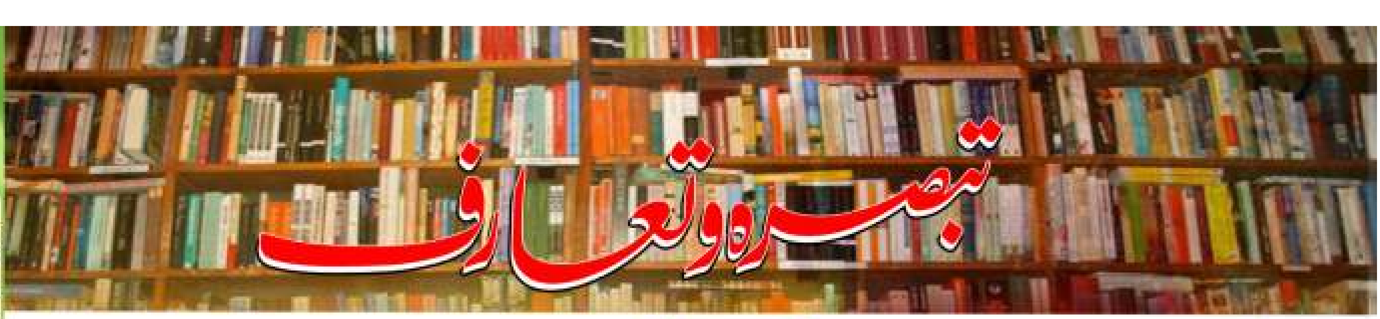

تبصرہ وتعارف

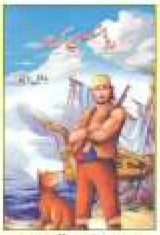

روبنسن کروسو

مصنف: ڈینیل ڈیفو، تلخیص: م۔ ندیم
صفحات: 80، قیمت: 20 روپے، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی
مبصر: معصوم زہرا، T-39، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

ڈینیل ڈیفو کے ناول کا مرکزی کردار رابنسن کروسو ہے۔ جس کی کہانی کو حقیقی تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ناول 1719 میں شائع ہوا اور اس قدر مقبول ہوا کہ سال بھر کے اندر اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے اور فروخت ہوئے۔ دراصل یہ ناول رابنسن کروسو کے سمندری سفر کی داستان ہے جو رابنسن کی 35 سالہ زندگی پر مبنی ہے۔ چونکہ اس میں سمندری سفر کی مفصل کہانی تحریر کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں سفرنامے جیسی صورتحال پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کا اصل نام The Life and Stronge Surprzing Adventures of Robinson Crusoe تھا۔ ناول کی اہمیت ومقبولیت کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے ایک سال کے اندر چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس ناول پر مبنی بہت سے ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ بعد میں جب فلموں کا دور شروع ہوا تو اس پر فلمیں بھی بنائی گئیں، ٹیلی ویژن کے لیے اس نے مواد فراہم کیا وغیرہ۔ اس ناول کی اہمیت کے مدنظر دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے کیے گئے۔

اردو والوں کے لیے اس ناول کے لیے کوشش م۔ ندیم نے کی اور اردو میں اس کی تلخیص لکھی۔ جو 1978 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ تب سے 2016 تک اس کے چار ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان شائع کر چکا ہے اور اب دو سال بعد اس کا پانچواں ایڈیشن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ روبنسن کروسو ناول میں ایک ایسے کردار کی ترجمانی کرتا ہے جو اپنی دھن کا پکا نظر آتا ہے۔ یکایک مصیبتوں کے آنے پر وہ خوفزدہ تو ہوتا ہے لیکن راہ فرار اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ ہمت وجواں مردی اور تدبیر سے کام لیتا ہے۔

رابنسن کروسو 1632 میں یارک شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ مالدار تاجر تھا اور چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر وکیل بنے، لیکن اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ دنیا کی سیر کرے۔ اس کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ وہ کسی جہاز کا کپتان بن کر الگ الگ ملکوں میں گھومتا پھرتا رہے۔ اس کے اہل خانہ کو جب اس بارے میں معلوم ہوا تو انھوں نے چاہا کہ اس کو اس سے باز رکھا جائے لیکن وہ اپنی لگن کا پکا تھا اور وہی کیا جو اس کا دل چاہتا تھا۔ ماں باپ کی باتوں کے برعکس اپنی پسند کے کاموں کو کرنے میں اسے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ رابنسن کروسو کے ناول کے ذریعہ کئی سبق ملتے ہیں۔ ناول رابنسن کروسو کی اردو تلخیص میں کچھ عنوانات کے تحت کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ان عنوانات میں میرا پہلا سفر، لٹیروں کی قید میں، ویران جزیرے میں، میں نے مکان بنایا اور غلہ اُگایا، میں نے بکریاں پالیں اور آدم خوروں سے لڑائی اور جمن کی رہائی کے تحت کہانی کو بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

میرا پہلا سفر میں رابنسن کے سمندری سفر کا آغاز اور سمندری لہروں کے درمیان سمندری طوفان میں پھنس جانے، جان پر ہر وقت منڈلاتے خطرے، موت کو قریب سے دیکھنے اور سمندری سفر کے تجربات کا مشاہدہ کیا ہے۔ ناول میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''وہ یکم ستمبر 1651 کا منحوس دن تھا جب میں جہاز پر سوار ہوا۔ یہاں سے میری مصیبتوں کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں، میں نے جیسی سخت مصیبتوں کا سامنا کیا۔ خدا وہ مصیبتیں کسی دشمن کو بھی نہ دے۔

ناول رابنسن کروسو کے اگلے حصے میں ڈینیل ڈیفو نے ویران جزیرے کی کہانی کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ سمندر کے بیچ ایک جزیرے میں ایک انسان پھنس کر کس طرح اپنے جینے کی راہ نکالتا ہے، ہر لمحہ پر خطر، ہر وقت جان پر بن آئی ہو، آدم خوروں کا خطرہ، جنگلی جانوروں کا خوف، بے یار ومددگار اکیلے غیر محفوظ نامعلوم مقام پر رہنا، یہ سب وہ باتیں ہیں جس کا احساس کر کے انسان سہم جاتا ہے۔ لیکن رابنسن یہاں ہرگز خوف نہیں کھاتا، بلکہ وہ مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ ناول نگار نے اپنے کردار رابنسن کو ان پریشانیوں کا ڈٹ کر اور ہمت اور ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ یعنی ناول کا مقصد واضح طور پر یہ ہے کہ پریشانیوں میں انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے مشکلوں سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ ناول میں یہی پیغام ملتا ہے۔ رابنسن کروسو کو اب اس جزیرے پر رہتے ہوئے 24 برس گذر چکے تھے۔ وہ یہاں کی ہر چیز سے مانوس ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کو یہ فکر بھی ستانے لگی تھی کہ جلد اب یہاں سے نکلا جائے لیکن اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکل پا رہی تھی۔ پھر بھی وہ ناامیدی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح اس نے چار سال اور دو مہینے مزید اس جزیرے پر گذارے۔ کل ملا کر 28 سال 2 ماہ 19 دن اس جزیرے پر رہ کر اور 35 سال اپنے وطن سے دور رہ کر وہ 1687 میں انگلستان واپس آیا۔

اس طرح دیکھا جائے تو ڈینیل ڈیفو کا یہ ناول جس کی اردو تلخیص م۔ ندیم نے لکھی ہے۔ اس ناول کا کردار رابنسن کروسو بہت زندہ دل نظر آتا ہے اور ساتھ ہی پڑھنے والوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ اس لیے ڈینیل ڈیفو کے ساتھ ساتھ م۔ ندیم کی کوشش لائق قدر ہے۔

کہکشاں کیا ہے

مصنف: انیس الحسن صدیقی

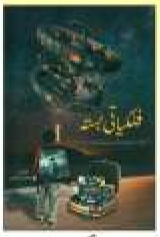

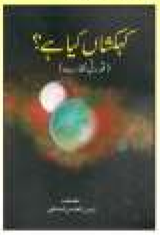

بچوں کے ادب میں فلکیات کے تعلق سے بہت کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ گرچہ دوسری زبانوں میں اس پر تفصیلی بات کی گئی ہے اور بطور کورس پڑھایا بھی جا رہا ہے۔ چوتھی، پانچویں کلاس تک کے بچوں کو اس بارے میں جانکاری بھی ہوتی ہے۔ اس لیے اردو میں

انیس صدیقی کی یہ کوشش منفرد درجہ رکھتی ہے۔ان کتابوں میں انیس صاحب نے زبان کو عام فہم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن موضوع کی ضرورت کے مطابق انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ کتاب 'کہکشاں کیا ہے' میں انھوں نے رنگین اور دلچسپ تصاویر کا استعمال کیا ہے۔ جو بچوں کی دلچسپی کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں فلکیات کے رموز کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ آج جب ہر سمت ٹکنالوجی کی آوازیں گونج رہی ہیں، اطلاعات کی بارش میں لوگ نہار رہے ہیں۔ کتاب کہکشاں کیا ہے؟ میں انیس الحسن صدیقی نے، کہکشاؤں کی درجہ بندی کیا ہے؟، کہکشاں آکاش گنگا کیا ہے؟، کہکشاں آکاش گنگا کا دل کیا ہے؟، ستاروں کے درمیان تعدد کیا ہے؟، ہمارا مقامی پڑوس کیا ہے؟، فرساؤس بازو کیا ہے؟، برج قوس کا بازو کیا ہے؟ کہکشاؤں کا جھرمٹ کیا ہے؟ اور عامل کہکشائیں کیا ہیں؟ وغیرہ جیسے فلکیاتی جیسے موضوعات پر لکھ کر بچوں کے لیے ایک اچھا مواد جمع کیا ہے۔ اس لیے ان کی یہ کتاب ادب اطفال اور خصوصاً سائنسی ادب کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔

65 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 60 روپے ہے۔

○

انیس الحسن صدیق کی کتاب 'چلو چاند پر' 33 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا عنوان 'چلو چاند پر' بچوں کے لیے نہایت دلچسپ ہے۔ کتاب کی قیمت 40 روپے رکھی گئی ہے۔

زمین و آسمان، چاند و ستارے، فلکیات پر کتابیں لانا قابل ستائش قدم ہے۔ انیس صدیقی کی کتابوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچوں کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے اس کو رنگین تصاویر کا استعمال کر کے اور بھی پرکشش بنا دیا گیا ہے۔ اردو میں خلا اور فلکیات پر ویسے ہی مواد کی بہت کمی ہے۔ انیس الحسن صدیقی نے اس جانب اچھی کوشش کی ہے۔ آج چاند اور ستاروں پر تحقیقات بہت وسیع دائرہ اختیار کر چکی ہیں اور روز بروز اس جانب نئی منزلوں کی تلاش کا سفر جاری ہے۔ بچوں اور طلبا اور طالبات کے لیے یہ کتابیں ایک اہم تحفہ ہیں۔ اس کے موضوعات بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ کتاب چلو چاند پر میں خلا کیا ہے؟، خلا تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے؟، خلائی زمانہ کی شروعات، چاند پر سب سے پہلی انسانی پہنچ، ہندوستان کی خلا میں پرواز، چاند پر ہندوستان کے بڑھتے قدم اور چاند پر ہندوستانی سائنسدانوں کے قیام کا منصوبہ وغیرہ جیسے اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ موضوعات کی سرخی ہی ان کی اہمیت کو بیان کر رہی ہے۔

خلا کیا ہے کے تحت مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ خلا تک کا سفر کس طرح کیا جا سکتا ہے اس تعلق سے مصنف نے روشنی ڈالتے ہوئے۔ خلا میں کس طرح پہنچا جا سکتا ہے کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ راکٹوں کو اڑانے کے لیے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ راکٹ اپنے اوپر اٹھتے ہوئے ایندھن کے ذریعہ اڑتا ہے۔ اس کا ایندھن جلانے پر بہت تیز دباؤ کے تحت اس میں گرما گرم گیسیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان گرما گرم گیسوں کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا ہے سوائے راکٹ کے پیندے میں ایک چھوٹے سے سوراخ میں بہت تیزی اور طاقت سے نکلتی ہوئی ہوا گرما گرم گیس راکٹ کو اوپر کی طرف دھکیلتی ہے۔ اس طرح ایک راکٹ آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز اڑتا ہے۔ یہ چند لائنیں بخوبی یہ بتا دیتی ہیں کہ کتاب کس قدر اہمیت کی حامل ہے جو نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ موضوعات میں بے جا طوالت بھی اس کتاب میں نظر نہیں آتی ہے۔ اس کتاب کے دو عنوانات چاند پر ہندوستان کے بڑھتے قدم اور چاند پر ہندوستانی سائنسدانوں کے قیام کا منصوبہ بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ یہ نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ ہر کسی کی معلومات میں اضافہ کے لیے اہم ہیں۔ مصنف نے موضوع کی مناسبت سے رنگین تصویر لگا کر موضوع کو اور بھی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں فرہنگ کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

40 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 33 روپے ہے۔

○

انیس الحسن صدیقی کی ایک اور اہم کوشش 'فلکیاتی بستہ' ہے۔ حالانکہ اس کا عنوان تھوڑا سا منفرد ہے اس لیے عجیب بھی لگ سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عنوان بڑا کارآمد ہے اور یہ بچوں کو سب سے زیادہ متاثر بھی کرے گا۔ فلکیاتی بستہ میں انیس الحسن صدیقی نے ایسی چیزوں کو جمع کر دیا ہے جن کو ردی چیزوں کے ذریعہ بنا کر عملی مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ انیس صاحب نے بڑی دلجمعی سے اس کتاب میں بچوں کی دلچسپ دنیا کو محض تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ زندگی میں اس کے کارآمد استعمال کی طرف موڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس فلکیاتی بستے کا مقصد بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ فلکیاتی بستہ میں ایسی چیزوں کو جگہ دی گئی ہے جو بے کار اور ردی چیزوں کے ذریعہ فلکیات سے متعلق کئی چیزوں کے بارے میں تجربہ کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں جن موضوعات کو جگہ دی گئی ہے ان پر مضامین پڑھنے کو مل جاتے ہیں لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچوں کی دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ طریقہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح ردی چیزوں کی مدد اس کا تجربہ کر کے پرکھا جا سکتا ہے۔

کتاب میں سورج کے سات رنگ، آسمان میں ستارے دن کے وقت کیوں نہیں نظر آتے، آسمان میں ستاروں بلندی اور اس کی پیمائش کس طرح کی جا سکتی ہے؟، ستارے کیا ہیں؟ اور ستاروں کے تارا منڈل کیا ہیں؟، دن، رات اور موسم کس طرح بنتے ہیں؟، کائنات کیا ہے؟، آسمان میں ستارے ٹمٹماتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں؟، کیا ستارے مرتے اور پیدا ہوتے ہیں، سیارے کیا ہیں اور ہمارے شمسی نظام میں اُن کا مقام کیا ہے؟، خرد سیارے، شہاب پارے، شہابیے، شہابی پتھر اور دُمدار سیارے کیا ہیں؟، گرہن کیا ہے، دھوپ گھڑی کیا ہے اور چاند کیا ہے جیسے عنوانات سے اس فلکیاتی بستہ کو بنایا گیا ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ بچے نہ صرف اس کو پڑھ کر اپنے علم میں اضافہ کر سکتے ہیں بلکہ کچھ عملی تجربات کر کے فلکیات کے اسرار و رموز اور سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کے متعلق بہتر طریقے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسے چاند گہن کے مکمل عمل کو ہم خود تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں اور اس کے مختلف مراحل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کتاب میں اس کے طریقۂ کار کو سمجھایا گیا ہے۔ انیس صاحب کی یہ کوشش قابل ستائش ہے، وہیں ان لوگوں کو بھی حوصلہ دیتی ہے جو کچھ کرنا چاہتے کچھ نئے موضوعات اور خصوصاً سائنسی موضوعات پر اپنے قلم کو رواں کرنا چاہتے ہیں۔

صفحات: 73، قیمت: 65 روپے، سنہ اشاعت: 2018

مبصر: مظہر حسنین
T-39، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

فکشن

نملوس کا گناہ اور دوسری کہانیاں

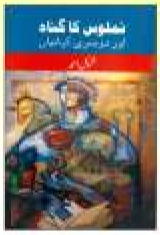

مصنف: شموئل احمد

صفحات: 255، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: متین اَچل پوری، مقابل مسجد اکبری چوک، بیابانی، اَچل پور 444806 ضلع امراوتی، مہاراشٹر

زیرِ نگاہ افسانوی مجموعے 'نملوس کا گناہ' میں کل 22 افسانے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں عرضِ ناشر کے بعد سوانحی خاکہ ہے جس میں ان کے ابتدائی حالات کی رواں جھلکیاں اور تخلیقات کی فہرست ملتی ہے۔ 'اور پھر بیاں اپنا' کے عنوان سے محمد غالب نشتر نے شموئل احمد کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے کے دوران اکثر ایسے مقامات آئے ہیں کہ قاری کو اپنے گردو پیش کی خبر نہیں ہوتی۔ آج کے دور کی تہہ در تہہ لپٹی ہنگامہ خیز زندگی، زندگی کے رنگا رنگ کوائف نیز پیچیدہ سیاسی اور سماجی مسائل کے شاخسانوں کی عکاسی شموئل احمد نے ایسی بے باکی سے کی ہے کہ بے باکانہ اظہار کا یہ طلسم ان کے فن کی پہچان بن گیا ہے۔

کتاب پڑھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ شموئل احمد نے زندگی کو فہم کی کٹھالی میں رکھ کر دل کی آنکھ سے گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے پنہاں اسرار جانے، اس کے پوشیدہ رنگ پہچانے... بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس رنگا رنگ زندگی کے تمام ہلکے، گہرے رنگ ان کے فکر و فن کی چادر میں خوب خوب جذب ہو گئے تب کہیں قلم کی نوک سے قطرہ قطرہ کہانی کی صورت میں ٹپکنے لگے۔

'باگ متی جب ہنستی ہے' اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے۔ کیرل میں آئے حالیہ غضبناک سیلاب کی طرح لوگ باگمتی یعنی سیلاب کی ناگہانی آفت کے سبب بھیانک تباہ کاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو انسان پر پڑی اس بپتا پر ابلیسی قوتیں کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔

افسانے 'منرل واٹر' میں جب وقت مرد و عورت کو غیر متوقع قربت کا موقع فراہم کرتا ہے تو انسانی فطرت کے ہنگامہ خیز بہاؤ کے سامنے بلندی اور پستی کا تصور صفر ہو کے رہ جاتا ہے۔ کرشن چندر کے افسانے 'مہر پچر' میں جب یہ حدیں گڈمڈ ہوتی ہیں تو مشترکہ آگ کا گولہ اپنے محور پر تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے۔ اور یہاں ریل کے فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں جب مذکورہ پستی (غریب مردانہ وجاہت) بلندی (ثروت مند نسوانی وقار) کا شکار ہوئی تو یک لخت ایک برتھ کی سواری دوسری برتھ پر آن پڑی۔ نتیجتاً کمپارٹمنٹ میں زلزلہ سا آ گیا۔ ایسا کہ صبح کی دہلیز پر محض منرل واٹر کی لبالب بھری بوتل خالی پڑی تھی۔

ایک زمانہ تھا کہ عورت کی سرشت میں نہاں جذبۂ جنس کے پیروں میں فطری شرم و حیا اور اخلاقی اقدار کی زنجیر ہوا کرتی تھی۔ اس حقیقت کی عکاسی اردو کے متعدد افسانوں میں ملتی ہے۔ آج انسانی تہذیب نے اپنا وہ ساتر لباس اتار پھینکا ہے، مغربی ہواؤں کے خمار کے طفیل آج جنسی ناآسودگی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانے بگولے، برف میں آگ، منرل واٹر، اونٹ، جھاگ، ظہار، سنگھاردان، کایا کلپ اور عنکبوت میں اس جنسی ناآسودگی کی عکاسی فنی دسترس کے ساتھ کی گئی ہے۔

افسانے 'نملوس کا گناہ' میں احمد ندیم قاسمی کے افسانے 'ڈاگ بنگلہ' جیسی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں افسانوں کے اختتام میں نمائشی دینداری کے پس پردہ دامن عفت و عصمت تار تار ہو کے رہ جاتا ہے، اسی قبیل کا ایک اور افسانہ 'اونٹ' ہے۔

شموئل احمد نے اپنے معاشرے کے کرداروں کے جنسی رجحانات کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیا۔ اور حاصل مطالعہ کو افسانے کے قالب میں ڈھال کر اپنی آرٹ گیلری میں آویزاں کر دیا لہٰذا قاری شخصیات کے ان شیڈز کو بغور دیکھتا ہے تو اس پر انسانی قلب میں نہاں اسرار کھلتے چلے جاتے ہیں۔ کہانی 'برف میں آگ' شادی سے قبل سلطانہ اور سلیمان کے دل میں دبی پہلی محبت کی چنگاری کے برسوں بعد بھڑک اٹھنے کا افسانوی اظہار ہے۔

'کاغذی پیرہن' ایک عمدہ افسانہ ہے جس میں وفا شعار عورت کی قربانیوں پر شوہر کے شکوک و شبہات کے دائرے سوالیہ نشان لگا بیٹھتے ہیں۔ 'مصری کی ڈلی' میں بیوی شوہر کے تئیں بے وفائی کا دروازہ وا کر کے اسے زندگی کے بھنور میں جھونک دیتی ہے۔ افسانہ 'جھاگ' میں شادی شدہ مرد مثبت انداز سے زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں بعد پہلی محبت کے دستیاب حسن کے گہن زدہ ہونے کا اسے احساس ہوتا ہے اور بیوی کی یاد اسے غلط راہ میں قدم بڑھانے سے روک لیتی ہے۔

گھر واپسی، عدم گناہ، نیم کا پیڑ اور سراب شموئل احمد کے خوبصورت افسانے ہیں جو معاشرتی اور سیاسی موضوعات کو لے کر لکھے گئے ہیں۔ افسانہ 'بدلتے رنگ' چیخوف کے افسانے 'ہجرت' کی یاد تازہ کرتا ہے۔

سنگھاردان بھی ایسے موضوع کو لے کر بُنا گیا وہ افسانہ ہے جس کا دنیائے ادب میں بڑا چرچا ہے۔ افسانے میں فسادات کے دوران برجوہن کے ذریعہ کوٹھے کی پامالی اور طوائف نسیم جان کے لٹنے کی داستان رقم ہے۔ اس فساد میں نسیم جان اپنے موروثی سنگھاردان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ یہ قلق اس کے لیے سوہان روح بن جاتا ہے۔ نتیجتاً برجوہن اور اس کے اہل خانہ غیر محسوس طریقے سے کوٹھے کی زندگی کے رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں۔ افسانے میں واقعات نگاری پر مضبوط پکڑ اور بیانیے کی مقناطیسیت قاری کی توجہ لمحہ بھر کے لیے بھی ہٹنے نہیں دیتی۔ لیکن واقعات کے تانے بانے سے مصنوعی پن کے جو رنگ جھلکنے لگتے ہیں اختتام تک پہنچتے پہنچتے افسانے کے مجموعی تاثر کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔

کتاب میں 'آخری سیڑھی کا مسافر' اور 'سبز رنگوں کا پیغمبر' کے عنوان سے دو علامتی افسانے شامل ہیں۔ بیانیے کی معنویت میں اضافے کی خاطر کچھ افسانوں میں علمِ نجوم سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں علم نجوم کا انطباق زیادہ ہوا ہے، وہاں کہانی کے فطری بہاؤ میں رخنے پڑے ہیں۔

افسانہ عنکبوت جدید ٹکنالوجی اور سائبر کلچر کے ہیجان انگیز شہوانی جذبات اور جنسی انارکی کے شعلہ بار موضوع پر لکھا گیا فکر انگیز افسانہ ہے۔ یہ ایسا افسانہ ہے جسے فطری اور غیر فطری شہوانی سرگرمیوں کی پے بہ پے تصوراتی ترسیل نے نہایت ہیجان انگیز بنا دیا ہے۔ ڈرامائی تکنیک کی آمیزش نے بیانیے کی تاثیر کو دوچند کیا ہے نیز ترکی بہ ترکی مکالموں نے فن پارہ میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ جدید کہانی خود کار زینے کی طرح قاری کو بے تحاشا اپنے اختتام کی طرف کشاں کشاں لیے جاتی ہے۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے جنسی انارکی کا ناسور اپنا تعفن خیز مواد الٹتا جاتا ہے۔ اس پر تعفن کیچڑ میں اپنی تہذیبی جڑوں پر کھڑی ایک 36 سالہ کنواری لڑکی شکیلہ، پاک دامن کنول کی کلی کی صورت سامنے آتی ہے۔ جو اپنے دل کے نہاں خانے میں دبی نکاح کی خواہش کا اظہار انٹرنیٹ کے برقی لبوں کے ذریعے کر بیٹھتی ہے۔ لیکن وہ اپنی حیا کے آبدار موتی کو لٹنے

نہیں دیتی۔ شہوت پرستی کی تیز آندھی میں چراغ عفت کی اس لو کا وجود افسانہ نگار کی مثبت سوچ کا آئینہ دار ہے۔ تاہم جیسا کہ ڈاکٹر رؤف خیر نے اپنی کتاب 'عزیز احمد قلم کار خوش قد' میں لکھا ہے کہ ہسٹیا مرون کی کہانی میں فرانس کی عیش پرست زندگی نظر آتی ہے۔ اس کے اکثر افسانے اس قدر عریاں ہیں کہ ادب اس کی عریانی کی تاب نہیں لاسکتا یہی وجہ ہے کہ عزیز احمد نے اس کے کسی افسانے کا ترجمہ ہی نہیں کیا کہ وہ اردو تہذیب سے کوسوں دور ہوتا۔ اردو ادب اسے برداشت نہیں کر پاتا''۔) اس کتاب کے افسانوں کے مطالعے کے دوران ایسا ہی خیال قاری کے دل میں بار ہا پیدا ہوتا ہے۔

کتاب کا ٹائٹل معنی خیز، کاغذ عمدہ اور طباعت روشن ہے۔

تحقیق و تنقید

سید سلیمان ندوی کا ترک وطن اسباب وحقائق

مصنف: ڈاکٹر سید ارشد اسلم

صفحات: 159، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر شاہنواز فیاض

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی لیاقت وبصیرت کسی سے مخفی نہیں۔ انھوں نے بیک وقت جتنے موضوعات پر کام کیا، وہ کسی بھی طور آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے اسلامیات کے حوالے سے بھی کام کیا، زبان وادب کے تعلق سے ان کے نظریات غیر معمولی ہیں۔ سندھ میں اردو زبان کی ابتدا کا نظریہ علامہ سید سلیمان ندوی ہی نے پیش کیا۔ علامہ شبلی کی تحریروں کو عام قارئین کے سامنے پیش کیا۔ سیرت نبی کو لکھ کر علامہ شبلی نعمانی کے ادھورے کام کو پورا کیا۔ جس رسالے کا خاکہ علامہ شبلی نعمانی نے بنایا تھا، معارف کی صورت میں ایک صدی قبل اس رسالے کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ ایک صدی سے زائد عرصے سے تواتر کے ساتھ نکل رہا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو علمی وقار عطا کیا۔ مولوی مسعود علی ندوی نے شبلی اکیڈمی کو ظاہری رنگ وروغن سے آراستہ وپیراستہ کیا۔ ایک علمی ادارہ کے لیے جن بنیادی چیزوں پر کام ہونا چاہیے، ان دونوں نے مل کر اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دیا۔ اس لیے دارالمصنفین کا تصور ان دونوں کی خدمات کے بغیر مکمل نہیں۔ انسان کے کام کرنے کے اپنے طریقے ہوتے ہیں اور ہر کسی کا اپنا اختصاص بھی ہوتا ہے۔

'سید سلیمان ندوی کا ترک وطن اسباب وحقائق' ڈاکٹر سید ارشد اسلم کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کو کل سات حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں سید سلیمان ندوی کی مختصر سوانح حیات بیان کی گئی ہے، دوسرا حصہ سید سلیمان ندوی کی علمی وادبی خدمات کے موضوع پر ہے، تیسرے حصے میں سید سلیمان ندوی کے ترک وطن کے سلسلے میں مختلف علما کے نظریات پیش کیے گئے ہیں، جن میں شاہ معین الدین احمد ندوی، عبداللطیف اعظمی، سید محمد ہاشم، غلام محمد، ابوعلی اثر اور مولانا وحید الدین خاں کے نظریات شامل ہیں۔ چوتھا حصہ دارالمصنفین سے سید صاحب کیوں علیحدہ ہوئے: 'فاران' کراچی، کے عنوان سے ہے۔ پانچواں حصہ حفیظ الحق دسنوی کا سید سلیمان ندوی سے براہ راست انٹرویو کے عنوان سے ہے۔ چھٹا حصہ سید سلیمان ندوی کا ترک وطن اور مصدقہ حقائق (ایک غیر مطبوعہ خط کی روشنی میں) کے عنوان سے ہے۔ ساتویں حصے میں مذکورہ خط کی عکسی تحریر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کلیم عاجز کا مضمون 'اس بحر کی تہہ سے نکلتا ہے کیا' کے عنوان سے ہے، احوال واقعی علیم اللہ حالی نے لکھا ہے، حرف چند ڈاکٹر منظر حسین کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سید ارشد اسلم نے پیش لفظ لکھا ہے۔

یہ کتاب ایک اہم موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ آخر سید سلیمان ندوی نے وطن عزیز کو کیوں چھوڑا؟ جبکہ پورا ہندوستان ان کے علم کا قدر دان تھا اور اب بھی ہے۔ اس کے پیچھے جو وجہ تھی اس کا اظہار تو کیا گیا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکے کے ایک رخ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مسعود علی ندوی نے بھی دارالمصنفین کے قیام اور اس کو ترقی دینے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

مصنف کتاب ڈاکٹر سید ارشد اسلم اس موضوع کو اور بھی تفصیل سے پیش کر سکتے تھے۔ جہاں مولوی مسعود علی ندوی کو ایک طرح سے سید سلیمان ندوی کا حریف بنا کر پیش کیا گیا ہے، اسے کسی اور بھی طرح سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس پوری کتاب میں کہیں بھی مولوی مسعود ندوی کا موقف رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی اس کتاب کا سب سے کمزور حصہ کہا جا سکتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ سید ارشد اسلم کسی حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب لکھنے سے پہلے نتیجہ اخذ کر لیا تھا، اور اسی کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے حوالے پیش کیے ہیں۔

زیر نظر کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم کتاب ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر مزید لکھا جا سکتا ہے۔ جس مقصد کے لیے ڈاکٹر سید ارشد اسلم نے محنت کی اور بڑی محنت سے چیزوں کو اکٹھا کیا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس تعلق سے مزید چیزیں سامنے لائی جائیں۔ مولوی مسعود علی ندوی کے تعلق سے جو کچھ لکھا گیا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس تعلق سے جو ان کے معروضات تھے، اسے بھی پیش کیا جاتا۔ اس تعلق سے اصل متن کی روشنی میں اپنے معروضات پیش کیے جائیں، تاکہ وہ زیادہ معاون ثابت ہو۔ چونکہ سید سلیمان ندوی دارالمصنفین سے بھوپال گئے، اس کے بعد ترک وطن کا معاملہ آتا ہے۔ دارالمصنفین سے علیحدگی کا مقصد وہی تھا، جو مصنف نے لکھا ہے، یا کوئی اور بات تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ اس اعتبار سے تشنہ ہے۔

سید سلیمان ندوی کا ترک وطن اسباب وحقائق، اس طرح کی کتابیں عام طور پر محققین کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام بہت عجلت میں کیا گیا ہے۔ اسی لیے بہت سی جگہوں پر پروف ریڈنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس کمی سے یقیناً کتاب کی قرات میں بہت الجھن ہوتی ہے۔ کتاب کی قیمت بھی زیادہ ہے۔ ایسے میں جب کہ کتاب کی اشاعت کے لیے کسی ادارہ سے مالی تعاون لیا گیا ہو۔ ظاہری صورت یقیناً دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کی اگلے ایڈیشن میں مصنف کتاب کو اور بہتر طریقے سے پیش کریں گے۔ اس طرح کے موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب کسی تحفے سے کم نہیں۔ امید ہے کہ اردو حلقوں میں اس کتاب کا استقبال کیا جائے گا۔

ڈاکٹرعزیزاللہ شیرانی شخصیت اورادبی خدمات

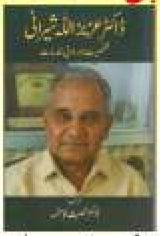

مرتب: ڈاکٹرنصرت فاطمہ
صفحات: 380، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: اپلائڈ بکس، نئی دہلی
مبصر: اسعداللہ، 1444/45،
فیاض گنج، آزاد مارکٹ، اولڈ دہلی۔6

زیرتبصرہ کتاب 'ڈاکٹرعزیزاللہ شیرانی شخصیت اورادبی خدمات' محترمہ نصرت فاطمہ کی مرتب کردہ ہے۔ جس میں عزیزاللہ صاحب کی تمام ادبی خدمات کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ انتہائی مبسوط اور مدلل ہے۔ ایک طرح سے یہ مقدمہ کتاب کا خلاصہ ہے۔ فاضل مرتبہ نے اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کرکے ذیلی عنوان کے تحت عزیز صاحب کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مختلف قلمکاروں نے اپنا قلمی تعاون پیش کیا ہے کسی قلمکار نے عزیز صاحب کی سوانح وشخصیت پر بحث کی ہے تو کسی نے بحیثیت نقاد جب کہ کسی نے ادبیات راجستھان کو اپنے قلم کا محور بنایا ہے اسی طرح کسی نے کاوش قلم اور ادبی جائزے کے تناظر میں آپ کی شخصیت کو پرکھنے کی کوشش کی ہے کچھ قلمکار ایسے بھی ہیں جنھوں نے تبصراتی وتجزیاتی تناظر میں دیکھا ہے تو کسی نے ان کی کہانیوں اور افسانوں میں موجودہ معاشرہ کو جانچنے کی سعی کی ہے۔

کتاب کے مقدمہ میں محترمہ نصرت فاطمہ لکھتی ہیں:

''ٹونک کے فنکار آج بھی اردو شعروادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں انھیں حضرات میں ڈاکٹر عزیزاللہ شیرانی بھی شامل ہیں جنھوں نے اردو کو اپنا شعار سمجھا اور اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں''

جب کہ حرف چند کے تحت ڈاکٹر ابراراحمد فائق کچھ یوں گویا ہیں:

''ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تحریروتصنیف کی صلاحیت ان میں پیدائشی طور پر ودیعت کی گئی ہے طویل عرصے سے ملک کے موقر ادبی رسائل وجرائد میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں مختلف نثری اصناف پر تحقیق وتنقید کے موضوعات پر انہوں نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے''۔

بقول پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ''شعروادب کے حوالے سے ان کا ذہن کلاسکی روایت کا پابند معلوم ہوتا ہے''۔

پہلے باب میں سوانح وشخصیت کے تحت کل بیس مضامین ہیں جن میں تین تہنیتی نظمیں دو انٹرویو جب کہ دو مضامین خاکہ نما ہیں۔ ڈاکٹر عمر جہاں آپ کے علمی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتی ہیں ''ترجمہ نگاری پر آپ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور کئی ہندی کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں نصابی کتب بھی آپ نے لکھی ہے''۔ جب کہ آپ کی شخصیت میں امداد علی خاں صاحب کو ایک آفتاب ادب اور ماہتاب تحقیق وتفہیم کی شخصیت دکھائی دیتی ہے لکھتے ہیں ''ڈاکٹر شیرانی کی تبصرہ نگاری ان کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی جستجو کو ظاہر کرتی ہے اس موضوع پر ان کی تین کتابیں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں کتابوں کے عنوانات اس طرح سے ہیں (1) ادبی جائزے (2) تحقیق وتفہیم (3) تبصراتی تجزیے''۔

دوسرے باب میں عزیز صاحب کو بحیثیت نقادومحقق کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ کتاب میں انیسویں صدی تا بیسویں صدی راجستھان کی مختلف ریاستوں اور شہروں سے نکلنے والے اخبارات کی فہرست مع سنہ اجرا مرتب کی گئی ہے۔'' اس کے علاوہ اس کتاب میں ٹونک کے معاصر شعراء کا ذیلی عنوان قائم کرکے قابل مطالعہ بحث کی گئی ہے۔ جب کہ کاوش قلم، ادبی جائزے اور تحقیق وتفہیم کے تناظر میں تمام فاضل قلمکاروں نے بہترین نقد وتبصرہ پیش کیا ہے۔ ان تمام مضامین کا مطالعہ قاری کے لیے بے حد دلچسپ اور مفید ہوگا۔

تیسرا باب کچھ زیادہ ہی مبسوط ہے اس باب میں عزیز صاحب کو بحیثیت افسانہ نگار کے پرکھا گیا ہے اور ان کے افسانوی مجموعہ 'سنگ زر' کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ جب کہ بعض قلمکاروں نے 'زخموں کے پھول' اور دیگر افسانوں اور کہانیوں ساتھ ان کے تراجم پر بھی بات کی ہے۔

پانچویں باب میں عزیز صاحب کی بحیثیت ماہر تعلیم ادبی اور علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے بقول ڈاکٹر خلیق انجم ''اس کتاب میں دیے گئے اعداد وشمار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غیر معمولی محنت سے کام لیا ہے''۔ ان کے ذریعہ لکھی گئی کتاب 'اردو درس وتدریس' پر مختلف قلمکاروں نے اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے نوازا ہے اور یہ تمام مضامین کتاب کی اہمیت وافادیت میں چار چاند لگاتے ہیں۔

کتاب کے آخری باب میں عزیز اللہ صاحب کو بحیثیت شاعر متعارف کرایا گیا ہے ڈاکٹر نصرت فاطمہ ان کی نظموں کا عنوان گنواتے ہوئے لکھتی ہیں ''ڈاکٹر شیرانی نے ان نظموں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب پر بھی خوب نظمیں کہی ہیں جو قبول عام ہوئیں۔'' آخر میں ان کی زندگی کی چند جھلکیاں تصاویر کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ کتاب کی فاضل مرتبہ مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت ہی عرق ریزی اور دلجمعی سے اس کتاب کو ترتیب دیا اور عزیز صاحب جیسی ہمہ جہت شخصیت کو اہل ادب سے مزید متعارف کرایا۔ کتاب کی طباعت اور سرورق عمدہ ہے یہ الگ بات ہے کہ کتاب کی قیمت بہت زیادہ رکھی گئی ہے۔ امید ہے اس بابت آئندہ ایڈیشن میں دھیان دیا جائے گا۔

سب رس

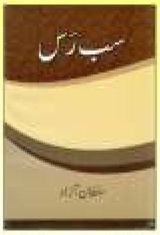

مصنف وناشر: سلطان آزاد
صفحات: 128، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2017
مبصر: عبداللہ مدنی
214 مہاندی ہاسٹل، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی 67

ریاست بہار سے تعلق رکھنے والے سلطان آزاد ایک معروف محقق ونقاد اور تذکرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ تخلیق کار بھی ہیں۔ موصوف کو ابتدا سے ہی اردو نثر نگاری سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کی مختلف نثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، خواہ وہ ریڈیائی ڈرامہ ہو یا فیچر، افسانہ ہو یا افسانچہ، طنز و مزاح ہو یا ادب اطفال، تحقیق وتنقید ہو یا رپورتاژ، غرض کہ ہر میدان میں وہ اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ مذکورہ اصناف کے حوالے سے ان کی نصف درجن سے زائد کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آچکی ہیں، جن میں سے ان کی دو کتابوں 'دبستان عظیم آباد' اور 'بہار میں اردو طنز وظرافت' نے آزاد کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔

زیرتبصرہ کتاب 'سب رس' آزاد کی انھیں کاوشوں کی ایک انوکھی کڑی ہے۔ یہ کتاب ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کے کسی نہ کسی رسالے یا

اخبار میں شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ مجموعے کو مصنف نے کل سات حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ ڈرامے کا ہے جس میں انھوں نے اپنے دو ڈرامے (1) 'قصہ ایک شاعر کا' اور (2) 'نکتہ چینی' کو شامل کیا ہے۔ یہ دونوں ڈرامے مزاحیہ انداز کے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو پٹنہ سے اردو پروگرام کے تحت نشر بھی ہو چکے ہیں۔ پہلا ڈرامہ اسٹیج ہونے کے علاوہ "ہوامحل" ممبئی سے بھی دوبار نشر ہو چکا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان 'فیچر' ہے۔ اس میں تین شخصیتوں کے حوالے سے درج ذیل عنوانات پر فیچرز پیش کیے گئے ہیں۔ (1) لیلٰی آزادی کا مجنوں: پیر علی، (2) ساحر۔ ایک فیچر اور (3) جمیل مظہری۔ ایک فیچر۔ یہ تینوں فیچرز انوکھے انداز کے ہیں، جن سے مصنف کے انداز بیان اور طرز نگارش کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ مصنف نے بھاری بھرکم اور دقیق الفاظ سے گریز کرتے ہوئے نہایت سادہ الفاظ اور عمدہ تعبیرات کے استعمال سے فیچرز کو آراستہ کیا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے کا عنوان 'رپورتاژ' ہے۔ اس حصے میں درج ذیل عنوانات کے تحت کل سات رپورتاژ شامل کیے گئے ہیں جن میں نعتیہ، غیر نعتیہ اور علمی نشستوں کی روداد بیان کی گئی ہے، جو حسب ذیل ہیں (1) انجمن محمدیہ کا ایک یادگار نعتیہ مشاعرہ، (2) انجمن محمدیہ پٹنہ سٹی کا نعتیہ مشاعرہ، (3) پٹنہ سٹی کی ایک کامیاب شعری نشست، (4) عظیم آباد کی تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ: میر اردو کو عظیم الشان استقبالیہ، (5) حلقۂ احباب، آرہ کا نعتیہ مشاعرہ، (6) عظیم آباد کی ایک یادگار طرحی نشست اور (7) شہباز پور، کانٹی (مظفر پور) میں شاندار اور تاریخ ساز معراج کانفرنس۔ نعتیہ مشاعرہ اور طرحی نشست کی رپورٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر شاعر کے کلام سے نمونے کے طور پر دو دو اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں تاکہ قاری شعرا کے کلام سے واقف ہو کر اس رپورتاژ سے محظوظ ہو سکے۔

کتاب کے چوتھے حصے کو 'خاکے' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس میں دو خاکے ہیں ایک 'شاعر گر استاذ' اور دوسرا 'چچا کی کارگذاریاں'۔ یہ دونوں خاکے بہار کے معروف شاعر بالترتیب رمز عظیم آبادی اور مزاحیہ شاعر و نثر نگار ہاشم عظیم آبادی کے ہیں۔ مذکورہ خاکوں میں زبان و بیان کے اظہار میں ایسا دلکش اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس سے قاری کا تجسس اور اس کی دلچسپی خاکے کے کردار سے متعارف ہونے کے لیے مزید بڑھتی جاتی ہے۔ کرداروں کی ایسی عمدہ پیکر تراشی اور مرقع سازی کی گئی ہے جس سے ان کی ذاتی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر اجمالی مگر تسلی بخش روشنی پڑتی ہے۔

صاحب تصنیف نے کتاب کے پانچویں حصے میں ایک انٹرویو پیش کیا ہے جس کو 'روبرو' کے نام سے معنون کیا ہے۔ یہ نادم بلخی سے لیا گیا ایک ادبی انٹرویو ہے جو ایک گمنام شخصیت اور اس کے ادبی نظریات کو مختصراً جاننے میں معاون ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں موصوف نے اپنے طبع شدہ افسانوی مجموعے 'آئینہ آج کا' سے متعلق اہل علم اور دانشوروں کے تاثرات و خیالات کو شامل کیا ہے۔

کتاب کا سرورق نہایت سادہ اور دلکش ہے لیکن ضخامت کے لحاظ سے اس کی قیمت 350 روپے ادب کے طالب علموں کے لیے یقیناً زیادہ ہے۔ پوری کتاب پر نظر ڈالنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ سلطان آزاد کا 'سب رس' حقیقت میں سب رس ہے۔ یقیناً یہ اسم با مسمّٰی مجموعہ ہے کیوں کہ موضوعات و مضامین کے تنوع، رنگارنگی اور بوقلمونی کی وجہ سے یہ باذوق قاری کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

خاکے

ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا

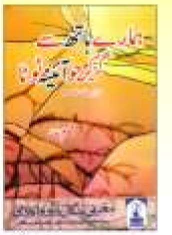

مصنف: قیوم بدر

صفحات: 112، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی

مبصر: ظفر عالم

F-41، ٹاپ فلور، فلیٹ نمبر 402، نفیس روڈ، بٹلہ ہاؤس، دہلی

اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش متقدمین کے تذکروں میں جا بہ جا دکھائی دیتے ہیں۔ اس ضمن میں میر، مصحفی، شیفتہ، قدرت اللہ قاسم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات اور دربار اکبری' انشاء اللہ خاں کی کتاب 'دریائے لطافت' میں بھی خاکوں کی مرقع نگاری واضح ہوتی ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کو منظم طریقے سے پیش کرنے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ اور مولوی عبدالحق کا نام سرفہرست ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر فرحت اللہ بیگ نے خاکے کی ابتدا کی۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ 'چند ہم عصر' کے نام سے شائع ہو کر قبول عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہ نے بڑے دلچسپ انداز سے خاکہ نگاری کے فن کو بام عروج تک پہنچایا۔

مذکورہ سلسلے کی ایک کڑی 'قیوم بدر' کی کتاب 'ہمارے ہاتھ سے گر کر جو آئینہ ٹوٹا' مختلف مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے، جو پچیس مضامین پر محیط ہے۔ کتاب میں شامل پہلا مضمون 'میرے استاد: حشم الرمضان صاحب' میں قیوم بدر نے اپنے استاذ حشم الرمضان کا ایک بہترین خاکہ پیش کیا ہے۔ مطالعہ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ خاکہ نگاری کی طرف رغبت دلانے میں موصوف کے استاذ کا اہم رول رہا ہے۔ 'اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا......' میں مصنف نے اپنے عزیز دوست خلش امتیازی کا خاکہ بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ قیوم بدر کا وسیع حلقہ طنز و مزاح کا خوگر ہے۔ 'ادب کا مرد مومن: نوشاد مومن' میں نوشاد صاحب کی مصروف ترین بینک کی نوکری ہونے کے باوجود ان کی ادب سے والہانہ دلچسپی کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'صابر اقبال: ایک بھاری بھرکم شخصیت' موصوف نے مضمون کے ابتدا میں اپنے دیرینہ دوست صابر اقبال کا بڑے ہی لطیف انداز سے تعارف کرایا ہے، واقعی قابل تعریف ہے، لکھتے ہیں:

"صابر اقبال کو جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ انھیں میرے بھاری بھرکم کہنے پر چونکیں گے۔ صابر اقبال کبھی بھی صحت کے معاملے میں بھاری بھرکم نہیں رہے۔ کمسنی میں شعر و ادب کا روگ لگ گیا تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ فکر شعر کے سبب سوکھ کے کانٹا ہو گئے ہیں لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کی حیثیت ادب میں بھاری بھرکم ہو گئی ہے۔ سچ ہے سونا آگ میں تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ صابر اقبال کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہالی ووڈ اداکار 'چارلی' کی یاد آجاتی ہے۔ وہی قد وہی ڈیل ڈول اب تو ہاتھ میں چھڑی بھی آگئی ہے فرق اتنا ہے کہ چارلی کی طرح صابر اقبال کی مونچھیں نہیں ہیں۔"

مذکورہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف اپنے فن کو برتنے میں بخوبی ماہر ہے۔

'خورشید اقبال: سائنس اور ادب کا پل' میں خورشید اقبال کی ادب نواز، زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'میرا پہلا قاری: الیاس وارثی' میں مصنف نے بچپن کے دوست الیاس وارثی کے ساتھ گزارے ہوئے اوقات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ 'اردو ادب پر حشمت اللہ صاحب کی پولسیانہ نظر' پولس محکمے سے وابستہ حشمت اللہ کی ادبی دلچسپی کو ایک دلچسپ اظہار بیان کے ذریعہ اجاگر کیا گیا ہے۔ 'جاوید دانش کی حماقتیں' مشہور ڈرامہ نگار جاوید دانش کا خاکہ ہے جس میں مصنف نے جاوید دانش کی حیات کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ مضمون جاوید دانش سے زیادہ خود مصنف کا خاکہ معلوم ہوتا ہے۔ 'منور رانا: ایک نڈر اور بے باک قلم کار' منور رانا موجودہ دور کے شاعروں میں ایک ممتاز نام ہے۔ ان کی شاعری عام فہم اور سامعین میں مقبول عام کا درجہ رکھتی ہے۔ قیوم بدر نے ان کے بے باکانہ لہجے کو واضح کرنے کی سعی کی ہے ساتھ ہی ان کی ادبی باریکیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ 'ف س اعجاز کا نمبر' ایک ایسی ادبی شخصیت کا خاکہ ہے جو کئی دہائیوں سے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہاں مصنف نے 'ف س اعجاز' کی کاوشوں کو اپنے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ راقم الحروف کو موصوف کی ایک کتاب 'ارتکاز' پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں قیوم بدر کا یہ جملہ ''کچھ شخصیتیں اہم ہوتی ہیں ان میں ف س اعجاز بھی شامل ہیں۔ شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، مضمون نگار ہیں، مبصر ہیں، مترجم ہیں، نقاد ہیں' صد فیصد سچائی پر مبنی ہے۔

کتاب میں مذکورہ اشخاص کے علاوہ دوسری اہم شخصیتوں کے خاکے جیسے ہوئے تم دوست جن کے، استادوں کے استاد حضرت قیصر شمیم، ریت اڑانے والا: زماں قاسمی، بلال حسن کی بلالی شخصیت، ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ، یاد جب آتی ہے تیری، سرر راحتی کی راست گوئی، رؤف خوشتر کی شوخیاں، ڈاکٹر منصور عالم کے نسخے، شاعر باکمال احمد کمال، منور رشید: ایک زندہ دل انسان، کلیجہ چاہیے پتھر کا دوستی کے لیے، ڈاکٹر اقبال جاوید: ڈرامہ کا آدمی ہیں، ڈراما باز نہیں، سائنس اور ادب کا سنگم: عبدالودود انصاری شامل ہیں۔ قیوم بدر کی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کی سرزمین سے وابستہ مصنفین اردو کا گیسو سنوارنے میں پوری دنیا میں مصروف عمل ہیں۔ مصنف کا یہ بہت بڑا اعجاز ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ خاکوں کے ذریعہ کئی گم نام ادبی شخصیتوں کے کارناموں کی نقاب کشائی کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

طب

آنکھیں: قدرت کا بہترین عطیہ

مصنف: ڈاکٹر ابوطالب انصاری

صفحات: 242، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: انوار الہدیٰ

مبصر: عمران عراقی (ریسرچ اسکالر) شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

اردو زبان میں ادبی کتابوں کی کوئی کمی نہیں البتہ علمی کتابیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کی تعداد معدودے چند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں امسال جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ڈاکٹر ابوطالب انصاری کی کتاب 'آنکھیں: قدرت کا بہترین عطیہ' اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس کتاب کے ذریعے اردو کا ایک عام قاری بھی آنکھوں کے متعلق بے حد اہم اور دلچسپ طبی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ شعبہ طب سے متعلق یہ ایک علمی کتاب ہے، جو انسانی جسم کے ایک بے حد اہم حصے 'آنکھوں' پر تفصیلی گفتگو کرتی ہے۔ البتہ انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات میں بھی جسم کا یہ حصہ اسی قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اس تعلق سے ذرا سی غفلت یا بے احتیاطی، اس کی پوری زندگی کو بے رونق کر سکتی ہے۔ یہ نہ صرف جسم کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ یہ اتنا ہی نازک اور حساس بھی ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے خدا نے دو مضبوط پلکیں بھی دی ہیں۔ آنکھوں کو انسانی شخصیت کا آئینہ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ وقت میں انسانی طرز زندگی کچھ اس طرح کی ہو گئی ہے کہ آئے دن اس نازک اور حساس حصے کو تکلف جھیلنا پڑتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس تعلق سے احتیاط سے کام لیا جائے۔ ان تمام امور کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ہی ڈاکٹر ابوطالب انصاری نے اپنی اس کتاب میں آنکھوں کی ساخت اور افعال کے علاوہ اس کے مختلف حصوں کے امراض اور اس کے وجوہات، علاج، ان پر دواؤں کے اثرات یا دیگر امراض کے آنکھوں پر اثرات، جیسے اہم موضوعات کو بہت ہی سادہ اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں آنکھوں کی آرائش کے متعلق بھی کئی اہم پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثلاً سرمہ، کاجل یا مختلف قسم کے میک اپ جہاں آنکھوں کی آرائش کے لیے استعمال میں لائے جاتے ہیں، وہیں ان سے ''آنکھوں میں الرجی کی شکایت بھی کس طرح ہو جاتی ہے اور پلکوں میں موجود پنکٹا لیکریملس (Puncta lacrimalia) نامی سوراخ بند ہو جانے سے آنکھوں کے مختلف امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔'' اس لیے ضروری ہے کہ آنکھوں کی آرائش میں بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اسی نسبت سے ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا عنوان ہی 'آنکھیں قدرت کا بہترین عطیہ' رکھا ہے۔

ڈاکٹر ابوطالب انصاری پیشے سے ڈاکٹر ہیں لیکن ادب کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی ذوق کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس شعبہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ جس کے اعتراف میں انھیں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انعام سے بھی نوازہ گیا ہے۔ تاریخ اور شخصیت سازی سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی تازہ تر تصنیف 'آنکھیں قدرت کا بہترین عطیہ' شعبہ طب سے متعلق اردو زبان میں ایک علمی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

دیکھا جائے تو شعبہ طب کے متعلق استعمال کی جانے والی اصطلاحیں یا ترکیبیں بے حد پیچیدہ اور عوام کی فہم سے بالاتر چیز معلوم ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ تمام اصطلاحیں اور ترکیبیں بشمول امراض کے نام، طریقہ علاج اور تدارک واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کے متعلق دلچسپ حقائق کو بھی انہوں نے پیش کیا ہے۔ مثلاً اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ رونے والے شخص کی آنکھوں کے علاوہ ناک سے بھی پانی جاری ہو جاتا ہے۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں روتے وقت کسی انسان کی آنکھوں کے ساتھ اس کی ناک بھی گیلی ہو جاتی ہے؟ اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''آنسوؤں کے غدود (Lacrimal glands) بادام کے دانے کے برابر ہوتے ہیں۔ ان سے آنسو مسلسل چھوٹی چھوٹی نالیوں سے نکل کر آنکھوں پر گرتے رہتے ہیں، جس سے آنکھیں تر رہتی ہیں۔ یہ اتنی معمولی مقدار میں ہوتے ہیں کہ آنکھوں کو تر کرنے کے بعد بقیہ مقدار

بخارات بن کر اڑ جاتی ہے۔ اگر اس کی مقدار زیادہ ہو تو یہ آنکھوں کے اندرونی کنارے پر موجود سوراخ سے گزر کر ایک تھیلی میں جمع ہوتے ہیں پھر وہاں سے ایک نالی کے ذریعے ناک میں چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رونے والے شخص کی آنکھوں کے علاوہ ناک سے بھی پانی بہتا ہے۔" (ص16)

کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں آنکھوں کے متعلق مختلف امراض یا اس کے علاج کو عمر اور صحت کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جو خاص بات ہے وہ یہ کہ کتاب میں ایسے کئی نسخوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کے استعمال سے آنکھوں کے متعدد امراض سے بچا جا سکتا ہے یا بینائی کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ آنکھوں کے متعلق ایسی کئی ورزش اور تھیراپی بھی استعمال میں لائی جاتی ہیں جن کی مدد سے وژن اسکل (Vision Skill) میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر آنکھوں کی ورزش تو کوئی بھی شخص خود سے گھر میں کر سکتا ہے لیکن وژن تھیراپی ماہر آپٹومیٹرسٹ (Optometrist) کی نگرانی میں ہی لینا چاہیے۔

بلا شبہ مذکورہ کتاب علمی اعتبار سے اردو کے عام قارئین کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ کتاب جس سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔ سرورق بھی نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب۔ لیکن کتاب میں جگہ بہ جگہ پروف ریڈنگ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ بہر حال پروف ریڈنگ ایک صبر آزما کام ہے۔ ممکن ہے ایک دو جگہ رہ جائے لیکن جب اس کی مقدار زیادہ ہو تو قاری پر گراں گزرتی ہے۔ اس طرح کی علمی کتاب کے کمپوزر کو بھی کمپوز ہونے والے مواد سے کم از کم بنیادی حد تک تو معلومات حاصل کر ہی لینا چاہیے تاکہ کمپوزنگ میں دشواری پیش نہ آئے۔ اس کتاب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ دوران مطالعہ کئی مقامات پر قاری کو جملوں کی ساخت اور ترتیب خود ہی کرنا پڑتی ہے۔ کئی صفحات پر جملے کہیں کے کہیں پیوست ہو گئے ہیں۔ تیسری اور اہم بات یہ کہ کتاب میں کئی مقامات پر جملے کی ساخت کے مطابق الفاظ کا انتخاب غلط کر لیا گیا ہے جو واقعی غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہتر حال ایک اچھی اور علمی کتاب کے لیے ڈاکٹر ابو طالب انصاری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اردو زبان میں شعبہ طب سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کے لیے ایک بہترین اور بنیادی کتاب عنایت کی ہے۔

شاعری

غزل ساز

شاعر: حافظ کرناٹکی

صفحات: 180، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 110006

مبصرہ: عالیہ خانم، D-31، لین نمبر 1، نور الٰہی نارتھ گھونڈہ، دہلی 53

عہد ولی دکنی سے تاحال اردو غزل نے اتنے رنگ تبدیل کیے ہیں کہ اس جیسی محدود قرار دی جانے والی صنف سخن کو کسی ایک مقالے، مضمون یا تبصرے میں باندھ پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پھر غزل جتنی ہر دلعزیز اور مقبول عام ہوتی گئی، کسی نہ کسی گوشے سے اس کی مخالفت بھی گاہے بگاہے دیکھنے کو ملتی رہی۔ غزل پر سب سے پہلا حملہ تو انجمن پنجاب کے ذریعہ کرنل ہالرائڈ اور ان کے ہندوستانی مصاحبین، محمد حسین آزاد اور مولانا حالی وغیرہ نے کیا۔ یہ اور بات ہے کہ آزاد اور حالی، دونوں اکابرین ہی غزل کے جادو سے آزاد نہ ہو سکے۔ اس کے بعد عظمت اللہ خاں نے 'بے تکلف غزل کی گردن مار دینے کی صلائے عام دی، لیکن نہ ان کے لکھے ہوئے گیت، اردو غزل کے آس پاس پہنچ سکے اور نہ ہی غزل کے مستقبل پر کوئی اثر پڑا۔ ترقی پسندوں نے غزل کو دو مصرعوں کی محدودیت کی بنا پر مخالفت کی، مگر مجروح اور فیض نے غزل لکھ کر اور کہہ کر اس کا اعتبار اور استناد قائم رکھا۔ حلقۂ ارباب ذوق والوں نے غزل کو یکسر ترک کر کے نظم کو وقار و اعتبار ضرور بخشا، لیکن حلقے سے ناوابستہ شعرا کے یہاں غزل متوازی طور پر کہی جاتی رہی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بلکہ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ غزل اردو کی حدود سے نکل کر ہندی، پنجابی، گجراتی، بنگلہ، مراٹھی اور بھوجپوری زبانوں تک میں در آئی ہے۔

ان مثبت حالات میں جنوب کے ایک نامور ادیب، اردو نواز اور شاعر جناب حافظ کرناٹکی جب غزل کہتے ہیں تو وہ دراصل دکن اور ولی گجراتی کی روایات ہی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ حافظ کرناٹکی تقریباً چالیس شعری تصانیف اور تیس نثری کتابوں کے مصنف ہیں اور کرناٹک کے ادبی حلقوں میں ایک محترم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی وسعتِ ذہنی کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے حمد، نعت، رباعیات وقطعات کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے غزلیں، نظمیں اور لوریاں بھی نظم کی ہیں۔ انھوں نے درجنوں تاریخی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور مذہبی شخصیات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ کرناٹکی کا ذہنی کینوس کس قدر وسیع ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں اسی سے زائد غزلیں شامل ہیں جن میں موضوع کے تنوع اور لہجے کی تازگی کا احساس لگاتار قائم رہتا ہے۔ جب کہ اس مجموعے کے دیباچے میں ڈاکٹر رونق شہری نے تحریر کیا ہے کہ حافظ کرناٹکی ایک جامع کمالات شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی سے براہِ راست مکالمہ قائم کرنے کا ہنر انھیں حقیقت پسند شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں ان کے کچھ نمائندہ اشعار کا حوالہ دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر،

قافیے خاک ہوئے اور ردیفیں جھلسیں
شعر کیا کہیے کہ افکار کی لہریں جھلسیں

ممکن ہے کہ لٹ جائیں چراغوں سے اُجالے
بہتر ہے کہ اشکوں سے جلایا کرو آنکھیں

حافظ کرناٹکی کے غزلیہ کلام کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر کسی ایک نظریے یا کسی ایک طرز فکر کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے اطراف کے واقعات و مشاہدات سے شاعری کا خام مواد حاصل کرتے ہیں اور اس کو لفظوں کی تسبیح میں پرونے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے روزمرہ کے مشاہدات پر مبنی چند اشعار:

کسی کی ہولیاں رنگین کرنے — ہمارا خوں اُچھالا جا رہا ہے
تم میں اور ہم میں اک فرق یہ نمایاں ہے — تم دیے بجھاتے ہو ہم دیے جلاتے ہیں
حکمراں ہو جہاں پہ سناٹا — اُس نگر میں صدا کرے گا کون

حافظ کرناٹکی کے مجموعے 'غزل ساز' کو پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ اور قدیم لفظیات نمایاں ہیں، لیکن ان کے موضوعات جدید ہیں اور اس لیے ان کی غزلیں قابلِ مطالعہ ہیں۔ اُمید ہے شائقینِ غزل کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

■

عالمی اردو نامہ

عکس یوسف

قطر: بخاری فاؤنڈیشن دوحہ قطر کے زیر اہتمام ہوٹل ریڈیسن بلو میں مرحوم سید یوسف کمال بخاری کے مضامین کا مجموعہ 'عکس یوسف' کا اجرا کیا گیا۔ تقریب میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک سے بھی اردو کے دانشوروں نے شرکت کی اور ممتاز ادیب، محقق، مورخ اور ماہر آثار قدیمہ یوسف کمال بخاری کی حیات وخدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ وزارت کھیل کود اور ثقافت کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر فیصل السویدی اور منی المجلی (ریمس قسم) کی حاضری نے پروگرام کے وقار کو ایک مقام عطا کیا۔ اوشا روی شنکر نے نظامت کی۔ سیمنار کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بخاری فاؤنڈیشن کے چیئرمین محمد صبیح بخاری نے مہمانوں کا استقبال کیا اور بخاری فاؤنڈیشن کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی اپنے والد سید یوسف کمال بخاری کی حیات وخدمات پر گفتگو کی۔ بخاری نے اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے مضمون نے کتاب کی افادیت کو جہاں دوبالا کیا ہے وہیں آپ کی موجودگی نے آج کے پروگرام کو ایک وقار عطا کیا ہے۔ مرتب ومحقق 'عکس یوسف' ندیم ماہر نے یوسف کمال بخاری کی ادبی نگارشات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یوسف کمال بخاری ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے اردو کے ساتھ انگریزی، فارسی اور فرنچ زبان میں جو تحقیقی کام کیا ہے وہ نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ نے یوسف کمال بخاری کے مضمون 'دور خسروی کے فن تعمیر' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا یہ مضمون نہ صرف تاریخی ہے بلکہ ہندوستان کے مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے نیز آپ نے لسانیات کے حوالے سے رسم الخط کے عنوان پر بخاری کے تین مضامین کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ ان مضامین کو لسانیات کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ مہمان خصوصی سر ضیاء الدین یونیورسٹی کراچی کے وائس چانسلر پروفیسر پیرزادہ قاسم نے محمد صبیح بخاری اور ندیم ماہر کو کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ کتاب موجودہ تہذیب اور آنے والی نسلوں تک منتقل

کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ سیمنار میں مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے بطور صدر شرکت فرمائی۔ پروفیسر اختر الواسع نے سیمنار میں اپنے پر مغز خطاب میں کہا کہ ایک ایسے عہد میں جب ادبی اداروں میں تحقیق کا رجحان زوال پذیر ہو رہا ہے یوسف کمال بخاری کی تحریروں کو پڑھنے سے نئی روشنی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ یوسف کمال بخاری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کے ہاں تنوع ہے، اکہرا پن نہیں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2018

اسلام اور فنون لطیفہ

دوحہ: قطر کی ادبی تنظیم 'کاروانِ اردو ادب' نے اندلس کلب دوحہ میں ایک مشاعرہ اور تقریب رونمائی کا انعقاد کیا جس میں تنظیم کے جنرل سکریٹری شاہد خان کی کتاب 'اسلام اور فنون لطیفہ' کی رونمائی ہندوستان سے تشریف لائے مشہور افسانہ نویس، ناول نگار، ادیب، محقق اور حکومت ہند کے اعلی افسر سید محمد اشرف اور دیگر مہمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔

واضح ہو کہ شاہد خان کی کتاب 'اسلام اور فنون لطیفہ' عالم اسلام کے موقر اسکالر اور فقیہ علامہ یوسف القرضاوی کی معرکۃ الآرا تصنیف 'اسلام والفن' کا اردو ترجمہ ہے۔ پروگرام کی صدارت معروف ادیب سید محمد اشرف نے کی، جبکہ مہمان خصوصی اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے دوحہ کی مشہور سماجی وعلمی شخصیتیں عبدالکریم چوگلے اور عباس عظیم شریک ہوئے۔ مہمانوں کا تعارف کاروان کے رکن نشاط صدیقی نے کرایا جبکہ مشاعرے کی نظامت ابرار کاشف نے کی۔ پاکستان سے عباس تابش، شکیل جاذب، سلمان گیلانی، فرطاش سید، خالد سجاد (حال مقیم کویت) نے اپنے کلام سے مشاعرے کے آہنگ کو بلند کیا تو مقامی سطح پر ڈاکٹر وصی الحق بستوی، راشد عالم، اعجاز حیدر، مقصود انور مقصود، ڈاکٹر خالد جیلانی، احمد اشفاق، عزیز نبیل، محمد رفیق شاد اکولوی، عتیق انظر نے اپنے کلام سے کافی داد و تحسین حاصل کی۔

سید محمد اشرف نے کاروانِ اردو قطر کو مبارکباد دی اور اپنے دلچسپ انداز تکلم سے اردو کا جادو جگایا اور ساتھ ہی اپنے کلام سے بھی نوازا۔ تقریب کا اختتام کاروانِ اردو قطر کے جنرل سکریٹری شاہد خان کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 نومبر 2018

مشاعرہ زندہ دلان

دبئی: کم وبیش 20 برس کے بعد خلیج میں مزاحیہ مشاعروں کے بانی ڈاکٹر اظہر علی زیدی کی رہنمائی میں بزم اردو دبئی کے زیر اہتمام مشاعرہ زندہ دلان کے عنوان سے ایک بہترین مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس مشاعرے کا انعقاد 37ویں شارجہ عالمی کتاب میلے کی ایک ادبی تقریب کے طور پر کیا گیا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان اور پاکستان سے طنز و مزاح کے معروف شعرا انور مسعود، پاپولر میرٹھی، خالد مسعود، سرفراز شاہد، نشتر امروہوی، کلیم سمر بدایونی، عبدالحکیم ناصف، انس فیضی کو مدعو کیا گیا تھا، ان کے علاوہ عالم عرب کے مشہور و معروف اردو شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی صدارت طنز و مزاح کے عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب انور مسعود نے کی اور نظامت کے فرائض انس فیضی نے انجام دیے۔ مشاعرے کے آغاز سے پیشتر عالم اردو میں طنز و مزاح کے شعبے میں اپنا ایک منفرد اور اعلی مقام رکھنے والے انور مقصود نے اپنی نثر پڑھ کر حاضرین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کا آغاز اقرا فضیلت نے تلاوت قرآن سے کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اظہر علی زیدی کو مہمان خصوصی عبدالرحمٰن السالم القاسمی، شارجہ بک اتھارٹی کے چیئرمین احمد بن رکاض العامری، بزم اردو کے صدر شکیل خان، بزم اردو کے جنرل سکریٹری ریحان خان اور ندیم احمد کی موجودگی میں بزم اردو دبئی کی جانب سے علم دار اردو ایوارڈ پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2018

مشرقی زبان وادب پر سوشل میڈیا کے مثبت اور منفی اثرات

قاہرہ: دنیا کی سب سے قدیم اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر مصر میں چانسلر شیخ محمد محرصاوی کی سرپرستی میں 'مشرقی زبان و ادب میں سوشل میڈیا کے مثبت و منفی اثرات' کے عنوان سے ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی کے اشتراک سے چوتھا عالمی سیمینار منعقد کیا گیا۔

سیمینار کا افتتاح مہمان خصوصی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف عامر نے کیا۔ عالمی سیمینار میں شرکت کرنے والوں میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کے علاوہ دہلی یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر محمد کاظم، جموں یونیورسٹی کے ڈین اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، دہلی یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر محمد محسن، لندن سے مشہور افسانہ اور کالم نگار فہیم اختر، جبکہ پاکستان سے مہ جبیں غزال انصاری کے اسما قابل ذکر ہیں۔ سیمینار کا آغاز جامعہ ازہر کے کانفرنس ہال میں تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اردو زبان و ادب کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتی ہے اور ہم مصر میں اس کی ترویج کے لیے پوری طرح کوشاں ہیں۔ ان کے بعد جامعہ ازہر کے شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ نے اردو زبان اور سوشل میڈیا کے متعلق اظہار خیال کیا۔ دوسرے سیشن میں مہمان شرکا نے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ اس دوسرے سیشن کے نگراں جامعہ ازہر کے شعبہ اردو کے سینئر پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم تھے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اردو کے عروج، ارتقا اور امکانات کی وضاحت کی اور اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر محمد کاظم نے کہا کہ آج ہم اردو رسم الخط کو پس پشت ڈال کر رومن حروف کا استعمال کر کے نہ صرف اردو زبان کو نقصان پہنچا رہے ہیں بلکہ نسل نو پر اس کے مختلف منفی اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں لہٰذا ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ سوشل میڈیا پر کسی بھی طرح کی پوسٹ شیئر کرتے وقت اردو رسم الخط کا خاص لحاظ رکھیں۔ جموں یونیورسٹی کے ڈین پروفیسر شہاب عنایت ملک نے اردو زبان کی مختلف ویب سائٹس کا تعارف کرایا اور بعض منفی اثرات اور حل کی جانب توجہ دلائی۔ ڈاکٹر محسن نے سوشل میڈیا کے منفی اثرات پر تنقید کی اور کہا کہ اردو زبان پر منعقد ہونے والے سیمیناروں میں اس جانب سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لندن سے آئے فہیم اختر نے اپنا مقالہ بعنوان 'برطانیہ میں اردو زبان کا ارتقا' پیش کیا۔ لندن میں مقیم پاکستانی شاعرہ مہ جبیں غزال انصاری نے سوشل میڈیا اور اردو شاعری کے عنوان پر مقالہ پڑھ کر سامعین سے داد و تحسین وصول کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2018

عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے ثقافتی ایوارڈ

ریاض: سعودی عرب کی حکومت نے عربی زبان و ادب بالخصوص فصیح عربی شاعری کے فروغ اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک نئے ثقافتی ایوارڈ کا اعلان کیا ہے۔ العربیہ ڈاٹ نیٹ کے مطابق خادم الحرمین الشریفین شاہ سلمان بن عبدالعزیز کی جانب سے منظوری لینے کے بعد شہزادہ عبداللہ الفیصل ایوارڈ کا اعلان شاہی مشیر شہزادہ خالد الفیصل نے اتوار کے روز ایک ثقافتی تقریب کے دوران کیا۔ شہزادہ خالد الفیصل کا کہنا تھا کہ ثقافتی ایوارڈ کے اعلان کا مقصد عربی شاعری کی نشر و اشاعت، اس کے وجود، فروغ، عرب قصیدہ گوئی کی معاون تحریکوں کی مدد، اس کی تاریخ، شاعری کی اصناف، اوزان، قوافی کے فروغ اور اس میدان میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ ایک ملین ریال مالیت کے ثقافتی ایوارڈ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ادا کیا جائے گا۔ پانچ لاکھ ریال معاصر شاعر کو دیے جائیں گے۔ اس کا انتخاب ایک کمیٹی کرے گی۔ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ فصیح عربی زبان میں اس کی شاعری کے کم سے کم تین دیوان شائع ہو چکے۔ نیز اسے شاعری کی تمام اصناف پر ملکہ حاصل ہو۔ ایوارڈ کا دوسرا حصہ 3 لاکھ ریال رکھا گیا ہے۔ یہ رقم عرب تھیٹر شاعری کے لیے مختص ہے جبکہ 2 لاکھ ریال معاصر شعرا کے کلام کی گائیکی کے لیے مقرر ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 13 نومبر 2018

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبر نامہ

قومی اردو کونسل کو عالمی سطح کا ادارہ بنایا جائے گا: ڈاکٹر شاہد اختر

ڈاکٹر شاہد اختر کے تجربات سے اردو زبان اور قومی اردو کونسل کو بہت فائدہ ہوگا: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل میں وائس چیئرمین کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اتنے بڑے ادارے کا حکومت ہند کی جانب سے وائس چیئرمین مقرر کیا جانا میرے لیے فخر کی بات ہے۔ ادارے کا وقار اور اتحاد مجروح نہ ہو ہمیں اس حوالے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی ادارے کی ترقی اور اس کی بقا اس سے وابستہ عملے کی ایمانداری اور محنت انسانی وسائل کے درمیان میری حیثیت ایک پل کی ہوگی اور کونسل کے تمام مسائل کے حل کے لیے ہم کوشاں رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے دائرہ اختیار میں ایک Common Minimum Programme کے تحت ایک مربوط حکمت عملی تیار کی جائے گی ہم سب کو اردو جیسی میٹھی اور شیریں زبان کو گھر گھر تک پہنچانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے ساتھ مل کر کونسل کے تمام کاموں میں تیزی اور بہتری لانے کی بھی کوشش کریں گے۔

اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے وائس چیئرمین کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر شاہد اختر کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا اور کہا کہ آپ فعال و متحرک ہیں، تجربہ کار ہیں اور خدمت خلق سے

پر ہوتی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ قومی اردو کونسل کو عالمی سطح کا ادارہ بنایا جائے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ استقبالیہ تقریب میں کونسل کے نئے وائس چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا فروغ کیسے کیا جائے اس بات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ کونسل آج ترقی کے جس مقام پر ہے ہمیں اسے اور بلندیوں تک پہنچانا ہے۔ اس میں آپ سبھی کی مدد کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے ہم نے یونیورسٹیوں کے پروفیسران اور محبان اردو سے تبادلہ خیال کیا ہے۔ آپ بھی اپنے مشورے اور تجاویز ہمیں دیں تاکہ اس کی روشنی میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے کونسل اور وزارت ترقی

وائس چیئرمین نے اپنے خطاب میں کہا کہ وہ جلد ہی وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی اور وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترم جناب پرکاش جاوڈیکر اور تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو درخواست بھیجیں گے کہ ملک کی سبھی ریاستوں میں اردو کی ترویج و ترقی کو یقینی بنایا جائے اور اردو اکادمیوں کے قیام کی کوشش کی جائے اور جن ریاستوں میں اردو اکادمیاں ہیں انھیں مزید فعال کس طرح بنایا جاسکتا ہے اس پر بھی ہم غور و خوض کریں گے۔ ریاستوں میں اردو زبان کی تدریس کا بہتر نظم کیا جائے گا ساتھ ہی ایسے علاقے جہاں اردو جاننے، بولنے اور سمجھنے والے نہیں ہیں ان علاقوں میں بھی اردو زبان کی ترویج و ترقی کی کوشش کی جائے گی۔ غیر اردو حلقے میں اردو کا فروغ آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔

وابستہ رہے ہیں۔ ہمیں ان کی سرپرستی میں کونسل کو بلندیوں تک پہنچانا ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ ڈاکٹر شاہد اختر کے آنے سے ہمیں تقویت ملی ہے۔ اب کونسل کے کاموں میں تیزی آئے گی ان کے تجربات سے اردو زبان اور قومی اردو کونسل کو یقیناً بہت فائدہ ہوگا۔

استقبالیہ تقریب میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، جناب کمل سنگھ، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر کونسل کے تمام اسٹاف کے علاوہ مشہور و معروف آنکولوجسٹ ڈاکٹر عبدالماجد تالی کوٹی، جناب بھرت راوت، مولانا صہیب قاسمی، ڈاکٹر سہراب عالم وغیرہ بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 دسمبر 2018

اردو اور دیگر مذاہب کے حوالے سے ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا جائے گا: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

یومِ ثقافتی اتحاد کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں خطبے کا اہتمام

نئی دہلی: اردو گنگا جمنی تہذیب کا وہ گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول ہیں۔ اردو بتدریج پنپ رہی ہے۔ اردو کی نئی بستیاں پچھلے سو سال سے اردو کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کناڈا سے تشریف لائے معروف محقق وادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے یوم

ثقافتی اتحاد کے موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مرکزی ہال میں 'اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے تحفظ اور ترقی کے مسائل و وسائل کا جائزہ' کے عنوان سے خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنیا بھر میں اردو کی بہت سی بستیاں ہیں جہاں اردو کے چاہنے اور بولنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ٹورنٹو میں ساڑھے تین سے چار لاکھ افراد اردو سمجھتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ، کناڈا، یورپ، آسٹریلیا اور مشرق وسطی میں بھی بہت سے لوگ اردو سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں اردو کے لیے بھرپور جوش وولولہ ہے، البتہ تجربہ اور رہنمائی کی کمی ہے۔ اگر انھیں رہنمائی اور سرپرستی حاصل ہو تو ان بستیوں میں اردو کی صورت حال اور بہتر ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک اردو کے شعرا وادبا گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیتے رہے ہیں۔ حیدرآباد میں محمد قلی قطب شاہ کے مزار سے مشترکہ تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ نوجوانوں پر خاص توجہ دی جانی چاہیے، ان کی کتابوں اور تخلیقات کو شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ تاکہ اردو کی مضبوط نئی نسل تیار ہو سکے۔ انھوں نے اردو کو نئی ٹیکنالوجی سے جوڑنے پر بھی زور دیا تاکہ اردو کے مسائل کے تدارک اور اس کے فروغ کے لیے جدید تناظر میں موثر وسائل وذرائع تلاش کیے جا سکیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو میں قاری کے بحران پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں قارئین کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ ریڈرشپ کو بڑھانے کے لیے اہم اقدامات کیے جانے کی ضرورت ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے مسرت وفخر کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے درمیان اردو دنیا کی معروف اور ممتاز شخصیت ڈاکٹر تقی عابدی موجود ہیں۔ وہ کناڈا میں قیام پذیر ہیں لیکن ان کی جڑیں ہندوستان میں ہیں۔ میڈیکل کے پیشے سے جڑے ہونے کے باوجود انھوں نے اردو زبان و ادب کی ثروت میں گراں قدر اور قابل رشک اضافے کیے ہیں۔ اب تک ان کی 60 سے زائد ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے یوم ثقافتی اتحاد کی مناسبت سے کہا کہ قومی اردو کونسل جلد ہی اردو میں دیگر مذاہب کی کتابوں کے حوالے سے ایک کل ہند سمینار کا انعقاد کرے گی تاکہ ثقافتی اتحاد کو مزید مستحکم کیا جا سکے۔

اردو اکادمی کے وائس چیرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو شہپر رسول نے اس موقعے پر کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی بڑے ادیب اور فعال شخص ہیں اور اردو کے لیے اہم کام کر رہے ہیں۔ جس موضوع پر وہ لکھتے ہیں، بھرپور لکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے حوالے سے کافی کچھ کام ہو رہا ہے مگر ہنوز مزید کام کی ضرورت ہے۔

آخر میں قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شہزاد انجم، منصور احمد عثمانی، اے رحمٰن (ایڈووکیٹ)، جناب عقیل احمد (سکریٹری غالب اکادمی)، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر مجیب احمد، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر علاء الدین خان، زبیر خان سعیدی، رکن الدین، شاداب شمیم، امیر حمزہ، طفیل علیمی، سمیت جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جے این یو کے ریسرچ اسکالر اور قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20/نومبر 2018

'گلزار کی تخلیقی صنف تروینی: تشریح و تجزیہ' کا اجرا

نئی دھلی: معروف محقق و ادیب تقی عابدی (کناڈا) کی کتاب 'گلزار کی تخلیقی صنف تروینی: تشریح و تجزیہ' کا اجرا کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ گلزار کی اس صنف کو اردو شاعری میں ایک مقام حاصل ہے اور اس کتاب کے ذریعہ تقی عابدی نے گلزار کی تروینی کو ہر اردو والے تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے اردو میں تروینی جیسی صنف کو عروج حاصل ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی صلاحیت و لیاقت سے کتاب کو بے حد معیاری بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اس کتاب کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر گلزار کی اس صنف کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔ اس موقع پر کتاب کے مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کتاب کا تعارف پیش کیا اور ساتھ ہی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا شکریہ بھی ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ گلزار کی تروینی ایک ایسی صنف ہے جو تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور تیسرا مصرعہ پہلے دونوں مصرعوں کو ایک نیا آہنگ، نیا معنی عطا کرتا ہے۔ اس تیسرے مصرعے میں ہی سب سے زیادہ حسن ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر انور پاشا نے اس موقعے پر کہا کہ اس کتاب کے ذریعے تقی عابدی نے گلزار کی ادبی حیثیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت تروینی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ کتاب لائبریریوں کے شیلف میں نہیں بلکہ ہر قاری کے پاس پہنچنی چاہیے۔ ایڈووکیٹ خلیل الرحمن نے کہا کہ سید تقی عابدی کی اس کتاب سے تروینی جیسی صنف کو مقبولیت ملے گی اور تقی عابدی نے یہ کتاب لکھ کر گلزار کی تخلیقی قوت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ گلزار ایک اختراعی ذہن رکھتے ہیں۔ مردہ لفظ اور احساس کے درمیان جیتے جیتے جب انھیں زندہ احساس اور لفظوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے تروینی کی شکل میں ایک نیا صنفی تجربہ کیا اور ہر نیا تجربہ

ردو قبول کی منزل سے گزرتا ہے۔ خدا کرے کہ گلزار کے اس تجربے کو قبولیت عامہ نصیب ہو۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی نے کتاب کا مختصر تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تقی عابدی کی یہ کتاب نہ صرف ایک اہم موضوع کا احاطہ کرتی ہے بلکہ گلزار کی شاعری کی نئی جہت سے روشناس بھی کراتی ہے۔ سید تقی عابدی نے تروینی کی مکمل تعریف و تشریح کے ساتھ ساتھ تروینیوں کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے اور یہ کام یقیناً قابل ستائش ہے۔

اجرا کی اس تقریب میں معروف صحافی اسد رضا، محمد خلیل (سائنٹسٹ)، ڈاکٹر محمد شاہد، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، شاہنواز خرم، محمد احمد (اکاؤنٹ آفیسر)، عابد انور (یو این آئی)، زبیر خاں سعیدی اور ڈاکٹر اسد اللہ کے علاوہ کونسل کا عملہ بھی موجود تھا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 نومبر 2018

حقوق اور فرائض سے آگہی کے لیے آئین ہند کا مطالعہ ضروری: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

یومِ دستور ہند کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں آئین کے احترام کا حلف لیا گیا

نئی دھلی: بھارت کا آئین دنیا کا سب سے بہترین اور خوبصورت آئین ہے۔ اس آئین کے بنانے میں دنیا کے تمام جمہوری ممالک کے آئین و دستور کا گہرائی سے مطالعہ کیا گیا، اس کے بعد ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی رہنمائی میں 26 نومبر 1949 کو حتمی صورت دی گئی۔ آج ہم لوگ ہندوستان کے آئین کو یاد کرنے اور حلف لینے کے لیے یہاں یکجا ہوئے ہیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یوم دستور ہند کے موقع پر صدر دفتر میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے دستور ہند کی معنویت پر پر مغز گفتگو کی اور کہا کہ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم اپنے اختیارات کا بیجا استعمال نہ کریں اور نہ ہی کسی کے ساتھ کوئی حق تلفی کریں، تبھی ہم صحیح معنوں میں دستور ہند کے ساتھ انصاف کر پائیں گے۔ ہندوستان کا آئین ہمیں مذہب اور اظہار رائے کی آزادی فراہم کرتا ہے ہم سب ہندوستانیوں کو چاہیے کہ آئین ہند کا مطالعہ کریں تاکہ ہمیں اپنے حقوق اور فرائض کا علم ہو سکے۔ اس موقع پر کونسل کے دیگر اہلکاروں نے بھی دستور ہند کی اہمیت پر اپنے خیالات پیش کیے۔

اردو زبان کے فروغ کے لیے حکومت سنجیدہ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ موجودہ حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہے

اور اردو کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کونسل کا ابتدائی بجٹ 84 لاکھ روپے پر محیط تھا جو بتدریج بڑھ کر آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے دورِ اقتدار میں کروڑوں تک پہنچ گیا۔ انھیں کے دورِ اقتدار میں کونسل کی نئی عمارت بھی وجود میں آئی۔ حکومت ہند کی جانب سے 14-2009 کے لیے جو گرانٹ مختص کی گئی، وہ 176.48 کروڑ پر مشتمل تھی جب کہ سال 2014 تا 2019 کے لیے عزت مآب وزیر اعظم ہند نریندر مودی کے دورِ اقتدار میں یہ رقم بڑھ کر 332.16 کروڑ ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نریندر مودی جی حکومت میں کونسل کے بجٹ میں 88 فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ قومی اردو کونسل کے تاسیسی مقاصد میں اردو زبان و ادب کا فروغ اور نئے امکانات کی تلاش شامل ہے اور قومی کونسل اپنے تاسیسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ کونسل جلد ہی فروغ اردو کے لیے نئی نئی اسکیمیں وضع کرے گی اور یہ بھی کوشش کرے گی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں عملی طور پر فروغ اردو کی کوششیں تیز سے تیز تر کی جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو کی بہت سی انجمنیں، ادارے اور اکیڈمیاں بھی فروغ اردو کے لیے کونسل سے اشتراک اور تعاون کی خواہاں ہیں اور جلد ہی اس سلسلہ میں ایک مضبوط لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4/دسمبر 2018

قومی اردو کونسل فروغ اردو کی کوششوں میں گوا کے لوگوں کا تعاون چاہتی ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مختلف غیر سرکاری اداروں و تنظیموں کے ذمے داران کے ساتھ منعقدہ ایک پروگرام میں کونسل کے ڈائرکٹر کا خطاب

پنجی / گوا: قومی اردو کونسل پورے ملک کے لیے ہے اور ملک کے کسی بھی خطے میں رہنے والے کا اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا دہلی یا شمالی ہند میں رہنے والوں کا۔ قومی اردو کونسل ملک کے ہر چھوٹے بڑے علاقوں، قصبوں تک پہنچنا چاہتی ہے۔ میں نے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالتے ہی اس بات کا اعلان کیا تھا کہ قومی اردو کونسل پورے ملک یا یوں کہہ لیں کہ یہ تناسب نہیں کے برابر ہے اسی لیے ہم نے آج یہاں اس پروگرام کا انعقاد کیا ہے تاکہ گوا کی اردو برادری بھی ہماری اسکیموں سے فائدہ اٹھائے اور ایسے علاقوں میں بھی اردو زبان و ادب کا فروغ ہو سکے۔ قومی اردو کونسل فروغ اردو کی کوششوں میں گوا کے لوگوں کا تعاون چاہتی ہے۔

میں ضلعی سطح پر پروگرام کرے گی اور ملک کے ہر اردو داں طبقے تک پہنچنے کی کوشش کرے گی اور اسی کوشش کا آغاز ہم نے گوا میں اس پروگرام کے انعقاد سے کیا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد ہی یہ ہے کہ قومی اردو کونسل کی فروغ اردو کی کوششوں میں آپ بھی شامل ہوں اور ہماری اسکیموں سے مستفیض ہوں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ہوٹل فدالگو، پنجی، گوا میں منعقدہ مختلف غیر سرکاری تنظیموں، اداروں اور مدارس کے ذمے داران کے ساتھ ایک Interactice Session میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل ملک بھر میں پھیلے اپنے مراکز کے ذریعہ کمپیوٹر، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن، اردو، عربی و فارسی کے کورسز چلاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیمینار، کانفرنس اور مشاعروں وغیرہ کے لیے مالی معاونت بھی فراہم کرتی ہے۔ ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی تعاون دیا جاتا ہے۔ ہمیں کونسل کی مختلف اسکیموں، پروگراموں کے لیے گوا، انڈمان نکوبار اور شمال مشرقی ریاستوں سے بہت کم درخواستیں موصول ہوتی ہیں

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کا تعارف بھی پیش کیا ساتھ ہی مختلف اسکیموں اور پروگراموں کی تفصیلات بھی بتائیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ گوا میں اردو بولنے والوں کا فیصد محض 2.83 ہے جو دوسری ریاستوں کے مقابلے کافی کم ہے۔ ہمیں اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی۔ قومی اردو کونسل کی کوشش ہوگی کہ گوا اردو کا ایک گہوارا بن کر ابھرے اور یہاں کے لوگ بھی اردو کی شیرینی کو محسوس کریں اور یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں آراستہ کی جائیں۔ اب آپ سب لوگوں کی ذمے داری ہے کہ اپنی اپنی سطح پر فروغ اردو کا کام کریں اور کونسل آپ سب کو ہر ممکن تعاون دینے کو تیار ہے۔ اس پروگرام میں مختلف این جی او اور اداروں کے تقریباً 100 سے زائد افراد نے شرکت کی اور کونسل کے اس پروگرام کی ستائش کی۔ لوگوں نے کہا کہ کونسل کا یہ قدم خوش آئند ہے اور وہ بھی کونسل کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں کریں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9/دسمبر 2018

میں اردو کی ترقی کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں: شبانہ اعظمی

قومی اردو کونسل میں شبانہ اعظمی کو استقبالیہ

نئی دہلی: ہندوستان کی مشہور فلمی اداکارہ اور سماجی خدمت گار محترمہ شبانہ اعظمی کو فروغ اردو کے تعلق سے تبادلہ خیال، مشوروں اور تجاویز کے لیے خصوصی طور پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں مدعو کیا گیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے شبانہ اعظمی کا پرتپاک انداز میں استقبال کیا اور ان کی خدمت سب سے بڑا ادارہ ہے۔ میں اس ادارے سے بہت برسوں سے جڑی ہوئی ہوں اور اس ادارے میں آ کر فخر محسوس کر رہی ہوں۔ میں فروغ اردو کی مہم میں مکمل طور پر کونسل کے ساتھ ہوں اور سماج اور سرکار کی سطح پر مجھ سے جو کچھ بھی اردو کے فروغ کے لیے ممکن ہو سکے گا اس کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان نے اردو کے فروغ کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا لینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اس میں ڈاکومینٹری اور سیریل وغیرہ بنانے کی ضرورت ہے تاکہ عام آدمی کو اس سے جوڑا جا سکے۔ شبانہ اعظمی نے کونسل کی طرف سے اردو کی پرکشش اور معیاری کتابیں چھاپنے کی بھی بات کہی کہ آج

میں گلدستہ بھی پیش کیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے شبانہ اعظمی کا مختصر اور جامع تعارف کراتے ہوئے کہا کہ کونسل میں انھیں مدعو کرنے کا مقصد قومی اردو کونسل کو فلمی ہستیوں سے جوڑ کر اردو کا فروغ اور اس کے دائرے کو وسیع کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ فلمی ہستیوں سے اردو کے تعلق سے مکالمے اور پیغامات کو کولاژ کی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ اردو کی طرف عام آدمی بھی متوجہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سلیم خان، گلزار، جاوید اختر، ریکھا جی، سلمان خان، شاہ رخ خان، عامر خان، کٹرینہ کیف کو بھی اس مشن سے جوڑنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر یہ اہم فلمی شخصیات فروغ اردو کے مشن سے جڑ جاتی ہیں تو یہ اردو کے لیے بہت خوش آئند بات ہوگی۔ اس پر شبانہ اعظمی نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا اس وقت قومی اردو کونسل اردو کا میں ہندی سنیما اردو زبان کی سب سے بڑی محافظ ہے اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے اس کی خدمات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے لوگ اردو نہیں جانتے لیکن اردو زبان کی مٹھاس اور اس کی شیرینی کے وہ بھی قائل ہیں۔ خاص طور پر غزل نے انھیں اردو کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اور غزل کی وجہ سے ایک بڑا طبقہ اردو سے جڑ رہا ہے یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے۔ محترمہ شبانہ اعظمی نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے ہندوستان میں لسانی تنوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں بہت ساری زبانیں ہیں جن میں اردو بھی رابطے کی ایک اہم زبان ہے مگر بدقسمتی سے اسے مسلمانوں سے جوڑا جاتا ہے۔ جبکہ یہ غلط ہے۔ اردو کسی خاص مذہب یا سماج کی زبان نہیں ہے بلکہ ہمارے ملک کی زبان ہے۔ یہ ہماری تہذیبی شناخت کا ایک روشن حوالہ ہے۔ انھوں کے صارفی عہد میں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے جاذب نظر گیٹ اَپ کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو رسم الخط کے حوالے سے کہا کہ اسی میں اردو زبان کا سارا حسن مضمر ہے اس لیے تبدیلی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شبانہ اعظمی نے اردو کی ترقی کے لیے نہ صرف مفید مشورے دیے بلکہ یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں اردو سے جڑے ہوئے افراد سے بھی تجاویز اور مشوروں کی ضرورت ہے تاکہ اردو کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جا سکے۔ کونسل کی طرف سے منعقدہ اس استقبالیہ تقریب میں کونسل کا پورا عملہ موجود تھا اور اس کی خاص بات یہ بھی رہی کہ محترمہ شبانہ اعظمی کی خواہش پر قومی اردو کونسل کے پورے عملے نے اپنا تعارف بھی پیش کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 دسمبر 2018

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

وزیراعظم نریندر مودی بنارس کی گلیوں میں اردو کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

بنارس ہندو یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے نذیر بنارسی پر دو روزہ سمینار

نئی دھلی: نذیر بنارسی کی شاعری حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ بھارت کی مٹی کی خوشبو ان کی شاعری میں موجود ہے۔ میرے ڈائرکٹر بننے کے بعد یہ پہلا سمینار ہے جو بنارس میں ہو رہا ہے۔ یہ سمینار ہمارے وزیراعظم عزت مآب جناب نریندر مودی کی ایما پر یہاں کیا جارہا ہے۔ بنارس ہمارے وزیراعظم کا حلقہ ہے اور ان کا پسندیدہ شہر ہے اور یہ گنگا جمنی تہذیب کا شہر ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کو مدن موہن مالویہ جی نے قائم کیا تھا۔ یہاں کا شعبہ اردو تاریخی شعبہ ہے۔ ہمارے وزیراعظم نریندر مودی خود اس سمینار میں آنا چاہتے تھے۔ وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عالی جناب پرکاش جاوڈیکر جی بھی آنا چاہتے تھے لیکن اپنی مصروفیات کے سبب نہیں آسکے۔ لیکن مودی جی نے اس سمینار کے لیے اپنا پیغام دیا ہے جسے یہاں پڑھ کر میں سنا رہا ہوں۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ مودی جی بنارس اور یہاں کی تہذیب وتمدن اور نذیر بنارسی سے کس قدر محبت رکھتے ہیں اور اردو کے فروغ کے لیے بے حد سنجیدہ ہیں اور وہ بنارس کی گلیوں میں اردو کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں قومی اردو کونسل کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ سمینار بعنوان 'نذیر بنارسی: حیات اور کارنامے' میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ مدن موہن مالویہ کے مجسمے پر آج گلپوشی کرتے ہوئے احساس ہوا کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ یہاں کے شعبہ اردو کی حالت زار کو دیکھو اور کچھ بہتر کرنے کی کوشش

प्रधान मंत्री
Prime Minister
MESSAGE

I am happy to learn that a two-day National Seminar-Cum-Mushaira is being organised to mark the birth anniversary of Shri Nazeer Banarasi at Banaras Hindu University.

The couplets composed by Shri Banarasi were replete with a diverse range of emotions – from divine love for Lord Krishna to an overpowering sense of patriotism. The flavour of the culture of Varanasi springs unhindered through his works like the abundant flow of water in Maa Ganga. The depth of thoughts and deep sensitivity is well spread out in his works. His writings are a reflection of the composite culture of our country. Shri Banarasi will continue to live forever in our hearts and minds through his couplets.

I hope that the Seminar-cum-Mushaira will showcase the ideas and ideals through the couplets composed wholeheartedly by Shri Banarasi to the youth of today in particular, to enable them to draw inspiration from his couplets.

Best wishes for all success of the Seminar-cum-Mushaira.

(Narendra Modi)

New Delhi
22 November, 2018

Dr. Aqeel Ahmad
Director
National Council for
Promotion of Urdu Language
Email:director@ncpul.in

کرو۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے سمینار کے مقالوں کو کونسل سے کتابی شکل میں شائع کروانے کا بھی وعدہ کیا۔

اس موقعے پر معروف ناقد جناب شمیم طارق نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نذیر بنارسی ہماری مشترکہ تہذیبی اور لسانی تاریخ کے اہم نمائندے ہیں۔ گذشتہ ایک صدی میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ایسی کوئی شاعری وجود میں نہیں آئی جیسی نذیر بنارسی نے کی ہے۔ اس لیے انھیں یاد کرنا اور ان کی شخصیت اور شاعری پر گفتگو کرنا اپنے جذبۂ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کو نہ صرف تقویت پہنچانا ہے بلکہ اس سمینار کی مدد سے عوام وخواص میں اس جذبے کی تازگی پیدا کرنا بھی ہے۔ ہندی کے معروف فکشن نگار دانشور پروفیسر کاشی ناتھ سنگھ نے نذیر بنارسی سے اپنے تعلقات اور ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شخصیت کے بعض پوشیدہ گوشوں کو اجاگر کیا اور کہا کہ ان کی شاعری ہمارے عہد کے مشاعروں کی جان ہوا کرتی تھی۔ پروفیسر امیش چندر دوبے (ڈین فیکلٹی آف آرٹس) نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ نذیر بنارسی کی آواز کا جادو اور شعر پڑھنے کا فن انھیں مشاعروں میں ممتاز بناتا تھا۔ سمینار کا آغاز پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمے پر گل پوشی اور یونیورسٹی کے گل گیت سے ہوا۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے نذیر بنارسی پر سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ

یہ بنارس ہی نہیں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ہم نذیر بنارسی جیسے قومی شاعر کو یاد کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں نذیر بنارسی کے بیٹے ظہیر بنارسی بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نذیر بنارسی اپنے احباب میں ہردل عزیز تھے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے کی۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے ششماہی ریسرچ جرنل 'دستک' کے دوسرے شمارے اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کی کتاب 'اردو۔ ہندی محاورے' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد نذیر بنارسی کی یاد میں آل انڈیا مشاعرے (ایک شام نذیر بنارسی کے نام) کا انعقاد ہوا جس میں شمیم طارق، طرب صدیقی، وششٹ انوپ، شاد عباسی، نارائن مدگل، کبیر اجمل، عالم بنارسی، احمد اعظمی، شمیم غازی پوری، ٹی۔ این۔ سریواستو، بختیار نواز، شمر غازی پوری، ضیا احسنی، سلیم شیوالوی، ممتا وارشنے، نفیس بانو، جاوید انور، سدھیر بے کس، حبیب بنارسی، نظام بنارسی اور سہیل عثمانی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

نذیر بنارسی کی شاعری ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت بھی ہماری مشترکہ تہذیب کی امانت ہے۔ قومیت کے جس تصور کو لے کر انھوں نے اپنا شعری و ادبی سفر شروع کیا تھا اس پر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک چلتے رہے۔ ایسے ہی جیالوں سے قوم کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے دوروزہ قومی سمینار کے اختتامی اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی) نے یہ واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ سمینار نہ صرف میری بلکہ وزیر اعظم ہند کے توقع کے مطابق کامیاب رہا۔ مفتی عبدالباطن نعمانی (مفتی بنارس) نے نذیر بنارسی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ نذیر بنارسی کی عدم موجودگی میں بنارس تہذیبی انتشار کا شکار ہوچکا ہے۔ اب ہماری نظر کسی ایسی شخصیت پر مرکوز نہیں ہوتی جنھیں سب محترم گردانتے ہوں۔ دوروزہ قومی سمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں میں علی گڑھ سے تشریف لائے پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر محمد علی جوہر نے نذیر بنارسی کی حیات اور خدمات کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس میں جن لوگوں نے مقالے پیش کیے ان میں پروفیسر رضی الرحمن (گورکھپور یونیورسٹی) پروفیسر دیوندر موہن، پروفیسر رفعت جمال، ڈاکٹر محمد عقیل، (بی ایچ یو) اور ڈاکٹر نور فاطمہ کے نام اہم ہیں۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر قمر جہاں (سابق صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض جاوید انور نے ادا کیے۔ شکریہ کی رسم ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی (صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے کہا کہ جن لوگوں نے نذیر بنارسی کو اپنا سمجھا اور انھیں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا وہ سمینار میں تشریف لائے، ہم ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار ان کے اشتراک سے عمل میں آیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سمینار نذیر فہمی میں نئے در وا کرے گا۔

اختتامی اجلاس میں کی شرکاء نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ابوالشعر فہیم نے اس دوروزہ سمینار کو بنارس کی تاریخ میں اضافہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں اس قسم کے سمینار نہیں دیکھے۔ ڈاکٹر سلمان راغب نے کہا کہ بنارس تاجروں کا شہر ہے لیکن علم و ادب سے محبت رکھنے والے بھی اس شہر میں موجود ہیں جن کی نمائندگی یہاں ہورہی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے سمینار کے انعقاد کے اغراض و مقاصد ان کے حصول کی مختلف منزلوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ صرف درس و تدریس کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یونیورسٹی کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلبا کے ذریعہ معاشرہ میں انقلابی روح بیدار کرے اور شعبہ اردو اسی اہم مقصد کے تحت کام کررہا ہے۔ نذیر بنارسی کو یاد کرنا اور ان کے کارناموں سے نئی نسل کو روبرو کرانا اسی مقصد کا ایک حصہ ہے کہ دیکھیے ہمارے درمیان کیسے کیسے لعل و جواہر موجود تھے جن کی قدر و قیمت بدلتے وقت کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ دوروزہ سمینار ہماری توقع کے مطابق رہا اور ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آئندہ بھی اسی قسم کے سمینار کا انعقاد کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ کونسل کا بنیادی کام زبان کا تحفظ اور اس کا فروغ ہے۔ جس کے لیے پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو پڑھانے کا انتظام ہو اس کے لیے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں سے خط و کتابت جاری ہے۔ اس میں یہ کوشش کی جارہی کہ ملک کے سارے نوودے اسکولوں اور سنٹرل اسکولوں میں اردو بحیثیت زبان پڑھانے کا نظم ہوسکے۔ اختتامی جلسے کی نظامت شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے کی جبکہ شکریے کی رسم جناب عبدالسمیع نے ادا کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29،30 نومبر 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

انشاءاللہ خاں انشاء اور ہندوستانی روایت

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'انشاءاللہ خاں انشا اور ہندوستانی روایت' کے عنوان سے دو روزہ سمینار کا

انعقاد کیا گیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پروفیسر قاضی جمال حسین نے پیش کیا۔ جلسے کی صدارت نامور نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کی جبکہ بطور مہمانان خصوصی وی این رائے اور پروفیسر ارتضیٰ کریم نے شرکت کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی بھی اس افتتاحی اجلاس میں موجود تھے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کی، ابتدا میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے سمینار کے سلسلے میں تفصیلات پیش کرتے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قاضی جمال حسین نے انشا کے مطالعے کی دشواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ انشا کو توجہ کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ سرکار اور دربار سے وابستگی نے انشا کی شخصیت کو مجروح کیا وہ جن صلاحیتوں کے مالک تھے اس کا اظہار شعر و نثر دونوں میں ہوا ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ اگر انشا کو وہ ماحول نہ ملا ہوتا جس نے انشا کی شخصیت کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا تھا تو یقیناً انشا کی اور صلاحیتیں بھی سامنے آجاتیں۔ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے انشا کی معروف تصنیف دریائے لطافت اور رانی کیتکی کی کہانی کا بطور خاص ذکر کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور بھی دیا کہ دریائے لطافت کا جو قلمی نسخہ ہے اسے ہمیں دیکھنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اس پر کیا صرف انشا کا نام ہے یا مرزا قتیل اور انشا دونوں کا ہے۔ وی این رائے کا زور اس بات پر تھا کہ اردو اور ہندی الگ تو ہوگئیں مگر انھیں فطری طور پر الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کا مزاج بہت حد تک ایک ہے اور اگر ہم انشا کو پڑھیں تو اس سچائی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارا بنیادی مزاج تو ہندوستانی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو اور ہندی کے رشتے پر انشا کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا کہ بہت پہلے انشا نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے کہ ہماری نسل اور شاعری کو کیسا ہونا چاہیے لیکن ہم نے انشا کو یاد تو کیا مگر ان کے اصل سبق کو فراموش کر دیا۔ افتتاحی جلسے کے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ افتتاحی جلسے میں جو فضا بنی ہے اس سے لگتا ہے کہ انشا پر ہونے والا یہ سمینار بہت بامعنی اور دلچسپ ہوگا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں معاذ احمد، ڈاکٹر مظفر رضا، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، احسن ایوبی اور شمس بدایونی نے مقالات پیش کیے۔ اس جلسے کی نظامت اور صدارت کے فرائض معروف تاریخ داں پروفیسر عزیزالدین حسین نے ادا کیے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'انشاء اللہ خاں انشا اور ہندوستانی روایت' کے عنوان سے دو روزہ سمینار کے دوسرے روز مقالہ نگاروں اور دانشوروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر سہیل انور نے 'انشاء اللہ خاں انشا ہندوستانی روایت کے آئینے میں' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ریحان حسن نے 'انشا اور مصحفی کے معرکے پر ایک نظر' کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ ادبا کے معرکے وقتی طور پر جو بھی تلخی پیدا کریں لیکن اس سے زبان و ادب کو کافی فائدہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے 'انشا کی عشقیہ شاعری' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے مقالے میں انشا کی مشہور تصنیف 'دریائے لطافت' کے حوالے سے اس بات پر زور دیا کہ دریائے لطافت کی قرأت کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ اس اجلاس کی صدارت مشہور نقاد اور انشائیہ نگار پروفیسر خالد محمود نے کی۔ پروفیسر خالد محمود نے اپنی صدارتی تقریر میں انشا کی تخلیقات کے تنوع اور کشادہ ذہنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس اہم موضوع کا انتخاب کیا۔ سمینار کے دوسرے اجلاس میں ثاقب فریدی نے 'انشا کے قصائد'، شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد عبدالسمیع نے 'انشاء اللہ خاں انشا کی ہندوسانیت، انتظار حسین کی نظر میں'، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر مولا بخش نے 'رانی کیتکی کی کہانی اردو افعال کی زبانی' اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر احمد محفوظ نے 'کلاسیکی شاعری میں الفاظ کی اہمیت، کلام انشا کے خصوصی حوالے سے' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر عبدل بسم اللہ نے بھی پرمغز مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی۔ سمینار کے تیسرے اور آخری اجلاس میں ڈاکٹر محمد شاہد خان، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر علی اکبر شاہ اور ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت مشہور نقاد و افسانہ نگار اور شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18-17 نومبر 2018

عہد مغلیہ کے آخری دور کا فارسی ادب و تصوف

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام، بیدل فاؤنڈیشن آف تہران اور پرشین فاؤنڈیشن آف انڈیا کے اشتراک سے 'مغلیہ عہد کے آخری دور کا فارسی ادب تصوف کے خصوصی حوالے سے' کے موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی دہگائی نے مہمان

عہد مغلیہ کے آخری دور کا فارسی ادب و تصوف' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے کہا کہ موضوع کے لحاظ سے مغلوں کے آخری دور کا فارسی ادب اہم ہے اور خصوصاً تصوف یا عرفان اسلامی اس دور کے ادبیات کا وہ پہلو ہے جس پر بہت کم کام ہوا ہے اور امید ہے کہ اس طرح کے سیمیناروں سے یقیناً فارسی ادبیات کے وہ گوشے جو تشنہ تحقیق ہیں علما و محققین کی توجہ اپنی جانب مبذول کریں گے۔ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کہا کہ عام طور پر ہم یہ سوچتے ہیں کہ مغلوں کے آخری دور میں فارسی زبان وادب کا زوال ہوا ہے، مجھے لگتا ہے کہ اب یہ نظریہ تبدیل ہونا چاہیے، کیونکہ اگر دیکھا جائے تو ادبیات کا زوال نہیں ہوا بلکہ دوسری جہات میں ان کی ترقی ہوئی۔ پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ تصوف کے ذریعے صوفیا نے ہمزیستی کو فروغ دیا اور اس راستے میں غیرمسلموں نے بھی ان کے شانہ بہ شانہ خدمات انجام دیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اور بنیاد فارسی ہند کی مشارکت سے منعقد یہ سیمینار یقیناً مطالعہ وتحقیق کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔ سیمینار کے کنوینر اکبر شاہ نے کہا کہ آج تصوف وعرفان پہ کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ پیغام بھی عام ہوسکے کہ مسلمان مصالحت آمیزی اور صلح و آشتی کے حامی ہیں۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید رضا حیدر، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے سیمینار کے موضوع کی اہمیت اور افادیت سے متعلق گفتگو کی۔ نظامت ڈاکٹر سید نقی عباس (کیفی) نے کی۔

دوسرے دن کے اس سیمینار میں افتتاحیہ کے بعد پانچ ادبی سیشن منعقد کیے گئے جن میں ایران، افغانستان اور ہندوستان کے اسکالرز نے 30 سے زائد مقالات پیش کیے۔ پہلے روز کے پہلے جلسے کی صدارت پروفیسر آذرمی دخت صفوی اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی اور دوسرے جلسے کی صدارت کے فرائض پروفیسر علیم اشرف خان اور پروفیسر عبدالقادر جعفری نے انجام دیے۔ ان دونوں علمی اجلاس میں 12 مقالات پیش کیے گئے۔ ان دونوں اجلاس میں پیش کردہ تمام مقالات عہد مغلیہ کے آخری دور کے فارسی ادب بحوالہ تصوف کا بخوبی احاطہ کیا گیا۔ اختتامی نشست سے پیشتر تین علمی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے جلسے کی صدارت پروفیسر آصف نعیم صدیقی و پروفیسر عبدالقادر جعفری نے کی اور اسی طرح دوسرے جلسے کے صدارتی فرائض پروفیسر ریحانہ خاتون او پروفیسر اخلاق احمد آہن نے انجام دیے جبکہ تیسرے جلسے کی صدارت پروفیسر فاطمہ بلقیس حسینی و پروفیسر عارف ایوبی نے کی۔ ان تینوں اجلاس میں 18 مقالات پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25و26 نومبر 2018

'عبدالرحمٰن بجنوری: حیات وخدمات'

نئی دہلی: اردو کے نامور ادیب، نقاد اور شاعر عبدالرحمٰن بجنوری کی حیات وخدمات پر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیراہتمام دوروزہ سیمینار کا افتتاحی اجلاس اکادمی

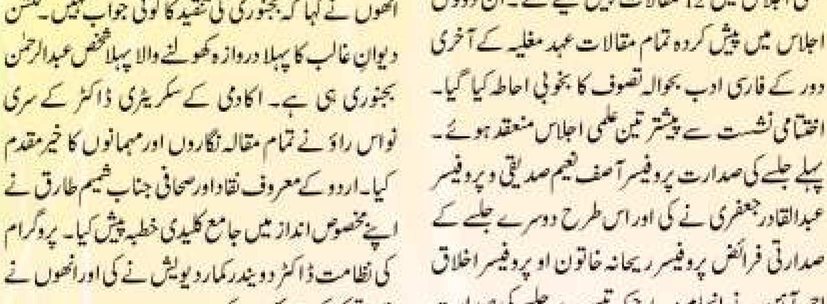

آڈیٹوریم، منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ کہ 'ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں؛ ایک وید مقدس اور دوسرا دیوانِ غالب' غالب ڈسکورس میں جتنا مشہور ہوا اتنا مشہور کوئی جملہ نہیں ہوسکا۔ جب تک اردو تنقید ہے تب تک یہ جملہ زندہ جاوید ہے۔ فلو کی زد میں آنے سے قبل صرف اکتیس سال کی عمر میں بجنوری نے غالب کی عظمت کا لوہا منوا لیا۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری انسانیت کے سچے پرستار تھے اور ان جیسی کوئی دوسری شخصیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ پروفیسر نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ کا شکریہ ادا کیا کہ اس ادارے نے بجنوری کی وفات کے سو سال بعد ان پر سیمینار کرا کر انھیں سچی خراج عقیدت پیش کی ہے۔ اس سے قبل کینیڈا سے تشریف لائے اردو کے ممتاز نقاد اور محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سیمینار کا افتتاح کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا کہ بجنوری کی تنقید کا کوئی جواب نہیں۔ گلشن دیوانِ غالب کا پہلا دروازہ کھولنے والا پہلا شخص عبدالرحمٰن بجنوری ہی ہے۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے تمام مقالہ نگاروں اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اردو کے معروف نقاد اور صحافی جناب شمیم طارق نے اپنے مخصوص انداز میں جامع کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر دویندر کمار دیویش نے کی اور انھوں نے اظہار تشکر کی رسم بھی ادا کی۔

سیمینار کے دوسرے دن مقالہ خوانی کے تین اجلاس عمل میں آئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اردو کے معروف شاعر وصحافی ف س اعجاز نے کہا کہ جہاں شاعری اور فکشن برسوں اور صدیوں ٹھہرتے ہیں کسی کی تنقید سو برس کا استحکام پائے یہ غیرمعمولی بات ہے۔ معروف شاعر ونقاد ڈاکٹر راشد انور راشد نے بجنوری کی شاعری پر اپنے مقالے میں کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کی سخن فہمی قابل رشک تھی۔ فاروق ارگلی نے اپنے مقالے میں کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب، یہ محض انشاپردازی نہیں، ایک جملے میں ہندوستان کی قدیم تہذیب، فلسفہ، سماجی زندگی، تاریخ سب کچھ اس طرح سمایا ہوا ہے جیسے مائیکروچپس میں لامحدود ڈیٹا محفوظ ہوتا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ممتاز نقاد اور فکشن نگار پروفیسر انیس اشفاق نے کی۔ انھوں نے اردو ناقدین کے ذریعے بجنوری پر اٹھائے سوالات کے مدلل جواب کے ذریعے انھیں کامیاب نقاد قرار دیا۔ ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے اپنے مقالے

میں محاسن کلام غالب کے حوالے سے بجنوری کی از سرِ نو دریافت کی سعی کی۔ حقانی القاسمی نے اپنے پُرمغز مقالے میں ثابت کیا کہ بجنوری ایک نابغہ تھے اور غیر معمولی ذہن کے حامل بھی۔ اس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بڑی بات کہنے یا کرنے کے لیے طویل عمر ہونا ضروری نہیں، بجنوری اس کی مثال ہیں۔ قاسم خورشید نے اپنے مقالے میں کہا کہ بجنوری نے محاسن کلام غالب کے مختلف نکات بیان کرنے کے عمل میں یہ خیال رکھا ہے کہ وہ لفظی سطح پر شعر کے مفاہیم یا معنی بیان کرنے سے گریز کریں بلکہ وہ تخلیقی بیانیہ کو زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماہنامہ 'سبق اردو' کے مدیر ڈاکٹر دانش الہ آبادی نے 'عبدالرحمٰن بجنوری: حیات اور کارنامے' موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کے آخر میں اکادمی کے افسر بکار خاص ڈاکٹر دویندر کمار دیویش نے تمام شرکا اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24,25 نومبر 2018

بیرون ملک بھی ریختہ کی دستک

نئی دھلی: محض 6 سال کی عمر میں صدیوں کا سفر طے کرنے والی اردو کی ویب سائٹ ریختہ بہت کم وقت میں 50 ہزار سے زائد اردو کتابوں کو آن لائن کرنا، محض ڈیڑھ سال میں ویب سائٹ کے ذریعے 30 ہزار سے زائد غیر اردو داں حضرات کو اردو رسم الخط سے واقف کرانا، دنیا بھر کی یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں بطور ریفرنس اپنا مقام بنانا، 18 ملین یوزرس کو خود سے جوڑنا، غریب بچوں کو آن لائن یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصابات اور نصابی کتابوں کو مہیا کرانا، اردو کے ممتاز شاعروں کے کلام کو دیوناگری میں بھی متعارف کرانا، 3500 سے زائد اردو شعرائے کرام کی 60 ہزار سے زائد غزلوں اور 6000 سے زائد نظموں کو آن لائن شائع کرنا، نئی نسل کے شاعروں کو مقام و مرتبہ دلانا، ان کی آن لائن کتابیں شائع کرنا اور جشن ریختہ جیسی عظیم الشان محفل میں اردو زبان کی تاج پوشی کرنا غیر معمولی عمل ہے۔ اس عمل سے سنجیو صراف کا حوصلہ اس قدر بلند ہے کہ وہ اب سرحد پار اردو کی نئی بستیوں میں جشن ریختہ کا جلوہ بکھیرنے جا رہے ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف جب خود سنجیو صراف کرتے ہیں تو ان کا ایک ایک لفظ دل کو چھو جاتا ہے اور سامعین کی سماعتوں میں شہد گھل جاتا ہے۔ ایک تقریب کے دوران سنجیو صراف نے ویب سائٹ ریختہ کی مذکورہ بالا باتوں کا ذکر کرتے

'اصناف ادب کی تدریس' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

ہوئے یہ بھی اعلان کیا کہ 14 سے 16 دسمبر تک اس مرتبہ بھی جشن ریختہ کا انعقاد دہلی کے ہاکی اسٹیڈیم میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ 8 دسمبر کو نیویارک میں جشن ریختہ کے عنوان سے تقریب کا انعقاد ہونے جا رہا ہے۔ اس کے بعد بیرون ملک کا یہ سفر دبئی سے ہوتا ہوا لندن تک اور اس کے بعد پوری دنیا تک ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہمارے لیے فخر کا مقام ہے کہ دنیا بھر کی ممتاز یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں ریختہ ویب سائٹ کو ریفرنس کے طور پر ریسرچ اسکالر اور محققین استعمال کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سنجیو صراف نے یہ بھی بتایا کہ ہماری کئی ٹیمیں اسکینر مشینیں لے کر لائبریریوں میں اردو کی کتابوں کو اسکین کر رہی ہیں اور ان دنوں دنیا کی مشہور و مقبول سینٹرل رضا لائبریری میں کتابوں کی اسکیننگ کا کام چل رہا ہے۔ علاوہ ازیں ریختہ کی ٹیم نے اب تک اردو گھر دہلی کی لائبریری، الہ آبادی یونیورسٹی کی لائبریری، غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری سمیت کئی دیگر لائبریریوں کی کتابوں کو اسکین کر کے کتابوں کو آن لائن کر دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 نومبر 2018

سترہویں صدی میں انڈو پرشین ادب

نئی دھلی: شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں بتاریخ 27 نومبر کو 'سترہویں صدی میں انڈو پرشین ادب دکن اور مغل کورٹ کے حوالے سے دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح ہوا، جس میں مہمان خصوصی کے طور پر احسان اللہ شکر اللّٰہی ڈائرکٹر پرشین ریسرچ سینٹر ایران کلچر ہاؤس نے شرکت کی۔ اس پروگرام کا افتتاح پروفیسر علیم اشرف خان صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے موضوع سے متعلق تعارفی کلمات کے ذریعے ہوا۔ اس موقعے پر تمام سابق صدور نے اس اہم موضوع کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا جن میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے سرزمین بخارا کی علمی و ادبی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے دورہ جہانگیر اور اکبر کے عہد پر بھی گفتگو کی۔ پروفیسر بلقیس نے اپنے خطاب میں دکن کے عادل شاہی اور قطب شاہی خاندان کی علمی اور ادبی خدمات پر تبصرہ کیا۔ اسی طرح صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ پروفیسر سید محمد اصغر نے جون پور اور بلگرام کی مغلیہ تاریخ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس عہد کے تمام حالات کا مختصراً جائزہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ ازبکستان سے آئے ڈاکٹر کامل نے ہندوستان اور ازبکستان کے قدیم روابط کا تفصیلی ذکر کیا۔ نیز اس افتتاحی سیمینار میں تین کتابوں پروفیسر شریف حسین قاسمی کی کتاب 'تلمیحات غالب'، پروفیسر ریحانہ خاتون کی کتاب 'تحقیق و تصحیح متن' اور ڈاکٹر سوامی کی 'امراؤ جان ادا' کے فارسی ترجمہ کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس افتتاحی پروگرام کی نظامت ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے کی۔ اس سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں سے شانتی نکیتن، الہ آباد، کشمیر یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مہمانان کرام آئے۔ اس افتتاحی پروگرام میں شکریہ کی رسم ڈاکٹر مہتاب جہاں نے ادا کی۔ ظہرانہ کے بعد دوسری نشست کا آغاز پروفیسر راجندر کمار کی صدارت میں ہوا، جس میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2018

دھلی:

اصناف ادب کی تدریس

نئی دھلی: 'متن کی صحیح قرأت، تدریس کا بنیادی مسئلہ اور حل ہے۔ تدریس کے بنیادی مبادیات سے اساتذہ کو واقف کرانا ضروری ہے، تدریس کا عمل بالکل مختلف عمل ہے، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحبان کی نگرانی میں این سی ای آر ٹی کی جو کتابیں اسکول کے طلبا کے لیے تیار ہوئی تھیں وہ بہت اہم ہیں اور کارآمد ثابت ہوئیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خالد محمود نے اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سیمینار 'اصناف ادب کی تدریس' کے صدارتی خطبے میں کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے فرمایا کہ تدریس متن سے متعلق کتابوں کا مطالعہ اساتذہ کے لیے لازمی ہے۔

تدریس کے لیے نہ صرف استاد کی اہمیت بلکہ طلبا کی بھی اہمیت ہے اور متن کی بھی اہمیت ہے۔ طلبا میں ادبی ذوق و شوق کو پیدا کرنا بھی اساتذہ کی ذمہ داری ہے۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے دوسرے مہمان خصوصی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اساتذہ کو تمام اصناف کی تدریس پر غور کرنا چاہیے۔ متن کو کلاس روم میں پڑھایا جانا لازمی ہے۔ داستانوں اور شعری اصناف کی قرأت کلاس میں لازمی طور پر کرائی جائے۔ پروفیسر انور پاشا نے اس اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہر پانچ سال پر نصاب اور تدریس کے طریقۂ کار میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اصناف ادب کی تدریس کے سلسلے میں ہمارے سامنے جو چیلنجز ہیں ان پر غور کیا جائے۔ اصناف کی تدریس کے لیے اساتذہ جدید تکنیک کا استعمال یقینی طور پر کریں۔ متن کی صحیح قرأت کے لیے آڈیو ویژول سلائڈ وغیرہ کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ افتتاحی اجلاس میں تمام مہمانوں کا خیر مقدم اردو اساتذہ اکادمی کے اعزازی ڈائریکٹر پروفیسر شہزاد انجم نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس اکادمی کا بنیادی مقصد اسکول کے اردو میڈیم اساتذہ کے لیے مواد کی تیاری کرنا اور ان کی ہر طرح علمی مدد کرنا ہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نوشاد عالم، کوآرڈینیٹر سیمینار نے کی۔

سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور پروفیسر ابن کنول نے کی۔ احمد محفوظ، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ارشاد نیازی، حنا آفریں، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر ثاقب عمران، خان محمد رضوان نے مقالے پیش کیے اور ڈاکٹر واحد نظیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت جناب حقانی القاسمی، ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر ابوبکر کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2018

جشن وراثت اردو

نئی دھلی: جشن وراثت اردو کے افتتاحی پروگرام میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق شیخ الجامعہ سید شاہد مہدی نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام جتنے بھی پروگرام منعقد ہوتے ہیں، ان کا اپنا ایک معیار ہے، اپنے معیار سے اس ادارے نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ جشن وراثت اردو اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس پروگرام کو اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اردو زبان و ادب کا کوئی

گوشہ مخفی نہیں رہے۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئر مین پروفیسر شہپر رسول نے اپنے استقبالیہ کلمات، میں کہا کہ اس پروگرام کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روایات کو عام لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔ افتتاحی پروگرام کے بعد 'ٹیلنٹ گروپ' نے قصہ: 'قوس کے اندر قصہ' (الف لیلہ) پیش کیا۔ اس کے بعد غزل سرائی کا مقابلہ ہوا جس میں کل 12 شرکا نے شرکت کی۔ محفل قوالی فرید صابری جے پوری نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح سے پیش کی کہ شام گل وگلزار ہوگئی، اس کے بعد شام غزل میں بالی ووڈ کے مشہور فنکار سریش واڈیکر نے رات کو اور بھی مسحور کن بنا دیا۔

دوسرے دن کا آغاز سب سے پہلے اسکولی طلبا کے لیے امنگ پینٹنگ کے مقابلے کا انعقاد کر کے کیا گیا۔ انعامی مقابلے کے بعد قصہ 'قصہ بلی کی تک بندی کا' پروگرام منعقد کیا گیا جسے ٹیلنٹ گروپ نے پیش کیا۔ محفل قوالی نظامی چشتی برادرس (دہلی) نے پیش کی۔ محفل غزل کے تحت شہاب خان نے متعدد کلاسیکل غزلیں پیش کیں۔ داستان گوئی کے تحت ونگس کلچرل سوسائٹی، دہلی نے 'ٹوپی کی داستان' پیش کی۔ انڈین اوپیرا فیوژن کے تحت صوفی گلوکار کابلی تھنہ نے امیر خسرو کے کلام کے ساتھ ساتھ داستان بھی پیش کی۔ صوفی محفل میں اندرا نائک نے اپنے فن کا جوہر دکھایا۔ منور معصوم نے قوالی سے اتوار کی شام کو اور بھی پرنور بنا دیا۔

تیسرے دن متعدد فنکاروں نے اپنے فن سے جہاں ناظرین و سامعین کے سامنے داستان کے پیرائے میں تاریخ بیان کی، وہیں کلاسیکی شاعری کو اس طرح سے پیش کیا کہ دہلی کا شاندار ادبی ماضی لوگوں کے سامنے آگیا ہے۔

چوتھے دن کا آغاز قصہ 'سیر پرانی دلی کی' سے ہوا جسے ٹیلنٹ گروپ نے پیش کیا۔ محفل قوالی کے تحت چنچل بھارتی اور ان کی ٹیم (دہلی) نے سماں باندھ دیا۔ روداد شیریں (موسیقی کے ساتھ داستان) کی پیش کش وسعت اقبال خاں (دہلی) نے کی۔ چاند قادری و ہمنوا (دہلی) نے قوالی پیش کیا۔ صوفی محفل میں پوجا گائونڈے (ممبئی) نے اپنے فن کا جوہر دکھایا۔ آخر میں معروف غزل گو احمد حسین محمد حسین (جے پور) نے اپنی خوبصورت غزلیں پیش کیں۔

'جشن وراثت اردو میلہ کے پانچویں دن کا آغاز 'قصہ بچپن کے کھیلوں کا' سے ہوا جسے ٹیلنٹ گروپ نے پیش کیا۔ محفل قوالی کے تحت شاہد سمیع نیازی و ہمنوا اور ان کی ٹیم (دہلی) نے سماں باندھا۔ 'پہلے آپ' کے عنوان سے اردو ڈراما اسٹیج کیا گیا، جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ نے پیش کیا۔ شام غزل میں غزل کو ذلفی خان صابری (دہلی) اور غزل گلوکارہ ستارہ نے اپنے پسندیدہ کلام سنائے۔ دہلی کی معروف غزل گلوکارہ رادھیکا چوپڑا نے اپنی آواز کا وہ جادو بکھیرا کہ کناٹ پلیس کا سینٹرل پارک تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ آخر میں محفل قوالی کے تحت اسلم وارثی و ہمنوا اور ان کے گروپ نے قوالی سے رات کو اور بھی پرنور بنا دیا۔

جشن وراثت اردو کے آخری دن کئی ثقافتی پروگرام انعقاد کیے گئے۔ چھ دن تک یہ یادگاری اور تاریخی پروگرام کا اختتام اس خوبی سے ہوا کہ لوگوں کو بہت دنوں تک یاد رہے گا۔ اس موقعے پر منیش سسودیا نے کہا کہ اردو کبھی ختم نہیں ہونے والی یہ اسی طرح پھلتی پھولتی رہے گی۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی اور یہ بھی کہا کہ نوجوانوں کا اس طرح کے پروگرام میں آنا اردو کے لیے خوش آئند ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 11 نومبر، انقلاب 12 نومبر، اخبار مشرق 13 نومبر، راشٹریہ سہارا 14 نومبر، انقلاب 15 نومبر، ہندوستان ایکسپریس دہلی 16 نومبر 2018

امیر خسرو کے کلام میں حقوق بشر

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام میر انیس ہال، دیار میر تقی میر میں رواں تعلیمی سیشن کا دوسرا توسیعی خطبہ بعنوان 'امیر خسرو کے کلام میں

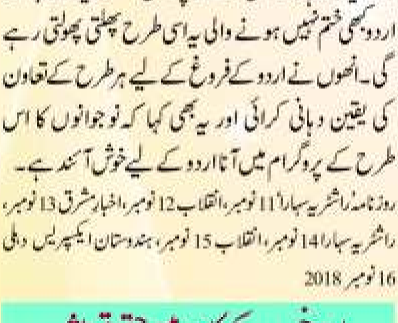

'مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات وخدمات' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

'جرمنی میں اردو زبان وادب' کے موضوع پر خصوصی لیکچر

حقوق بشر' منعقد ہوا۔ خطبے کا آغاز بی اے تھرڈ سمسٹر کے طالب علم شکیل الرحمٰن نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اس خطبے کے مقرر خاص ڈاکٹر سید تقی عابدی (کناڈا) تھے اور پروفیسر شہپر رسول نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ صدارت پروفیسر شہزاد انجم شعبۂ اردو نے کی جبکہ مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کرایا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے خطبے کے دوران کہا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ خسرو کی اصل باتیں ہم تک نہیں پہنچیں کیونکہ خسرو شناسی خسرو کی فارسی شاعری میں موجود ہے اور خسرو شناسی کا اصل ماخذ تذکرہ میخانہ ہے۔ اس سے بڑا خسرو شناسی کا کوئی دوسرا ماخذ نہیں ہے۔ آپ نے خسرو کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اولیا کی پشت پناہی ان کے ساتھ رہتی تھی اس وجہ سے بادشاہان وقت امیر خسرو سے مرعوب رہتے تھے۔ آپ نے کہا کہ علامہ اقبال کے بعض اشعار ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے خسرو کے اشعار کی ترجمانی کی ہے۔ خسرو کے کلام میں حقوق بشر کے عنوان سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم خسرو کے کلام کا مطالعہ کریں تو خسرو سے بڑا حقوق بشر کا پاسدار کوئی دوسرا نہیں ملے گا۔ اس سلسلے میں آپ نے اشعار کے ذریعے مختلف مثالیں پیش کیں۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اس طرح کے خطبات کا انعقاد شعبے، اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت سود مند ہوتے ہیں اور اس طرح کے پروگرام زبان و ادب کی شناخت کے لیے ضروری ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنی صدارتی تقریر میں اس خطبے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ بڑی محنت سے ادبی نکتے نکالتے ہیں اور قارئین کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ امیر خسرو کی مقبولیت یکساں طور پر فارسی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں کے شیدائیوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر عبدالحلیم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ خسرو ایک عظیم ہندوستانی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا محال ہوگا اور یہی پہلو ان کے مختلف الجہات شخصیت ہونے کا باعث ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 نومبر 2018

مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات وخدمات

نئی دھلی: مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات وخدمات پر منعقد ایک سمینار میں مقررین نے عظیم مجاہد آزادی مولانا آزاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ قصاب پورہ میں واقع جامعہ فیض العلوم میں مفتی شمیم احمد قاسمی کی سرپرستی اور حافظ محمد ارشاد احمد قریشی کی قیادت میں منعقد پروگرام کا آغاز تلاوت کلام الٰہی اور نعت پاک سے ہوا۔ اس دوران جامعہ کے ہونہار طلبہ نے مختلف ثقافتی پروگرام پیش کیے اور مہمانان نے تحائف دے کر بچوں کی عزت افزائی بھی کی۔ حیات وخدمات اور ان کے ذریعے تعلیمی شعبے اور تحریک آزادی میں کی گئی خدمات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور کہا کہ مولانا آزاد کی مثالی شخصیت آزادی اور عوامی، فلاح و بہبود، مساوات، تعلیم اور انصاف پر خدمات انجام دینے کے لیے ان کے قابل قدر کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ صلاح الدین قریشی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ظلم وتشدد میں مبتلا مسلمانوں کے لیے مولانا آزاد کی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے دی گئی تقریر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی، یہی نہیں مولانا آزاد کی سیاسی انقلابی تحریکوں کو ملک کسی صورت میں بھلا نہیں سکتا ہے۔ سمینار کی نظامت مولانا عارف جمیل نے کی جبکہ اظہار تشکر کے فرائض حافظ غفران نقشبندی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 نومبر 2018

30واں اردو ڈرامہ فیسٹول

نئی دھلی: تھیٹر، آرٹ اور کلچر کے حوالے سے ہم اپنی اس تہذیب کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جس میں امن، یکجہتی، انسانیت اور دردمندی شامل ہوتی ہے۔ اس بات کا اظہار خیال دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام 30 واں اردو ڈرامہ فیسٹول صفدر ہاشمی مارگ، منڈی ہاؤس واقع سری رام سینٹر سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اردو زندہ ہے، پیار ومحبت کو کوئی مار نہیں سکتا۔ یہی وہ زبان ہے جس نے انسان کو گفتگو کا سلیقہ سکھایا اور انقلاب زندہ باد جیسا نعرہ دیا۔ افتتاحی تقریب میں منیش سسودیا نائب وزیر اعلیٰ دہلی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور معروف قلمکار اور ممبر ساہتیہ کلا پریشد دلیپ پانڈے مہمان کے طور پر شریک رہے۔ اردو ڈرامہ فیسٹول کا آغاز راجیش تیواری کی ہدایت میں تھیٹر ریسرچ یونٹ فار اسٹیج ٹولس کے ذریعہ پیش کردہ طالب رامپوری کے تحریر کردہ ڈرامہ 'غالب ہمارا شاعر' سے ہوا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے۔

فیسٹول میں غالب ہمارا شاعر، سرائے کی مالکن، جلیاں والا باغ، ایک ٹکٹ رامپورا پھول۔ بنے۔ دیوالی کی وہ رات، دوسرا کمرہ اور موقع اچھا ہے پر مشتمل کل چھ ڈرامے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' 26،27،28، ہمارا سماج دہلی 29 نومبر، 1 دسمبر 2018

جرمنی میں اردو زبان وادب

نئی دھلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی طرف سے ہندوستانی زبانوں کے مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں معروف افسانہ اور ڈراما نگار اور مشہور شاعر اور سفرنامہ نگار عارف نقوی (مقیم حال برلن) کے استقبال میں ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ عارف نقوی نے جرمنی میں اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت پر خطاب کیا اور اپنے نصف صدی سے زیادہ کے تجربات ومشاہدات کو بیان کیا۔ عارف نقوی کا تعلق یوں تو لکھنؤ سے ہے لیکن وہ لمبے عرصے سے برلن، جرمنی میں قیام پذیر ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں تلاش سحر، زخموں کے چراغ، ایک سے چار، پیاسی دھرتی جلتے سائے، جرمنی کل اور آج، خلش، یادوں کے چراغ، نقوش آوارہ، کھلتی کلیاں، جرمنی میں نصف صدی، کیرم سے رشتہ، سوئے فردوس زمیں، طائر آوارہ، راہِ الفت میں گامزن اور متعدد ڈرامے شامل ہیں۔ عارف نقوی نے جرمنی میں اردو زبان وادب پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نہ صرف جرمنی میں بلکہ پورے یوروپ میں اردو زبان وادب ایک محبوب زبان کی

شکل اختیار کر رہی ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے عارف نقوی کا تعارف کراتے ہوئے ان کی تقریباً 60 سالہ خدمات کو سراہتے ہوئے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ان کا استقبال کیا اور کہا کہ عارف نقوی 67 سال سے برلن میں مقیم ہیں اور مستقل اردو زبان و ادب کے حوالے سے کام کر رہے ہیں، ان کی اپنی تنظیم انجمن اردو کے علاوہ بھی برلن میں اردو کی کئی تنظیمیں ہیں جو اردو کے فروغ میں سرگرم ہیں۔ اخیر میں پروفیسر انور پاشا نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو اور عارف نقوی کے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالی اور ان کی خدمات سے آگاہ کیا۔ جبکہ ڈاکٹر شفیع ایوب نے نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2018

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبات

نئی دهلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دو الگ الگ موضوعات پر توسیعی خطبات کا انعقاد شعبہ کے سمینار ہال میں کیا گیا۔ پہلا خطبہ شعبۂ فارسی کے استاد پروفیسر عراق رضا زیدی نے 'فارسی غزل کے اردو غزل پر اثرات' کے عنوان پر پیش کیا۔ خطبے کے دوران اردو غزل پر فارسی غزل کے اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ برصغیر میں اردو غزل پر فارسی غزل کے بہت نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ انھوں نے حافظ، رومی، خسرو، میر و غالب اور اقبال کے کلام کو بطور نمونہ پیش بھی کیا۔ اس خطبے کے کنوینر ڈاکٹر خالد جاوید تھے۔ مہمان مقرر کا تعارف ڈاکٹر خالد مبشر نے پیش کیا۔ اس کے فوراً بعد دوسرے خطبے کا انعقاد عمل میں آیا، جس کے مقرر پروفیسر حبیب اللہ خاں، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے۔ انھوں نے 'عربی میں اردو زبان و ادب کے ترجمے کی روایت' پر خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے ترجمے کے اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ دراصل ایک زبان کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایک پوری تہذیب کے منتقل کرنے کا نام ہے۔ اس کے علاوہ مقررین نے ہند و عرب کے تعلقات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اس کی تاریخی و ثقافتی پس منظر کو بہت ہی واضح انداز میں بیان کیا۔ دوسرے خطبے کے کنوینر شعبے کے استاد ڈاکٹر ندیم احمد تھے۔ انھوں نے مہمان مقرر کا تعارف پیش کرتے ہوئے ترجمے کے اہم نکات کی طرف بھی اشارہ کیا۔ دونوں توسیعی خبات کی صدارت فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے خطبے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر کم وقت میں بنیادی معلومات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ دونوں توسیعی خطبات سے قبل صدر شعبہ پروفیسر شہپر رسول نے دونوں مہمان مقررین کا صمیم قلب سے استقبال کیا اور کہا کہ ہم آئندہ دوسری زبانوں کے ماہرین کو بھی مدعو کریں گے، تاکہ ہمارے طلبا ان سے مستفیض ہو سکیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2018

اترپردیش:

یومِ اردو اور یومِ تعلیم

الہ آباد: الہ آباد یونیورسٹی کے احتشام حسین ہال میں دو روزہ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر مجاور حسین

سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد نے یوم اقبال کے تعلق سے کہا کہ اقبال ملت آدم میں یقین رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کسی قوم کے لیے نہیں تھی نہ ہی وہ صرف عالم اسلام کے شاعر تھے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری عالم انسانیت کے لیے کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کوئی زبان نہیں ہے اردو ایک کلچر ہے جب آپ اردو جانیں گے تبھی آپ بیٹھنا اٹھنا جانیں گے۔ اردو پڑھیں تاکہ آپسی بھائی چارہ قائم کر سکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر بات کرتے ہوئے پروفیسر مجاور نے کہا کہ جس وقت مولانا نے الہلال نکالا ملک کی آبادی صرف 17 کروڑ تھی۔ آبادی کے لحاظ سے اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی تھی۔ انھوں نے مولانا کی دو تقریروں کا بھی ذکر کیا جو جامعہ مسجد سے انھوں نے کی تھیں جن میں انھوں نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا تمھاری گنگا جمنی تہذیب کا کیا ہوگا، تمہارا ملک چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے ہماری تہذیب تمھیں پکار رہی ہے۔"

خصوصی مہمان پروفیسر کے ایس مشرا ڈین فیکلٹی آف آرٹس، الہ آباد یونیورسٹی نے کہا کہ ہمیں اقبال کی فکر سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اقبال اگر صرف یہ سوچتے کہ میں اردو کے علاوہ کچھ نہیں پڑھوں گا تو کیا وہ آفاقی شاعر بن پاتے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شبنم حمید الہ آباد یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اقبال آفاقی شاعر تھے۔ اس دنیا میں تو انھیں یاد کیا جاتا ہے بلکہ آسمانوں میں بھی انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ اعزازی مہمان پروفیسر عبدالقادر جعفری نے کہا کہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کتنے محب وطن تھے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال جس عہد میں تھے وہ سامراجیت کا دور تھا۔ اقبال بہترین شاعر تو تھے ہی لیکن وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی شعبہ اردو نے کہا کہ 9 نومبر کو اقبال پیدا ہوئے اور 11 نومبر کو مولانا ابوالکلام آزاد پیدا ہوئے۔ ان دونوں نے ہی وطن پرستی اور انسان دوستی کا پیغام دیا ہے۔ ایک نے نثر میں اور دوسرے نے شاعری میں دیا۔ دونوں ہی جتنے گہرے اور مضبوط مفکر تھے اتنے ہی سچے وطن پرست بھی تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں دونوں کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 15 نومبر 2018

جدید تعلیم اور مسلمان

علی گڑھ: سرسید اویرنس فورم کے ذریعے پالیٹکنک آڈیٹوریم، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 'جدید تعلیم اور مسلمان' موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ کرناٹک کے بانی و چانسلر ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی کو فورم کی جانب سے 'محسن ملت' کا خطاب دیا گیا۔ مہمان خصوصی جناب خسرو حسینی نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے تعلیم کا حصول انتہائی ضروری ہے۔ آج کے دور میں صرف وہی لوگ ترقی کر سکتے ہیں جو بدلتے حالات میں خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار عبدالحمید، آئی پی ایس نے کہا کہ مسلمان جدید تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اور سچر کمیٹی نے اس سچائی کو اجاگر کر دیا ہے کہ تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے مسلمان شڈول کاسٹ

اور شڈول ٹرائبز سے بھی پیچھے ہوگئے ہیں۔ حالات صرف جدید تعلیم حاصل کرنے سے بھی ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ فورم کے صدر پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ مسلمان بارہویں صدی تک یعنی تقریباً چھ سو سال تک علم، تحقیق، سائنس اور جدید خیالات کی وجہ سے دنیا میں اوّل رہے اور دنیا پر حکمرانی کی۔ خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالجلیل خان پٹھان نے کہا کہ حسینی صاحب کو محسن ملت ایوارڈ دیا جانا صحیح سمت میں صحیح کام کیا جانا ہے جس کے لیے پروفیسر صمدانی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر محب الحق نے کہا کہ مسلمانوں نے عصری تعلیم کی طرف بہت دیر میں توجہ دی جس کی وجہ سے وہ پچھڑ گیا۔ اس موقعے پر انجم تبسم، گلبرگہ اور جناب طارق حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایکسلینس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت مسلم یونیورسٹی کی طالبہ عائشہ صمدانی نے کی اور سینئر اسٹوڈنٹ منصور الٰہی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2018

ہیریٹیج واک

پورے ڈلئی، بارہ بنکی: لائنس کلب کے زیر اہتمام یوم اتحاد کے موقعے پر تاریخی قصبہ ردولی کو صاف ستھرا بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخی وراثت کو سنبھالنے و اس سے عوام کو متعارف کرانے کی غرض سے 'ہیریٹیج واک' (تاریخی مقامات کا دورہ) کا انعقاد کیا گیا۔ معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر شارب ردولوی نے ردولی کی تاریخی عمارت 'دودھا دھاری' سے جھنڈا دکھا کر اس ہیریٹیج واک کی شروعات کی اور اس کی قیادت بھی کی۔ دودھا دھاری ہندو مسلم اتحاد کی مثال ہے، اس کی تعمیر 1901 میں کانشی رام جیسوال نے کی تھی اس میں تین مسجدیں، چار امام باڑے، ایک پری گھر اور ایک جنات گھر ہے۔ اس کے بعد ردولی کے مشہور صوفی مخدوم عبدالحق ردولی کی 603 سال قدیمی درگاہ، بعد ازیں امام باڑہ حسینیہ ارشادیہ جو کہ چودھری ارشاد حسین نے بنوایا تھا۔ آخر میں دیوکالی کے قدیم مندر پر ہیریٹیج واک کا اختتام ہوا۔ ہیریٹیج واک کے اختتام پر ہنومان ٹیلہ میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ردولی ایم ایل اے رام چندر یادو اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے سابق ایم پی ڈاکٹر نرمل کھتری نے شرکت کی۔ جے این یو کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی نے کہا کہ قصبہ ردولی گنگا جمنی تہذیب کی نہ صرف ایک مثال ہے بلکہ یہ اتحاد اور بھائی چارے کا علمبردار بھی ہے۔ اس موقعے پر معروف مورخ ڈاکٹر یوگیش پروین لکھنوی، شوبھت اگروال، نواب میر جعفر عبداللہ، آشیش شرما نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر ایک کتابچہ 'ردولی کے تاریخی مقامات: ہماری تہذیب ہماری وراثت' کا رسم اجرا بھی ہوا۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر نہال رضا نے مہمانوں کا استقبال کیا اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2018

عصر حاضر میں مولانا آزاد کے افکار کی معنویت

لکھنؤ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں 'آزاد ڈے' اور 'قومی یوم تعلیم' پر 'عصر حاضر میں مولانا آزاد کے افکار کی معنویت' کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبر ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ نے کی اور بطور مہمان خصوصی مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز عمار احسن کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا بعدہ مبشرہ لئیق نے حمد باری پیش کی۔ بشریٰ، ہما، خوشندا، زیبا اور مبشرہ نے ترانہ مانو پیش کیا۔ مانو لکھنؤ کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ نظامت ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے کی۔ مولانا غازی پوری نے کہا کہ مولانا آزاد کی مثبت سوچ اور مفکرانہ پیغامات کا تقاضا ہے کہ ہم حالات سے نہ گھبرائیں۔ دور حاضر میں ضرورت ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ مولانا آزاد کی زندگی سے ہمیں حقیقت پسندی کا درس ملتا ہے۔ ماہر قانون ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مولانا آزاد سرسید سے متاثر تھے، میں نے ان دونوں شخصیات میں ایک صفت مشترک دیکھی کہ دونوں کے اندر خدا پر کامل یقین اور پختہ ایمان بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ سرسید نے لاکھ مخالفت کے باوجود اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریز ظالموں کو آئینہ دکھانے کا کام کیا تھا اور مولانا آزاد نے بھی انڈیا ونس فریڈم لکھ کر انگریزوں کے ظلم و استبداد کی تاریخ کے ساتھ ساتھ آزادی کی تحریک کی منافقتوں کو اجاگر کرنے کا کام کیا ہے۔ ان کے قلم سے ایسی تحریریں نکلیں جو افکار عالیہ میں شمار ہورہی ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے متعارف کرایا جائے۔ مانو لکھنؤ کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے کہا کہ مولانا آزاد نہ صرف ماہر تعلیم تھے بلکہ مفکر تعلیم بھی تھے۔ مولانا آزاد ہی نے یو جی سی کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے ہندوستان میں نظام تعلیم مستحکم ہوا۔ اس موقعے پر کیمپس کے تمام اساتذہ، طلبہ و طالبات، کارکنان اور شہر کی معزز شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 نومبر 2018

یوم اردو کا اہتمام

مراد آباد: ماڈرن پبلک اسکول میں یوم اردو پورے جوش و خروش کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے کی جبکہ نظامت معین الدین و مولانا رحمت علی نے مشترکہ طور پر کی۔ پروگرام کا آغاز محمد ریان کی تلاوت سے ہوا۔ مدرسہ شاہی کے طالب علم محمد عمران نے نعت پاک پیش کی۔ بارگاہ رسالت میں اسکول کی طالبہ نے نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ عبدالہادی نے علامہ اقبال کا ترانہ ہندی پیش کیا۔ فرح ناز نے غزل پیش کی۔ ماڈرن پبلک اسکول کے پرنسپل نے بتایا کہ علاقے کا واحد اسکول ہے جہاں بچوں کو درجہ اوّل سے لے کر درجہ دس تک اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان کی تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ یہاں اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ہر طرح سے ان کی اصلاح کی جاتی ہے۔ صدر جلسہ منصور عثمانی نے اپنے خطاب میں خوشی کا اظہار کیا اور اسکول کے طلبہ اور خاص طور سے اسکول کے ذمہ داران کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کی اور اس طرح کے پروگراموں کو مسلسل کرتے رہنے کا مشورہ دیا تاکہ طلبہ کے اندر صلاحیتیں سب کے سامنے اجاگر ہوسکیں اور مستقبل میں دنیا کے لیے ایک نظیر بن جائیں۔ اس موقعے پر پرنسپل شکیل احمد، سرفراز خان، ڈاکٹر ابھے شیتل، مشکور احمد، اتمش وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 نومبر 2018

قاضی عبدالستار اپنے فن کے آئینے میں

علی گڑھ: معروف فکشن نگار قاضی عبدالستار کے فن و شخصیت کے حوالے سے بلال ہاؤس نگلہ ملاح سول لائن علی گڑھ میں ادبی و ثقافتی انجمن 'گلشن ادب' کی جانب سے ایک مذاکرہ بعنوان 'قاضی عبدالستار اپنے فن کے آئینے میں' منعقد کیا گیا جس کی صدارت استاد الشعرا ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر رضی امروہوی شامل ہوئے۔ نظامت کے فرائض سید محمد عادل فراز نے انجام دیے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر بلال نقوی نے کہا کہ ''قاضی عبدالستار کی شخصیت جہاں ایک فکشن نگار ہونے کے ناطے سے مقبول ہے، وہیں وہ ذاتی طور پر رقیق القلب، ہمدرد اور اپنے طلبہ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹر رضی امروہوی نے کہا کہ ''قاضی عبدالستار اپنے ناولوں کے فکر و فن، موضوع، ہیئت اور اسلوب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ سید محمد عادل فراز

نے کہا کہ ''اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز عبدالحلیم شرر نے کیا لیکن قاضی عبدالستار کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی ناول نگاری کو بامِ عروج عطا کیا۔ ڈاکٹر سرور مارہروی نے کہا کہ قاضی عبدالستار کے ناولوں میں تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے واقعات و حادثات، اور فسادات کی جھلک ملتی ہے۔ اس دور میں انسانیت کا استحصال جس صورت میں ہوا قاضی اس کی بہترین منظرکشی کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر شجاعت حسین نے کہا کہ ''قاضی عبدالستار کا ناول داراشکوہ ایک بڑی سلطنت کے مشہور ولی عہد داراشکوہ کے سیاسی عروج وزوال کی داستان پیش کرتا ہے۔ اس عہد کی پوری تاریخ داراشکوہ کے ایک سو بارہ صفحات میں دل دوز انداز میں بیان کی گئی ہے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 9 نومبر 2018

سرسید تقریبات

میرٹھ: سرسید کا سیکولرزم قابل تقلید ہے۔ سرسید کے عہد اور ان کے قبل کی تحریکوں نے مذہب کا سہارا لیا تھا جبکہ سرسید نے اپنی تحریک کے لیے مذہب کا استعمال نہیں

کیا۔ انھوں نے مذہب میں اصلاح کی کوشش تو کی لیکن رواداری اور اخوت و مساوات کو اپنا مشن بنایا۔ آج کے حالات کے تناظر میں ایک بار پھر سرسید کے مشن کی تقلید انتہائی ناگزیر ہے۔' یہ الفاظ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایمریٹس پروفیسر ڈاکٹر شمیم حنفی کے تھے۔ وہ سی سی ایس یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی کے باہمی اشتراک سے منعقد ہورہے چہار روزہ جشن سرسید تقریبات کے چوتھے اور آخری دن پریم چند سیمینار ہال میں واقع یونیورسٹی کیمپس میں اختتامی جلسے سے خطاب کررہے تھے۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض پروفیسر شمیم حنفی نے انجام دیے، جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر یوگیندر سنگھ اور مہمانان ذی وقار کے طور پر پروفیسر رضاء اللہ خاں، ڈاکٹر معراج الدین احمد سابق آبپاشی وزیر حکومت یوپی، اعظم میر، سکریٹری اولڈ بوائز ایسوی ایشن علی گڑھ، سابق فائنانس افسر خورشید احمد خاں نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی اور نوازش مہدی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ استقبالیہ پروگرام کا مفصل خاکہ اور سرسید کے مشن کا مفصل تعارف پروفیسر اسلم جمشید پوری نے پیش کیا۔ جبکہ ایوارڈ یافتگان میں سے پروفیسر شمیم حنفی کا تعارف ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر جمال احمد صدیقی کا تعارف ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر بی ایس یادو کا تعارف ریسرچ اسکالر سعدیہ قمر اور ڈاکٹر کوثر جہاں کا تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے پیش کیا اور شکریہ سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی کی صدر نایاب زہرا زیدی نے ادا کیا۔ سرسید تقریبات کے آخری دن کا پروگرام دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ قومی سیمینار کے لیے مخصوص تھا جس کا عنوان 'عصر حاضر میں سرسید کی معنویت' تھا جس میں عامر نظیر ڈار دہلی یونیورسٹی، غلام نبی کمار دہلی یونیورسٹی، مفتی راحت علی صدیقی، شوبی زاہرہ نقوی اور تسلیم جہاں، میرٹھ یونیورسٹی، ابراہیم افسر، میرٹھ کالج، گلشن جہاں، اے ایم یو، علی گڑھ، محمد آدم جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ نے اپنے مقالات پیش کیے اور مجلس صدارت میں پروفیسر یوگیندر سنگھ، ایڈووکیٹ سرتاج احمد، ڈاکٹر محمد کاظم، طالب زیدی، ڈاکٹر مشتاق احمد قادری، انجینئر رفعت جمالی، سید معراج لدین احمد، عابد حسین حیدری شریک ہوئے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مظفر حسین سید نے کہا کہ دراصل سرسید عالمی خیال، حقیقی معنی میں مسلم معاشرے کو تہذیب نو کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ آج علی گڑھ برادری پورے عالم میں اپنی مادر درسگاہ کا نام روشن کررہی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی کی خدمت میں سرسید انٹرنیشنل ایوارڈ، برائے ادبی خدمات، ڈاکٹر جمال احمد صدیقی، ڈاکٹر بی ایس یادو اور ڈاکٹر کوثر جہاں کی خدمت میں سرسید نیشنل ایوارڈ برائے تعلیمی خدمات پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارشاد علی کی کتاب 'چاندنی بیگم: ایک مطالعہ' کے دوسرے ایڈیشن کا اجرا پروفیسر شمیم حنفی کے ساتھ ساتھ دیگر مہمانوں نے مشترکہ طور پر کیا۔ پروفیسر یوگیندر سنگھ نے سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی اور شعبہ اردو کے اراکین کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں مصلح قوم اور ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان اور اچھے استاد تھے۔ استاد کی کوئی ذات، برادری اور مذہب نہیں ہوتا۔ اس موقعے پر پروفیسر رضاء اللہ خاں، ڈاکٹر معراج الدین احمد اور اعظم میر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرکے سرسید کے اصولوں کو اپنانے اور ان کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کی ترغیب دی۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 اکتوبر 2018

بہار:

جنگ آزادی میں علما کا کردار

پٹنہ: آزادی کا سورج لاکھوں شہیدوں کے خون سے نکلا ہے۔ ہم انگریزوں کے غلام ہورہے ہیں اس بات کا احساس سب سے پہلے نواب سراج الدولہ کو ہوا تھا جس کے بعد انھوں نے انگریزوں کو بنگال سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہ بات منگل کو یہاں پٹنہ میوزیم میں کاشی پرساد جیسوال انسٹی ٹیوٹ میں کے پی جیسوال یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اخترالواسع نے کہی۔ 'جنگ آزادی میں علما کا کردار' موضوع پر خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر نے کہا کہ جنگ آزادی کا پہلا سبق صوفیائے کرام نے دیا، مجنوں شاہ مداری نے 1762 میں اس تحریک کو شروع کیا جو تقریباً 20 سال تک چلی۔ اس تحریک میں دھیرے دھیرے کسان بھی شامل ہوگئے۔ مجنوں شاہ کے بعد یہ جنگ ٹیپو سلطان کے حصے میں آئی۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان کی بھی شہادت ہوگئی۔ اسی کے بعد انگریزوں نے کہا تھا کہ اب ہندوستان ہمارا ہوگیا۔ مداری صوفیوں نے مجنوں شاہ کی قیادت میں جس تحریک کی شروعات کی تھی وہ دھیرے دھیرے پورے ہندوستان میں پھیلنے لگی۔ شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کی بڑھتے ہوئے اقتدار سے مقابلہ کرنے کا فتویٰ دیا کہ ان سے جہاد کرنا ہے۔ اس خاندان کے ایک شخص شاہ اسماعیل شہید اور رائے بریلی کے سید احمد شہید نے مل کر'دعوت جہاد' شروع کی۔ اخترالواسع نے بتایا کہ 1857 کی تحریک میں حصہ لینے والے کافی لوگ سید احمد شہید کے خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی کی تحریک میں علما صادق پوری کے اقدامات کافی اہم ہیں۔ یہ پٹنہ کی سرزمین کا وقار ہے کہ اس جگہ ایسا خاندان پیدا ہوا جس نے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جانیں نچھاور کردیں۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک کو آزادی اس لیے ملی کہ ہر طبقے، ہر فرقے اور ہر علاقے

نے اپنی ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔ جلسہ کے مہمانان خصوصی پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر راس بہاری پرساد سنگھ نے کہا کہ ملک نے آزادی کے بعد ترقی تو کی ہے لیکن اتحاد و اتفاق میں کمی آئی ہے، انھوں نے زور دے کر کہا کہ خوش حال گھر وہ کہلاتا ہے جہاں دولت کی ریل پیل چاہے نہ ہو لیکن لوگ مل جل کر رہتے ہوں۔ بہار آرکائیو کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر وجے کمار نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا جبکہ خدابخش اورینٹل لائبریری کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر امتیاز احمد نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ علمائے صادق پور کا مکان ایک مرکز کی طرح تھا جہاں جنگ آزادی کی تحریک کے قافلے جمع ہوتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2018

تلنگانہ:

احساس کا سفیر: گلزار

حیدرآباد: اردو سے عشق ہے تو اردو زبان کو زندہ رکھیں

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2018

اور اسے نظرانداز نہ کریں۔ کیونکہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور وہ ہندوستانی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر، نغمہ نگار و فلم ساز جناب گلزار نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ایک روزہ قومی سمینار 'احساس کا سفیر: گلزار' کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے کی۔ گلزار نے جو اردو بالخصوص مرزا غالب سے اپنے عشق کے لیے شہرت رکھتے ہیں مشورہ دیا کہ اردو کے مروجہ الفاظ ضرور استعمال کریں ورنہ اردو مٹ جائے گی۔ اردو نے ہمیشہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمویا ہے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ اردو کا دامن پراکرت، سنسکرت حتیٰ کے انگریزی الفاظ سے مرصع ہے۔ بالی ووڈ فلموں میں استعمال کی جانے والی 90 فیصد زبان اردو ہی ہے۔ بطور خاص ہندی والے اردو زبان کا بڑا شوق رکھتے ہیں مگر وہ اس کا صحیح تلفظ نہیں جانتے اس لیے ہماری ذمے داری ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کریں۔ اس سے اردو رسائی میں اضافہ ہوگا۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنی مشہور نظمیں کتابیں، یہ کیسا عشق اردو زباں کا، ٹیبل لیمپ اور بلی ماران مخصوص انداز میں پیش کرتے ہوئے حاضرین سے زبردست داد حاصل کی۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو یونیورسٹی سے گلزار کا رشتہ کافی پرانا ہے۔ گلزار کو یونیورسٹی نے 2012 میں اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کی تھی۔ گلزار نے 2014 میں اردو یونیورسٹی کا مقبول عام ترانہ تحریر کیا۔ گلزار یونیورسٹی کے ایگزیکیٹیو کونسل کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ ممتاز اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا اور گلزار کو 21 ویں صدی میں اردو کا عظیم شاعر قرار دیا۔ گلزار آسان اور سلیس زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ارباب مجاز سے درخواست کی کہ گلزار کی شاعری کو شامل نصاب کیا جائے۔ انھوں نے 'تروینی' کو ایک نئی صنف ادب قرار دیا اور بتایا کہ اس میں صرف تین مصرعوں پر مشتمل نظم کہی جاتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب 'گلزار کی تخلیق تروینی، تشریح و تجزیہ' کا اجرا عمل میں آیا۔

مہاراشٹر:

اردو افسانہ اور سعادت حسن منٹو

سولاپور: انجمن فروغ اردو، سولاپور کے زیراہتمام مورخہ 13 اکتوبر 2018 بروز سنیچر کو بزم غالب سولاپور میں 'اردو افسانہ اور سعادت منٹو' عنوان پر خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خلیق الزماں نصرت کی صدارت میں پروگرام کا آغاز ہوا۔ انجمن کے صدر پروفیسر ڈاکٹر غوث احمد شیخ (ریسرچ گائیڈ سولاپور یونیورسٹی) نے ادارے اور پروگرام کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ آصف اقبال نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ پرنسپل ڈاکٹر غلام دستگیر شیخ نے منٹو کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ منٹو کی تخلیقات اصل انسانیت کا ایک مکمل جہان ہیں جس میں سچے انسان کی تلاش اور انسان کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے کہیں کہیں کوئی قباحت محسوس نہیں کی گئی ہے جو دیکھا اور محسوس کیا اسے بیباکی سے لکھ دیا ہے۔ معروف افسانہ نگار ایم مبین (بھیونڈی) نے کہا کہ منٹو کی تحریروں نے اردو ادب کو آفاقی بنادیا۔ ایم مبین نے مزید کہا کہ ادبی تناظر میں سعادت حسن منٹو کو نئے قارئین تک پہنچانے کی ضرورت ہے کیونکہ منٹو اردو ادب کا وہ واحد اثاثہ ہے جسے عالمی سطح پر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ انسان میں موجود جنسی جرائم کی ہوس کو منٹو نے بڑی بیباکی سے بیان کیا ہے۔ صدر جلسہ خلیق الزماں نصرت نے کہا کہ سچا ادب زمان و مکان سے پرے آفاقی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ منٹو اس کی عمدہ مثال ہیں۔

ہفت روزہ 'اردو میلہ' ممبئی، 25-19 اکتوبر 2018

مغربی بنگال:

جاوید نہال: حیات وفن

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے کولکاتہ میں منعقدہ ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'جاوید نہال: حیات وفن' کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جاوید نہال بیک وقت کئی حیثیتوں کے حامل تھے۔ بنیادی طور پر وہ محقق تھے اور اپنی کتاب 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب' کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اصلاً یہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا جو بعد میں جزوی ترمیم کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کہا کہ جاوید نہال افسانہ نگار بھی تھے اور انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا اور خاکے بھی لکھے۔ بچوں کے لیے بھی انھوں نے چند کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے کولکاتہ کے قلم کاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دہلی سے بنگال تک اردو کی کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ سمینار میں ایک درجن سے زائد مقالہ نگاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جاوید نہال کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ سامعین کی کثیر تعداد کے علاوہ اکیڈمی کے عہدے داران بھی شروع سے آخر تک سمینار میں موجود رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 نومبر 2018

ہریانہ:

قرآن پاک کا میواتی زبان میں ترجمہ

پانی پت: تحقیقی کتاب 'تمدن میوات' کے مصنف قیس چودھری چھرکلوت کی دختر تارا قیس میو نے قرآن پاک کا میواتی زبان و ادب میں ترجمہ کرکے تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے، جس پر نظر ثانی تارا قیس کے والد قیس چودھری کررہے تھے۔ قیس چودھری درجنوں کتابوں کے مصنف

اور ادیب ہیں۔ زیر بحث اس قرآنی ترجمہ کا رسم الخط تو اردو میں ہے، البتہ اس کے الفاظ اور توضیحات میوزبان میں ہیں۔ لخت جگر تارا قیس کا کہنا ہے کہ میرے ترجمہ کو میرے والد تنقیدی نگاہ سے دیکھیں تو یہ میرے لیے فخر کی بات ہے۔ ایک دوسرے دانشور ریاض نور کا کہنا ہے ہندو و پاک میں میواتی زبان میں قرآن پاک کے حوالے سے غالباً یہ پہلا کام ہے۔ میواتی کلچرل ترانہ نغمہ نگار ریاض نور میو نے تارا قیس کے اس کام کی ستائش کرتے ہوئے انقلاب کو بتایا کہ ساری دنیا کی میو برادری کو تارہ قیس کی اس فخریہ کاوش پر ناز ہے، کیونکہ تارا قیس کے اس عمل سے قوم اور مذہب سے جہاں محبت کا اظہار تعلق واضح ہوتا ہے، وہیں میواتی زبان وادب کی خدمت بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2018

اعزاز و اکرام:

غالب انسٹی ٹیوٹ کے غالب ایوارڈ کا اعلان

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈ کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ 19 نومبر کو ایوان غالب میں غالب ایوارڈ کمیٹی کے چیئرمین جسٹس آفتاب عالم کی صدارت میں ہوئی، جسٹس آفتاب عالم کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اطہر فاروقی

اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر میٹنگ میں موجود تھے۔ اس اہم موقعے پر تمام ممبران نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروقار غالب انعامات 2018 کے 6 اہم انعامات پر فیصلہ کیا۔ اردو کے ممتاز ناقد و دانشور، کئی اہم کتابوں کے مصنف اور شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر شین اختر کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق و تنقید سے سرفراز کیا جائے گا۔ فارسی کے نامور اسکالر اور مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شرف عالم کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق و تنقید کے لیے منتخب کیا گیا۔ معروف تخلیق کار پروفیسر حسین الحق کا نام غالب ایوارڈ برائے اردو نثر کے لیے طے کیا گیا۔ عہد حاضر کے نامور شاعر اور بین الاقوامی شہرت کے حامل جاوید اختر کا نام غالب انعام برائے اردو شاعری کے لیے تجویز کیا گیا۔ ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ کے لیے مشہور ڈرامہ نگار اور اپنی تحریروں کے ذریعے اردو زبان وادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے والے اہم ڈرامہ نویس پروفیسر دانش اقبال کے نام پر اتفاق ہوا۔ اور مجموعی علمی خدمات کے لیے ممتاز دانشور اور مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع کے نام پر میٹنگ میں بیٹھے تمام لوگوں نے اتفاق کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 نومبر 2018

عالمی یوم اردو ایوارڈ

نئی دھلی: ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے یوم پیدائش پر ایک پروگرام کے دوران مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات

انجام دینے والی شخصیات کو 'عالمی یوم اردو ایوارڈ 2018' سے نوازا گیا۔ حضرت نظام الدین بستی میں واقع غالب اکادمی میں عالمی یوم اردو کے موقعے پر یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے اشتراک سے منعقد تقریب کی صدارت معروف دانشور پروفیسر عبدالحق، جبکہ سرپرستی مشہور ادیب ڈاکٹر سید فاروق اور مہمان خصوصی کے طور پر راشٹریہ سہارا (اردو) کے ایڈیٹر سید فیصل حسن عابدی نیز مہمان ذی وقار کے طور پر اے رحمان ایڈووکیٹ اور محترمہ ممتالال نے شرکت کی۔ پہلے سیشن کا آغاز مولانا برہان اختر قاسمی کی تلاوت قرآن سے ہوا جبکہ ڈاکٹر تابش مہدی نے نعتیہ کلام پیش کیا اور متین امروہوی نے نظم پیش کی۔ اس دوران مہمانان کے ہاتھوں مختلف کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر 'عالمی یوم اردو ایوارڈ یافتگان: 2018' کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جن میں ڈاکٹر محمد خالد صدیقی (اردو اور یونانی کے فروغ میں لائف ٹائم اچیومنٹ)، محمد فخر امام (مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ برائے صحافت)، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی (منشی پریم چند ایوارڈ برائے تعمیری ادب)، جاوید قمر (مولانا عثمان فارقلیط ایوارڈ برائے اردو صحافت)، عبدالباری مسعود (مولانا محمد مسلم ایوارڈ برائے صحافت)، ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی (قاضی عدیل عباسی ایوارڈ برائے ادب)، معین شاداب (حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شاعری)، محمد نوشاد عالم ندوی (مولانا عبدالماجد دریابادی ایوارڈ برائے صحافت)، حبیب سیفی (مولانا اسمٰعیل میرٹھی ایوارڈ برائے ادب واطفال)، انصاری اطہر حسین (محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت)، محترمہ سیما کرن (پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایوارڈ برائے ہندی صحافت)، صلاح الدین مقبول احمد مدنی (شیخ الاسلام ابن تیمیہ ایوارڈ)، محمد شاہد صدیقی (ہمالیائی اردو ایوارڈ)، ڈاکٹر خالد انور (مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ)، محمد مستقیم (مولانا عثمان فارقلیط ایوارڈ)، اطہر حسین ساحر (محفوظ الرحمان ایوارڈ) اور احسن اعظمی (حفیظ جالندھری ایوارڈ) شامل ہیں۔ تقریب کے دوسرے سیشن میں 'اردو قارئین میں اضافہ کی صورتیں' کے عنوان پر مولانا مجیب بستوی، محمد زاہد آزاد، مولانا محمد رحمانی مدنی، شیخ صلاح الدین مقبول و دیگر نے پر مغز گفتگو کی۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے چیف ڈاکٹر سید احمد خان نے اختتام پر تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا جبکہ نظامت کے فرائض معروف صحافی سہیل انجم نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 نومبر 2018

امتیاز احمد غازی کو کلدیپ نیر اعزاز

غازی پور: غازی پور ضلع کے دلدار نگر تھانہ حلقہ واقع موضع رکسہاں کے باشندے امتیاز احمد غازی کو الہ آباد میں 'کلدیپ نیر اعزاز' سے نوازا گیا۔ امتیاز احمد غازی کو یہ اعزاز پروگرام کے مہمانان خصوصی مغربی بنگال کے گورنر پنڈت کشری ناتھ ترپاٹھی اور الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سدھیر نارائن نے مشترکہ طور پر دیا۔ اس سے خطے کے لوگوں میں جشن کا ماحول ہے۔ پریاگ راج کی ادبی تنظیم 'سمن وئے' کی جانب سے منعقد اس تقریب میں ملک بھر کے دو درجن سے زائد ادیبوں، سماجی کارکنوں کے علاوہ دیگر مختلف شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں کو ان کی اچھی کارکردگی کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ جس میں غازی پور ضلع کے امتیاز احمد غازی بھی شامل ہیں۔ اس سے قبل امتیاز احمد غازی کو کئی اہم انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ امتیاز احمد غازی کی اب تک تین کتابیں شاعری گرائمر، امتیاز احمد غازی کے سو شعر اور ساہتیک وراثت' شائع ہو چکی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2018

شیخ نگینوی علامہ اقبال ایوارڈ سے سرفراز

دھام پور: اردو ادب کی دنیا میں اپنی خاص پہچان بنانے میں کامیاب، دبستان بجنور کے مصنف ادیب شیخ نگینوی اردو ادب کی دنیا میں قابل تعریف تعاون کے لیے عالمی یوم اردو کے موقعے پر مظفرنگر میں ایک اعزازی تقریب میں علامہ اقبال ایوارڈ 2018 سے نوازا گیا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور اردو ترجمہ صوبائی ملازمین تنظیم کے زیر اہتمام ایک اعلیٰ سطح کے پروگرام میں مظفرنگر کے سادات ہوٹل میں اردو اکادمی علی گڑھ کے پروفیسر مشتاق صدف مشہور شاعر ڈاکٹر مجیب شہزر کرمچاری سنگھ کے صوبائی کنوینر صابر علی، یوڈی، او کے ضلع صدر کلیم تیاگی اور مولانا قاسمی کے بدست شیخ نگینوی کو علامہ اقبال 2018 ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 13 نومبر 2018

ڈاکٹر مظفر اسلام کو بھارت رتن ڈاکٹر رادھا کرشن گولڈ میڈل

نوح، میوات: ضلع ہیڈ آفس نوح میں واقع مانو کالج آف ٹیچرس ایجوکیشن میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر وانچارج مانو سب ریجنل سینٹر اینڈ سٹیلائٹ کیمپس نوح میں خدمت

انجام دے رہے ڈاکٹر مظفر اسلام کو ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے شعبے میں ان کے ذریعے ملک کی ترقی میں ادا کیے گئے رول کے لیے چنئی میں گلوبل اکونامکس پروگریس اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن کے ذریعہ بھارت رتن ڈاکٹر رادھا کرشن گولڈ میڈل سے نوازا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ ایوارڈ کے لیے ملک بھر سے تعلیمی ریسرچ کے میدان میں نمایاں کارکردگی کرنے والے 24 تعلیم یافتہ شخصیات کو منتخب کیا گیا تھا۔ آخر راؤنڈ میں 14 اسکالرس کو مذکورہ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پنجاب، ہریانہ و دہلی سے امسال یہ ایوارڈ ڈاکٹر مظفر اسلام کو دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر اسلام کو یہ ایوارڈ مرکزی حکومت میں محکمہ پلاننگ کے آفیسر ایم وی راجیش کرن، مدراس ہائی کورٹ کے جسٹس کے سوامی درائی و گلوبل اکونامکس پروگریس اینڈ ریسرچ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر آئی ایس باشا کے ہاتھوں عطا کیا گیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، نوح سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر ایڈم پال پٹیٹی و دیگر سرکردہ شخصیات نے مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 ستمبر 2018

رسم اجرا:

جلسہ تقسیم ایوارڈ و رسم اجرا

اورنگ آباد: بزم پاسبان اردو ادب اورنگ آباد کی جانب سے جلسہ تقسیم صابرہ صدیقی مثالی ایوارڈ اور رسم اجرا کا انعقاد عمل میں آیا۔ 5 ستمبر 2018 بمقام محسن احمد اردو پرائمری اسکول اورنگ آباد زیر صدارت محسن احمد صاحب انجام پذیر ہوئی۔ مہمانان خصوصی میں جناب شکیب خسرو (اورنگ آباد ٹائمز)، ڈاکٹر محمد خضر مرزا، ڈاکٹر نخشب مسعود (مالیگاؤں) اور جناب سمیع اطہر سابق صدر مدرس مدعو تھے۔ محترمہ شبانہ بیگم نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی دو کتب، تاج محل تاریخ کے آئینے میں، پہلی جنگ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر کا جناب شکیب خسرو، صدر اور دیگر مہمانان کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ بعدازاں منتخب شدہ اساتذہ کو صابرہ صدیقی مثالی معلم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھیں سند مومنٹو اور کتاب سے ان کی پذیرائی کی گئی۔ اس موقعے پر چیف گیسٹ جناب شکیب خسرو اورنگ آباد ٹائمز، ڈاکٹر محمد خضر مرزا نے اپنے زریں خیالات پیش کیے۔ صدر مجلس جناب محسن احمد نے صدارتی خطبہ میں ایوارڈ یافتہ اساتذہ کی خدمات اور رسم اجرا پر اپنے خیالات پیش کیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، مہاراشٹر، 10 ستمبر 2018

بچپن زندہ ہے مجھ میں

نئی دھلی: 6 نومبر مشہور شاعر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر حنیف کیفی کی کتاب 'بچپن زندہ ہے مجھ میں' کی رسم رونمائی پدم شری پروفیسر اخترالواسع اور دیگر اصحاب علم وفن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر پدم شری نے اپنے خطاب کے دوران فارسی کے ایک شعر کے ذریعے کتاب کی اشاعت پر حنیف کیفی کے صاحب زادے اور آل انڈیا بزم اطفال کے روح رواں جناب سراج عظیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ باپ کی یادگار کو زندہ رکھنا اور ان کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ایک مستحسن قدم ہے۔ تقریب رسم رونمائی کے اس موقعے پر اردو ادب کی عظیم شخصیات نے مذکورہ کتاب کے حوالے سے بچوں کے ادب پر اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 7 نومبر 2018

یہ شاعری ہے

نئی دھلی: فصیل بند شہر کے نمائندہ شاعر رؤف رضا کی کلیات 'یہ شاعری ہے' کی رسم رونمائی راجدھانی کے مختلف مقامات پر متعدد ممتاز ادبی شخصیتوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ان شخصیتوں میں ممتاز شاعر فرحت احساس، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر ابن کنول، لکشمی شنکر باجپائی، اقبال اشہر، مردلا ٹنڈن، ڈاکٹر رحمان مصور، اظہار ندیم، تسلیم دانش اور محمد ایوب کے نام قابل ذکر ہیں۔ رؤف رضا منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے جن کا 2 دسمبر 2016 میں اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا تھا۔ چنانچہ ان کے دوستوں اور خاص طور پر ممتاز شاعر اقبال اشہر کے گرانقدر مشورے کی بنیاد پر 'راوی کلچرل سوسائٹی' کے ذمے داران نے طے کیا کہ ان کی کلیات کا اجرا بھی کچھ الگ انداز میں ہونا چاہیے۔ روایت سے الگ ہٹ کر 'یہ شاعری ہے' کی رونمائی متعدد ادبی شخصیتوں کے ہاتھوں کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر عمل میں آئی۔ کتاب عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کی ہے جس کے مرتبین میں تسلیم دانش اور محمد ایوب شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2018

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک تجزیاتی مطالعہ

علی گڑھ: مولانا آزاد اکیڈمی نئی دہلی کی طرف سے شائع کردہ دستاویزی کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد: ایک تجزیاتی مطالعہ' کا اجرا ماہر ابوالکلامیات پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی نے اس اہم کتاب میں، مولانا ابوالکلام آزاد غلط فہمیاں اور حقائق کے عنوان سے ایک معرکۃ الآرا مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں کہا ہے کہ مولانا آزاد کے بارے میں جتنی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں شاید ہی کسی دوسرے شخص کے بارے میں پھیلائی گئی ہوں اور یہ غلط فہمیاں ان کی زندگی کے مختلف النوع حالات و واقعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہا گیا کہ انھوں نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی، جو سراسر غلط ہے، کسی طرح یہ بھی مشہور ہوگیا کہ ان کی پیدائش 11 نومبر کی ہے، اور سرکاری طور پر یہی تاریخ تسلیم کرلی گئی ہے حالانکہ وہ اگست کے آخری عشرے میں تولد ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ اس کتاب کا اجرا حبیب منزل علی گڑھ میں عمل میں ہوا۔ یہ وہ تاریخی رہائش گاہ ہے جس میں غبار خاطر کے مکتوب نگار مولانا آزاد اور مکتوب الیہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے مابین دیرینہ رفاقت کی وجہ سے علی گڑھ کے سفر کے دوران، ٹھہرا کرتے تھے، جہاں آج بھی مولانا آزاد کی بہت ساری یادیں اور یادگاریں موجود ہیں۔ کتاب کی تقریب رونمائی میں پروفیسر مسعود انور علوی، پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی، ڈاکٹر ظفر علی خاں، پروفیسر اصغر علی خاں، ڈاکٹر مدیح الرحمٰن خاں شیروانی اور ڈاکٹر سلطان احمد نے بھی اپنے وقیع خیالات و تاثرات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 22 اکتوبر 2018

شانہ بہ شانہ

علی گڑھ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر سلطان جہاں منزل میں 'شانہ بہ شانہ' کی رسم اجرا تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر صدر جلسہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو چانسلر نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کہا کہ سرسید احمد خاں کی تحریک کو ان کے رفقا کار نے جس انداز سے پروان چڑھایا وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کے مرتبین خواجہ محمد شاہد اور سید محمد احمد نے جن شخصیات کا تذکرہ کیا ہے وہ علی گڑھ تحریک کے اہم ستون ہیں ان کے بغیر اس زمانے کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ مہمان خصوصی مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد حنیف بیگ نے کہا کہ سرسید احمد خاں کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی ان کے زمانے میں تھی۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ تحریک کے بنیاد گزاروں میں جن شخصیات پر کام کیا جا رہا ہے وہ عصر حاضر کے لیے رہنمائی کا سبب ہے۔ مہمان اعزازی علی گڑھ کے میئر محمد فرقان نے کہا کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک تب تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ان کے شانہ بہ شانہ چلنے والوں کا تذکرہ نہ ہو۔ اس سے نئی نسل فیضیاب ہوگی۔ اس سے قبل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے کہا کہ علی گڑھ تحریک کے بنیاد گزاروں کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ ہماری ملی تاریخ کا اہم حصہ ہے، اس کے لیے کتاب کے مرتبین شکریہ کے مستحق ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' علی گڑھ، 19 نومبر 2018

مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی و تاریخی بصیرت

اعظم گڑھ: جس شخص کے اندر جامعیت ہوگی وہ شبلی کو پسند کرے گا۔ شبلی کے چاہنے والوں کے لیے شبلی کا ہر لفظ مقدس ہے۔ شبلی نے وہ زبان اختیار کی جو دلوں میں اترتی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے سینئر رفیق مولانا عمیر الصدیق ندوی نے ڈاکٹر نصیر الدین منشاوی کی کتاب 'مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی و تاریخی بصیرت' کی شبلی اکیڈمی میں رسم اجرا کی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس کتاب کی رسم اجرا ماہر شبلی ڈاکٹر الیاس اعظمی کے بدست عمل میں آئی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر شباب الدین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شبلی نعمانی ایک بہت بڑا موضوع ہے، اس کتاب میں کچھ نئی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ جو بہت معلوماتی ہیں۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی نے کہا کہ ایک شخص کا حیدرآباد میں بیٹھ کر شبلی پر مقالہ لکھنا بڑی بات ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر منشاوی نے کہا کہ جب علامہ شبلی نعمانی کی کتاب الفاروق ہاتھ لگی تو مجھے فاروق اعظم سے بے پناہ محبت پیدا ہوئی اور میں نے طے کیا کہ شبلی پر ریسرچ کرنا ہے۔ صدارتی خطبے میں ڈاکٹر فخرالاسلام نے کتاب کے مصنف کو مبارکباد پیش کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض علاء الدین خان نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2018

شمع اختر کاظمی کی کتاب 'سورج سوا نیزے پر' کا اجرا

سورج سوا نیزے پر

بھیونڈی: اردو کی معروف ادیبہ شمع اختر کاظمی کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات پر مشتمل اصلاحی مضامین کا مجموعہ 'سورج سوا نیزے پر' کا اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر خالد محمود کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ بھیونڈی کے متحرک ادبی ادارے بزم یاران ادب کے زیر اہتمام غلام محمد مومن ویمنز کالج آڈیٹوریم میں منعقدہ اس تقریب اجرا کی صدارت کرتے ہوئے معروف صحافی محقق و دانشور شمیم طارق نے کہا کہ ہماری تہذیبی، ادبی و سماجی روایات خواتین کے تذکرے اور ان کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان میں صرف شبلی نعمانی نے گلشن نیرنگ کے حوالے سے خواتین شاعرات و مصنفات کی پوری تاریخ ہمارے حوالے کی ہے۔ شمیم طارق نے کہا کہ اس کتاب کے تمام مضامین اہمیت کے حامل ہیں اور گہری نظر کے متقاضی ہیں۔ شمع اختر کاظمی خود پردے میں رہتی ہیں لیکن کوئی مسئلہ ان سے پردے میں نہیں رہتا۔ جناب ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ اپنی 42 سالہ علمی، ادبی اور تدریسی زندگی میں میں نے بہت ساری کتابوں کا اجرا کیا ہے۔ آج 'سورج سوا نیزے پر' کا اجرا کر کے میں اپنے آپ پر فخر محسوس کر رہا ہوں۔ ان کی کتاب پر جن جن افراد نے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں ان کی ہر ایک باتوں سے میں مطمئن ہوں اور اس کی تائید کرتا ہوں لیکن یہ تبصرے اور تاثرات حرف آخر نہیں ہیں بلکہ اس سے آگے بھی جاسکتے ہیں۔ 'سورج سوا نیزے پر' کی مصنفہ شمع اختر کاظمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نے عالم اسباب کو عالم اسباب مان کر اسباب کا بندوبست نہ کیا تو یاد رکھیں یہ دنیا ہم سے ہمارے جینے کا حق بھی چھین لے گی۔

روزنامہ 'اردو نیوز' ممبئی، 7 نومبر 2018

گرچرن سنگھ کے کلیات کا اجرا

نئی دہلی: ہندی کے نامور ادیب گرچرن سنگھ کی بارہ جلدوں پر مشتمل کلیات کی رسم اجرا کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ہندی کے معروف شاعر اور ادیب رام درش مشرا نے کی۔ اس موقعے پر عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سعادت حسین منٹو کے ہندی ناقد اور معروف ادیب نریندر موہن نے حاضرین کو بتایا کہ عالمی اردو ٹرسٹ نے منٹو صدی منعقد کر کے پوری دنیا کو یاد دلایا کہ منٹو کی پیدائش کو پورے سو سال مکمل ہو چکے ہیں اور جس کے فوراً بعد ہی منٹو صدی پر جلسوں اور تقریبات کا سیلاب سا آ گیا تھا۔ پروفیسر صادق نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ دور میں قومی سطح پر اردو اور ہندی میں وہ دشمنی نہیں ہے جو ملک کے آزاد ہونے کے بعد رونما ہوئی تھی۔ ہمیں اردو اور ہندی کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہیے کیونکہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کی دو سگی بیٹیاں ہیں اور ان میں فرق کرنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ وشنو پربھاکر پرشٹھان کے صدر اتل کمار پربھاکر نے کہا کہ اردو ہندی کو ایک دوسرے کو قریب لانا گنگا جمنی تہذیب ہی نہیں بلکہ قومی یکجہتی کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اے رحمان نے کہا کہ عالمی اردو ٹرسٹ دونوں زبانوں کی ترقی اور بقا کے لیے ہر طرح سے پابند عہد ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2018

وفیات:

فہمیدہ ریاض

لاہور: اردو کی ممتاز شاعرہ فہمیدہ ریاض لاہور میں 11 نومبر کو انتقال کر گئیں۔ وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کی سربراہ بھی رہی ہیں جبکہ اپنے تانیثی اور غیر روایتی خیالات کے لیے معروف تھیں۔

انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں حیدرآباد میں پہلی نظم لکھی جو 'فنون' میں چھپی، ان کی محبوب صنف سخن نظم تھی۔ فہمیدہ ریاض کا پہلا شعری مجموعہ 'پتھر کی زبان' 1967 میں آیا جبکہ ان کا تیسرا مجموعہ کلام دھوپ تھا۔ فہمیدہ ریاض 28 جولائی 1945 کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ وہ کچھ مہینوں سے شدید علیل تھیں اوور اپنی بیٹی کے یہاں لاہور میں مقیم تھیں۔ ان کے والدین آزادی سے پہلے ہی سندھ میں رہتے تھے۔ وہ یہیں پر پڑھی ہیں اور تمام تعلیم یہیں پر حاصل کی۔ پھر 1967 میں انگلینڈ چلی گئیں۔ وہاں کچھ عرصے بعد انھوں نے بی بی سی میں کام کیا تھا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں وہ ہندوستان میں رہیں۔ پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'پوئٹ ان ریذیڈنس' تھیں۔ پھر سینئر ریسرچ فیلو ہیں۔ 'آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ریسرچ' اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل ریسرچ سے وابستہ رہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 نومبر 2018

گلوکار محمد عزیز

ممبئی: بالی ووڈ کے معروف گلوکار محمد عزیز کا 27 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 64 برس کے تھے۔ محمد عزیز کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی جس کے بعد انھیں ممبئی کے ناناوتی

اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ان کی موت ہوگئی۔ محمد عزیز کی پیدائش 2 جولائی 1954 میں مغربی بنگال کے اشوک نگر میں ہوئی تھی۔ عزیز نے بطور پلے بیک گلوکار اپنے کریئر کا آغاز بنگلہ فلم 'جیوتی' سے کیا تھا۔ سال 1984 میں وہ ممبئی آگئے جہاں انھوں نے ہندی فلم 'امبر' میں گیت گایا۔ اسی دوران ان کی ملاقات موسیقار انو ملک سے ہوئی جنھوں نے انھیں فلم مرد میں گانے کا موقع دیا۔ فلم مرد میں امیتابھ بچن پر فلمایا گانا 'مرد تانگے والا' سپرہٹ ثابت ہوا۔ اس کے بعد عزیز نے کئی فلموں کے ہٹ گانے گائے۔ وہ محمد رفیع کے بہت بڑے پرستار تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 نومبر 2018

حسن مثنیٰ

لکھنؤ: صحافی، ادیب اور رانچی کالج کے سابق ہیڈ ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا 27 نومبر کو صبح ایرا میڈیکل کالج لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم طویل عرصے سے گردے کے عارضے میں مبتلا

تھے۔ مرحوم نہایت ملنسار اور خوش اخلاق طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے جے این یو، دہلی سے تعلیم حاصل کی تھی، فی الوقت وہ رانچی یونیورسٹی میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس سے قبل وہ روزنامہ راشٹریہ سہارا سے بھی وابستہ رہے۔ وہ ریڈیو نشریات، مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری، چودھری سبط محمد نقوی، انیس اور انیس شناسی، ذرہ بھر روشنی، انیس کا شعور فن، شارب ردولوی، دیوندر ستیارتھی کے حوالے سے تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں بھی تحریر کر چکے ہیں۔ خاندانی ذرائع کے مطابق پسماندگان میں اہلیہ اور 3 بیٹے ہیں۔ مرحوم کی تدفین آبائی وطن گوپال پور ضلع سیوان (بہار) میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2018

خراج عقیدت:

میکش انبالوی

ہریانہ: پنچ کولہ، ہریانہ اردو اکادمی بھون میں اردو کے عظیم شاعر و ادیب میکش انبالوی کی اچانک طبیعت ناساز ہونے کے بعد چنڈی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر ملنے کے بعد ہریانہ اردو اکادمی میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں اکادمی کے عملے نے ان کی رحلت پر گہرے رنج وغم اور دکھ کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر اکادمی کے ڈپٹی چیئرمین و ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی ڈاکٹر چندر ترکھانے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم میکش انبالوی کا ہریانہ اردو اکادمی سے شروع سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ میکش انبالوی کی اردو ادبی خدمات کے بڑھتے سلسلے کو دیکھتے ہوئے اکادمی نے انھیں اعزاز سے بھی نوازا۔ عمائدین شہر کے علاوہ اہل خانہ اور خاندان کے لوگ بھی اس تعزیتی نشست میں شریک ہوئے اور سب نے مرحوم میکش انبالوی کو گلہائے خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 نومبر 2018

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

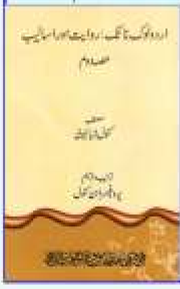

مصنف: بکنول ڈبائیوی

ترتیب و ترمیم: پروفیسر ابن کنول

صفحات: 482

قیمت: 162 روپے

سراج اورنگ آبادی (مونوگراف)

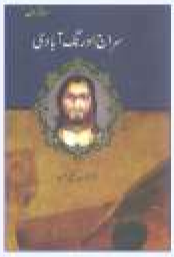

مصنف: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

صفحات: 129

قیمت: 78 روپے

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)

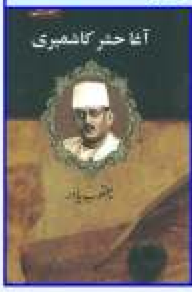

مصنف: یعقوب یاور

صفحات: 132

قیمت: 81 روپے

جگن موہن لال رواں (مونوگراف)

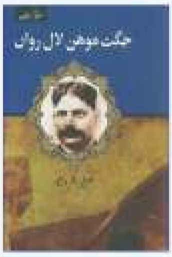

مصنف: صغیر افراہیم

صفحات: 146

قیمت: 86 روپے

یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)

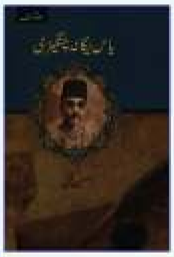

مصنف: حسن مثنیٰ

صفحات: 149

قیمت: 90 روپے

قاضی عبدالودود (مونوگراف)

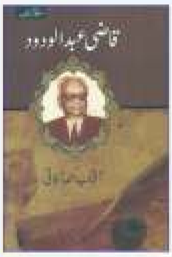

مصنف: آفتاب احمد آفاقی

صفحات: 130

قیمت: 80 روپے

دیوندر ستیارتھی (مونوگراف)

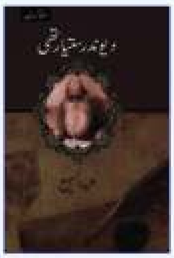

مصنف: عبدالسمیع

صفحات: 162

قیمت: 90 روپے

علی سردار جعفری (مونوگراف)

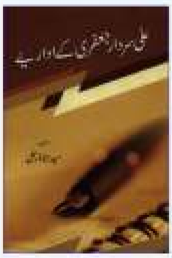

مصنف: عمر رضا

صفحات: 165

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, January-2019, Vol.21, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/12/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025